امیر خسرو



مرتب
شیخ سلیم احمد



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

امیر خسرو

امیر خسرو

مرتب

شیخ سلیم احمد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

AMEER KHUSRU

Edited by

Sheikh Saleem Ahmed

Year of Edition 2006
ISBN 81-8223-193-0

Price Rs. 300/-

نام کتاب	امیر خسرو
مرتب	شیخ سلیم احمد
سنہ اشاعت	۲۰۰۶ء
قیمت	۳۰۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540
E-mail : ephdelhi@yahoo.com

انتساب

خدا را کنم بر سرِ نامہ یاد
کہ بر بندہ درہائے معنی کشاد

امیر خسرو

☆☆

فہرست

☆☆

مقدمہ

حضرت امیر خسرو کے مطالعہ کے دوران میں نے جہاں فکر و خیال کی کئی منزلوں کو طے کیا ہے۔ اس دلچسپ ذہنی سفر میں جہاں مجھے نئی آگاہی اور روشنی حاصل ہوئی اور مجھ پر علم وفن کے نئے دریچے کھلے ہیں، وہاں اس تلخ حقیقت کا بھی شدت سے احساس ہوا کہ ہم اپنے علمی و ادبی سرمایہ کے تئیں کس قدر لاپرواہ ہیں۔ اگر حضرت امیر خسرو یورپ کے کسی ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو وہ آج تلاش و تحقیق کا ایک ہمہ گیر ادارہ بن گئے ہوتے۔ ان کی زندگی اور فن کے ہر پہلو پر دفتر کے دفتر تیار ہو جاتے۔ وہ ایک بڑی علمی و ادبی ''صنعت'' کا درجہ اختیار کر لیتے اور اس کے تحت بہت سی ذیلی ''صنعتیں'' قائم ہو جاتیں۔ ان کی یاد میں تحقیقی مراکز قائم ہوتے۔ مختلف یادگاریں، میوزیم اور دارالمطالعے قائم کیے جاتے۔ درحقیقت انگریزی ادب میں آج جو عظمت و شہرت شیکسپیر کو حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ امیر خسرو کو حاصل ہوتی۔

مگر ہندوستان میں ہم ابھی تک امیر خسرو کی زندگی سے بھی لوگوں کو پوری طرح روشناس نہیں کرا سکے۔ ہمیں تقریباً ساڑھے چھ سو سال گذرنے کے بعد آج ان کی یاد منانے کا جو خیال آیا اس کی تحریک بھی ہمیں سوویت یونین سے ملی۔ ہمارے علمی ذخیروں کی تہی دامنی اور بے سروسامانی کا عالم یہ ہے کہ امیر خسرو کے بارے میں کوئی بھی ریسرچ یورپ اور روس کے علمی ذخائر سے استفادہ کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔ امیر خسرو دہلوی کی زندگی اور شخصیت پر مواد ہمیں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، اور کلکتہ میں حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے لندن، برلن، آذربائیجان، ماسکو، تہران اور کابل کے کتب خانوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا کیونکہ ان کی تصانیف کے بیشتر مخطوطات ان ملکوں کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ ہم ان سات سو سال

میں اتنا بھی نہیں کر سکے کہ امیر خسرو کی اب تک دستیاب مستند تصانیف کو صحیح ترتیب وتہذیب کے ساتھ شائع ہی کرا سکتے (نواب اسحاق خاں کا کام ایک استثنا ہے جس کا احوال آپ اگلے صفحات میں پڑھیں گے)۔ ان کے اُردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو جاتے۔ یہ ہمارا قومی گناہ ہے، یہ ایک ایسی قومی غفلت ہے جس کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس درجہ غفلت کو قومی گناہ بھی کہا جا سکتا ہے جس کا کفارہ جلد از جلد ادا ہونا چاہئے۔

ان حقائق سے ہم اپنی ذہنی، علمی اور مادی پسماندگی کے پیچھے کارفرما عوامل کو بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ زندگی میں حرکت کے سوتے ذہن کے نہاں خانوں میں ہی پھوٹتے ہیں۔ فکر و خیال کی جولانی سے ہی زندگی پُر رونق، خوبصورت اور دل پذیر ہے۔ اگر کسی قوم کے فکر و خیال کے سوتے خشک ہیں تو وہ قوم مادی اعتبار سے بھی ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتی۔ یورپ نے مادی و سائنسی ترقی کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا اس کی وجہ ان کے فکر کی جولانی تھی۔ تحقیق و جستجو کی غیر معمولی لگن تھی۔ انہوں نے علم کے ہر میدان میں فکر کے گھوڑے دوڑائے۔ دبے چھپے علمی و ادبی خزانوں کو کھود نکالا۔ اور ان کی روشنی سے اپنے حال کو منور کیا اور مستقبل کے لیے راہ ہموار کی۔ علم و ہنر کے میدان میں یورپی قوموں کو خوب سے خوب تر کی تلاش نے کو ذہنی فوقیت اور قیادت عطا کی۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہندوستانی تاریخ، ہندوستانی جغرافیہ، ہندوستانی فلسفہ اور اسی طرح کے دوسرے ہندوستانی علوم پر بھی یورپی مصنفین سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ خود اپنے ملک کے بارے میں ہمارا علم اس قدر سطحی اور نامکمل ہے کہ ہم اپنے ہی بارے میں کوئی حتمی اور مکمل و مستند بات کہنے کے بھی اہل نہیں۔ اپنے بارے میں اگر کچھ جاننا چاہتے ہیں تو یورپ کے لوگوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہماری یہ علمی و ذہنی بے مائگی کس قدر المناک ہے! ہم اپنے وجود کے جواز کی سند کے لیے غیروں کے محتاج ہیں۔

زندگی کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح امیر خسرو کو بھی ہم نے نظر انداز کیا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر وحید مرزا کی اُردو اور انگریزی تصانیف واحد قابلِ اعتنا کام ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر آج بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ امیر خسرو پر میری یہ تالیف کوئی علمی و تحقیقی کارنامہ نہیں ہے۔ امیر خسرو سے متعلق وہ مستند تحریریں

ایک جگہ جمع کردی گئی ہیں جو منتشر تھیں اوراب دستیاب بھی نہیں تھیں مقصد یہی ہے کہ علمی کام کرنے والوں کو یہ مواد ایک جگہ مہیا ہو جائے۔ اور میری یہ معمولی کاوش کسی بلند پایہ علمی کام کی اساس بن سکے۔

امیر خسرو کے بارے میں میرا علم بھی محدود ہے۔ مگر اس مختصر مطالعہ کے دوران ان کی شخصیت اور ان عہد کے بارے میں کئی دلچسپ اور قابلِ توجہ گوشے میرے سامنے آئے مثلاً تیرہویں صدی کے ہندوستانی معاشرہ کے سیاق وسباق میں ابھی امیر خسرو کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ امیر خسرو کی تصویر ان کے اپنے معاشرہ کے آئینہ میں ہی زیادہ صاف اور واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ امیر خسرو کو سمجھنے کے لیے اس عہد کی نظریاتی کشمکش اور مختلف و متضاد فکری دھاروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ خود امیر خسرو کی تحریروں میں اس دور کی کہانی کو زیادہ تفصیل اور صراحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

امیر خسرو پہلے وطن پرست مسلمان شاعر تھے۔ ان کے جذبۂ حب الوطنی پر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس پہلو پر کافی کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ مگر تحقیق طلب یہ ہے کہ ان میں حب الوطنی کا یہ جذبہ کہاں سے اور کیسے آیا، ہندوستان سے ان کی محبت کی نوعیت کیا ہے؟ کہیں یہ جذبہ عصری ترک ہندوستانی معاشرہ سے ناآسودگی کا ردعمل تو نہیں؟ امیر خسرو کہیں اپنے عہد کی نسلی عصبیت کا تو نشانہ نہیں بنے؟ کیوں کہ ان کی والدہ ہندوستانی نژاد تھیں، کیا اس بنا پر ان کے ساتھ امتیازی سلوک تو نہیں برتا جاتا تھا؟ کیونکہ اس عہد کے مسلمان حکمراں، شرفا اور دانشور نسلی برتری اور نسبی فوقیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں۔ محض ایک تاثر ہے جس کو تاریخی شواہد اور دلائل کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

امیر خسرو کے ہندوی کلام اور ان کی موسیقی سے متعلق بھی متضاد ومختلف دعادی کو تحقیق کے نئے اصولوں کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ہندوی کلام سے متعلق حافظ محمود شیرانی نے جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے اور جو اعتراضات اٹھائے ہیں وہ حرف آخر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کو تسلیم یا رد کرنا ہوگا۔

غرض امیر خسرو کی شخصیت کے ایسے ہی اور بہت سے پہلو ہیں جو تحقیق طلب ہیں۔

اس کتاب میں خسرو کی زندگی کے مختلف پہلو ابھر کر سامنے آئے ہیں بعض گوشے وہ ہیں جو بہت سوں کی نگاہوں سے ابھی تک اوجھل ہیں۔ ان معروف و معتبر شخصیتوں کا تحریر کردہ مواد یک جا جمع ہو گیا ہے۔ جن کی تصانیف ہمارے لیے اب تبرک کا درجہ رکھتی ہیں جیسے محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، شیخ سید احمد مارہروی، محمود شیرانی، پروفیسر حبیب، ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور دیگر اور دانشوروں نے حضرت امیر خسرو کی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرلیا ہے اور بعض نئی معلومات بھی سامنے آئی ہیں۔ مثلاً ہمعصروں میں ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مضمون — امیر خسرو کا تاریخی شعور ایک توقیتی مطالعہ خسرویات میں اضافہ کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ کتاب اعلیٰ درجہ کا تحقیقی مواد تو ہے ہی، عوامی دلچسپی کے اعتبار سے بہت سے عناصر اور رنگ اس کے اوراق میں سموئے ہیں۔ یہ عصری معنویت کی حامل تاریخی دستاویز ہے۔ ہمارے ابتدائی عہد کی۔ تہذیبی، سیاسی اور ادبی دستاویز ہے۔ اس کتاب کے حوالہ سے امیر خسرو کی چند جھلکیاں یہاں دکھانا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ قاری ابتدا ہی میں کتاب کی اہمیت سے واقف ہو سکے اور ایک عہد ساز زندگی کی ایک خوشنما تصویر ابھر کر سامنے آسکے۔

ایک تصویر

امیر خسرو در حقیقت ہندوستان میں ایک نئی تہذیب کا نقطۂ آغاز ہیں جسے ہم گنگا جمنی یا ہندی مسلم مشترکہ تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندوستان کی عظمت کا پرچم بلند کرنے والے وہ پہلے مسلمان شاعر ہیں۔ ہندوستانی بولیوں کی جانب توجہ مبذول کرانے والوں میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے اولین دورِ حکومت میں نظریہ سازی کا عظیم المرتبت کام کیا۔ اس سرزمین پر 'ہند ایرانی اسلامی' تہذیب کا پودا لگایا۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ بن گئے تھے۔ ان کے ہم عصروں میں بہت سے شاعر، عالم، مورخ اور دانشور تھے مگر امیر خسرو ان سب میں منفرد اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ آج بھی زندہ ہیں۔ جب وہ دواوین، مثنویاں اور نثر پارے تصنیف کر رہے تھے انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ایک نئے سماج کی تشکیل کر رہے ہیں۔ جس نظریہ کا بیج انہوں نے بویا وہ آگے چل کر ایک تناور درخت بنا۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ ہندو سماج پہلی بار ایک مختلف اور اجنبی سیاسی

وتہذیبی قوت کے روبرو ہوا تھا جس نے اس میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ دونوں کے تفاعل سے ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ وہ ڈھانچہ بن چکا تھا جس پر مغلوں نے اپنی سلطنت کی عظیم المرتبت عمارت تعمیر کی، اکبر کے نظریہ صلح کل میں جس کی بازگشت سنائی دی وہ آواز خسرو کے نغموں سے ہی ابھری تھی۔ امیر خسرو نے اس عمل کی رفتار کو تیز تر کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ وہ نہ ہوتے تو ملا داؤد نہ ہوتے، نانک، کبیر اور جائسی بھی نہ ہوتے۔ بھکتی تحریک کا چراغ روشن کرنے والوں میں امیر خسرو کو پیش رو کا درجہ حاصل ہے۔ یہ ایک ملک گیر تحریک تھی۔ گجرات سے لے کر بنگال تک، پنجاب سے دکن تک اس کی شاخیں پھیلی تھیں۔ محققین نے علاقائی شاعروں کی زبانوں میں خسرو کے اثرات تلاش کیے ہیں۔ مثال کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کی گجری کے بارے میں تحقیق کا حوالہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے گجری شاعروں ــــ شیخ احمد گجراتی، ملاّ نصرتی، فخر دین نظامی، خوب محمد چشتی اور دیگر شعرا کے کلام میں خسرو کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گجری میں جو شاعری ہو رہی تھی وہ کسی طرح دلّی والوں کی اُردو ریختہ شاعری سے کم درجہ کی نہیں تھی۔ ان شعرا کی وجہ سے گجری یا دکنی کو ادب میں معیاری درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ یہ بات صرف گجری تک محدود نہ تھی۔ پنجابی، بنگالی، سندھی اور جنوبی ہندی کی بولیوں میں یہ عمل جاری تھا۔ وہ بولیوں سے بلند تر ہو کر معیاری ادبی زبان کا رتبہ حاصل کر رہی تھیں۔ امیر خسرو نے نہ سپہر میں اس زمانے کی زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ اور انہیں جاننے کی کوشش کی ہے۔ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان زبانوں کے کون سے علاقے تھے اور ہماری موجودہ زبانیں ان سے کس حد تک مماثل ہیں۔ ان اشعار کا اُردو ترجمہ فاروقی صاحب کے شکریہ کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں جو پُر لطف ہے۔

> "الغرض یہ بات بالکل فضول ہے کہ میں اپنا دل فارسی،
> ترکی اور عربی کے نغموں پر مائل کروں" اور اسے اس طرح خوش کروں۔
> میں چونکہ ہندوستانی ہوں اس لئے یہی بہتر ہے کہ میں
> اپنے ہی مقام سے گفتگو کروں۔
> اس مملکت کے ہر نواح میں ان کی اپنی مخصوص زبانیں

ہیں اور وہ رعایت کی بھی نہیں، بلکہ وہیں کی ہیں۔ سندھی، لاہوری، کشمیری، کبر، دھور سمندر، تلنگی، گجر، معبری، گوری، بنگال اور اودھ۔ اسی طرح دہلی اور اس کے قرب و جوار کی زبان بھی اپنی سرحد کے اندر ہے۔ یہ سب ہندوی زبانیں ہیں کہ ایام کہن سے عام طور پر ہر طرح کی بات چیت اور کلام کے لئے مستعمل ہیں۔

خسرو کے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ہندوی زبان کے بارے میں جو قول ہے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''میں ہندوستانی ترک ہوں، ہندوی میں جواب دیتا ہوں، میرے پاس شکر مصری نہیں کہ زبان عرب میں گفتگو کروں۔

نظم ہندوی کے چند جز دند رودستاں کئے جا چکے ہیں۔ یہاں اس کے ذکر پر بس کرتا ہوں اور مثال پر نگاہ نہیں رکھتا، کیونکہ فارسی لطیف میں ہندوی الفاظ لانا چنداں لطف نہیں رکھتا، مگر بہ ضرورت۔ جہاں ضرورت تھی وہاں لائے گئے۔

میں، جو سچ پوچھو تو طوطی ہند ہوں
مجھ سے ہندوی کا پوچھو تو میں نغز گوئی کروں

سب سے پہلے بادشاہان سخن میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے تین دیوان ہوں، سوا میرے، کہ خسرو ممالک کلام ہوں۔ مسعود سعد سلمان کے تین دیوان ہیں تو، لیکن وہ تین عبارتوں میں ہیں، عربی، فارسی اور ہندوی''

منشی سعید مارہروی نے مثنوی دیول رانی خضر خاں کے حوالے سے یہ بیان قابلِ توجہ ہے:-

ایک روز امیر خسرو شاہزادہ خضر خاں (علاء الدین خلجی کا بیٹا) کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ اثنائے ملاقات میں شاہزادہ نے فرمائش کی کہ میں نے دیول رانی کے ساتھ اپنی محبت کے واقعات خود قلمبند کیے ہیں، آپ ان کو نظم کر دیجئے، چنانچہ جس وقت

شاہزادہ نے اپنا مسودہ حضرت امیر کے سپرد کیا تو فرماتے ہیں کہ اس کو پڑھ کر میں اشکبار ہوگیا۔ اور میں نے اسے نظم کرنے کا وعدہ کرلیا۔ اس مسودہ میں ہندی الفاظ کثرت سے استعمال ہو رہے تھے۔ لہٰذا اسے دیکھ کر حضرت امیر خسرو کو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ ریشم میں گزی کا پیوند کیسے لگے گا۔ لیکن پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ کافی غور کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ''ہندوی زبان کسی طرح فارسی زبان سے کم درجہ کی نہیں ہے۔ ہندوی زبان کا عربی سے تو مقابلہ نہیں ہوسکتا کیونکہ عربی تو ام السنہ ہے مگر فارسی ہندوی کی طرح کم نہیں۔ عربی خالص زبان ہے۔ جس میں غیر زبان مخلوط نہیں ہوسکتی۔ مگر فارسی کا لطف بغیر عربی کی چاشنی کے نہیں آتا۔ بہ لحاظ قواعد وصرف بہ لحاظ فصاحت و بلاغت ہندوی زبان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جو شخص عربی، فارسی اور ہندوی تینوں زبانوں سے واقف ہو وہ اس قول کی صداقت کو تسلیم کرسکتا ہے''۔

اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں ''اگر میں عقل و انصاف سے ہندوی زبان کے اوصاف بیان کروں تو ناظرین معترض ہوں گے۔ اور اگر میں اپنے قول کی تائید میں قسم کھاؤں تو نہیں معلوم کہ اس کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میرا علم ہندوی زبان کا بالمقابلہ سمندر کے قطرہ کا حکم رکھتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جس شخص نے ہندوستان اور دریائے گنگ کو نہ دیکھا ہو وہ ہندوستان کی طوطی کی کیا قدر کرے گا۔ جو خراسانی پر ہندوستانی کو احمق سمجھتا ہو وہ غالباً ملک کے پان کو گھاس سمجھتا ہوگا۔ میرے اس قول کو وہی منصف طبع لوگ باور کریں گے جنہوں نے مختلف ممالک میں سیاحت کی ہے اور غور و خوض کے ساتھ ان ممالک کا مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن جو شخص عصبیت سے کام لے گا وہ البتہ غیر ملکی انجیروں کو ہندوستان کے آموں پر ترجیح دے گا مگر ہندوستان نہ صرف وسیع ترین ملک ہے بلکہ جنت نشان ہے۔ کیونکہ اس ملک کو جنت سے کوئی بھی مناسبت نہ ہوتی تو حضرت آدم اور طاؤس اس ملک کی زینت کا باعث نہ ہوتے۔''

بقول وحید مرزا امیر خسرو کی مقبولیت کا راز اُن کی ظرافت طبع، ان کی حاضر جوابی اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے میں تھا۔ بیشک وہ ان صفات سے مرصع تھے اور ان کی مثالیں اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ محمد حسین آزاد نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ امیر خسرو کا گزر کسی کوچہ سے ہوا۔ دُھنیہ ایک دکان میں روئی دھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ

جس دُھنیے کو دیکھو ایک ہی انداز پر روئی دھنکتا ہے۔ سب ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں، کوئی بولا کہ قدرتی استاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔ خسرو بولے سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کوئی بولا لفظوں میں کیسے لایا جائے؟ فوراً ہی خسرو نے دھن تال کو لفظوں میں باندھ دیا:

درپئے جاناں جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، رفت رفت جاں ہم رفت ایں ہم رفت وآں ہم رفت، آنہم رفت، آنہم رفت، اینہم، آنہم، اینہم، انہم، آنہم رفت رفتن، رفتن، رفتن، رفتن دہ، دہ دہ، رفتن، دہ رف، رف، رفتن دہ، رفتن دہ (یہ واقعہ بغیر کسی عصری ماخذ کے نقل ہوتا آرہا ہے مگر صحیح معلوم ہوتا ہے)

ظرافت اور بذلہ سنجی کی چند مثالیں دیکھیں۔

ایک نیک سیرت شیخ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ شیخ ایک ایسا پرندہ ہے کہ ان کے نیچے شیطان کا انڈا اسینے کو رکھا جائے تو اس میں سے جبریل نکل آئیں۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں میں مجنوں، لیلیٰ کے کتے سے مخاطب ہے۔ جب لیلیٰ تجھے ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو ایک اور سگِ در کو بھی یاد دلا دینا۔ لیلیٰ جب تیری گردن میں طوق ڈالے تو میری گردن کو بھول نہ جانا۔ خسرو کی شوخی کلام کی مثال تو ان کا ضرب المثل شعر ہے:

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے گر بودے زبانش در دہانِ من

وہ جب منگلوں کا ذکر کرتے ہیں تو طنز وظرافت کے موتی بکھیرتے ہیں۔ سلاطین وعلما کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایک قاضی کے بارے میں فرماتے ہیں جو جھوٹا اور بے ایمان ہے اور علم سے بھی کورا ہے کہتے ہیں اسے گدھے سے تشبیہ دینا گدھے کی بھی توہین ہے ع

بر خر جفا بود اگرش خرکنم خطاب

اس بزلہ سنجی کے ساتھ خوبرو ہو۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ شاعر و ہنرمند ہو۔ یہ خوبیاں کسی بھی شخص کی مقبولیت اور کامیابی کی ضمانت بن سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بلا کے ذہین اور دور اندیش تھے۔ ان کی گوناں گوں صفات کی وجہ سے ان کی مصاحبت حاصل

کرنے کے لیے شہزادے اور امرا آپس میں جھگڑتے نظر آتے ہیں۔ وہ دنیاداری کے نقطہ نظر سے کامیاب ترین انسان تھے۔ ان کی درباری زندگی اس کی مثال ہے جو ایک معمہ بھی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہوا کہ ایک شخص اتنے رول اتنی خوبی سے نبھا سکا۔ ابھی ایک ممدوح کی شان میں لکھے گئے قصیدہ کی روشنائی خشک نہیں ہونے پاتی کہ دوسرا ممدوح پہلے ممدوح کو قتل کر کے تخت شاہی پر جلوہ گر ہوتا ہے اور امیر خسرو اسی شان سے سابق مربّی کے قاتل کی شان میں قصیدہ خواں نظر آتے ہیں۔ خسرو نظام الدین اولیا کے مرید ہیں۔ ترک اللہ جن کا خطاب ہے۔ جن کے بغیر شیخ کو چین نہیں۔ جس کا سوزِ سینہ جنت کی ضمانت ہے جو اس کے ساتھ قبر میں بھی ایک ساتھ دفنانے کی خواہش کرتے ہیں۔ حضرت شیخ سب سے اکتا جاتے ہیں مگر امیر خسرو سے نہیں اکتاتے۔ نظام الدین اولیاء کے تعلقات سلطان قطب مبارک خلجی سے کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کشیدگی خسرو کے درباری مرتبہ پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ پیرو مرید کے رشتہ میں بھی کوئی تلخی پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح غیاث الدین تغلق بھی نظام الدین اولیا سے ناراض ہو جاتا ہے مگر امیر خسرو تغلق نامہ تصنیف کرتے ہیں اور خانقاہ میں بھی آمد و رفت قائم رہتی ہے۔

خسرو کی شخصیت کے اس پہلو پر بہت سے سوانح نگاروں نے اپنے اپنے طور پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر مجیب اپنی کتاب Indian Muslims میں اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں خسرو کی زندگی کا یہ پہلو اس لیے قابل معافی ہے چونکہ اس زمانہ کی ریت ہی یہ تھی۔ امیر خسرو دربار کا اسی طرح ایک جزو تھے جیسے دوسرے ساز و سامان اور جب بادشاہ بدلتا تھا تو امیر خسرو بھی دربار کے املاک اور فرنیچر کی طرح نئے بادشاہ کے حصہ میں آجاتے تھے۔ مولانا شبلی اسی بات پر دوسرے انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ خسرو کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مدح کو پسند نہیں کرتے۔ صرف معاش کی ضرورت انہیں مجبور کرتی ہے اس لیے قصیدہ میں تعریف سے دوسری اور باتیں زیادہ لکھتے ہیں مثلاً بہار کا سماں برسات کی رُت، صبح و شام کے مناظر، ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی اور صرف مقطع میں تعریف کے الفاظ لکھ کر قصیدہ مکمل کر دیا۔

فن موسیقی سے امیر خسرو کا لگاؤ بھی ان کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا سبب تھا۔ سہاب سرمدی نے ان کی موسیقی پر خوب لکھا ہے۔ ان کی رائے میں ایران کی صنفِ غزل اور ہندوستان کے سرود ان دونوں پر خسرو کی اثر اندازی کا صحیح اندازہ لگانا ہی ارتقائی نئے رنگ کا راز پالینا ہے جو ہندوستان کی موسیقی میں رونما ہوا۔ یہ واقعہ ہے کہ خسرو نے غزلیں اکثر و بیشتر اس لیے کہیں کہ انہیں گایا جائے اور چونکہ انہیں گایا گیا اس لیے تہذیبی میل جول نے آنکھیں کھولیں تو غزل کا سابقہ ہندی لوک گیت سے پڑا۔

برنی کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ جن دنوں ہم نے ہوش سنبھالا تو دلّی کے گلی کوچوں میں غزل کی دھوم مچ رہی تھی۔ اسی زمانہ میں ہندوستانی خاتون ترمتی خاتون کا شہرہ تھا جو سرود پر غزلیں گاتی تھیں اور امیر خسرو کی پروردہ تھیں۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے غزل گائکی کو نیا آہنگ دیا تھا۔ ان کے نزدیک موسیقی صرف ہاں، ہاں، ہوں، ہوں کا نام نہیں تھا جو اکثر موسیقار کرتے ہیں بلکہ اس میں کچھ بات بھی ہونی چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"درکند مطرب بے ہاں ہاں و ہوں، ہوں، در سرود چوں سخن بنود ہمہ معنی او ابتر بود۔ اب تو یہ عالم ہو گیا کہ جو کچھ میری تخیل تازہ تخلیق کرتی، اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ ہر صاحب نظر اسے دل میں جگہ دیتا، زبان پر اس کا چرچا رہتا۔ مطربانِ دلّی جب اس کے سوز و ساز کو چنگ و رباب کے سروں میں ڈھالتے تو اور تو اور پرخمیدہ بھی ایک بار سیدھے ہو جاتے"۔

امیر خسرو کی امیر حسن دہلوی سے ملاقات اور باہمی تعلقات کے بارے میں زیادہ تر مورخین نے لکھا ہے۔ مولانا شبلی بھی اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ "امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے ساتھ تعلقات ہیں۔ حسن نہایت صاحبِ جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر صاحب کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گزرے۔ آفتاب حُسن کی شعاعیں ان پر بھی پڑیں۔ وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو! حُسن نے کہا کہ ایک پلڑے پر روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے میں سونا رکھے۔ سونے کا پلّہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں۔ امیر نے پوچھا اگر خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے نیازِ درد لیتا ہوں۔ اس اندازِ گفتگو نے امیر صاحب کو اور بھی بے اختیار کر دیا۔ فوراً حضرت نظام الدین

اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ حسن نے تو ناوک اندازی کی تھی مگر خود بھی شکار ہو گئے۔ اسی وقت دکان بند کر کے خواجہ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے دل دادہ (امیر خسرو) سے ملے۔ اسی تعلق سے خواجہ کی خدمت میں آتے جاتے رہتے تھے۔''

امیر صاحب سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لیے بھی جدا نہیں ہوتے تھے۔ امیر صاحب نے جب خان شہید (بلبن کا بیٹا) کی ملازمت اختیار کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے۔ چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو امیر صاحب کے ساتھ حسن بھی اس موقعہ پر موجود تھے۔ دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی۔ امیر صاحب نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی (اس کا ایک شعر ہے)

زیں دل خود کام کار من بہ رسوائی کشید
خسروا فرمانِ دل بردن ہمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر سے ملنے سے منع کیا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ خان شہید نے غصہ میں آ کر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے۔ حسن سیدھے امیر خسرو کے پاس گئے۔ شہید خان کو پتہ لگا۔ امیر کو بلوا بھیجا اور پوچھا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہاتھ نکال کر دکھا دیا اور کہا ع

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں امیر خسرو کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے۔

حضرت امیر خسرو کو قدرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا، تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مگر انہوں نے ریاض اور مشق سے صیقل کر کے انہیں چمکایا بھی تھا۔ انہوں نے اس کا ذکر اپنے پہلے دیوان تحفۃ الصغر میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایت ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی۔ فضلا اور بلغاء روزگار ان کو سن کر تعجب کرتے تھے۔ ان کے تعجب سے میرا شوق ابھرتا تھا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم تھا کہ کثرتِ شوق کے اثر سے شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مثل قلم سرنگوں رہتا تھا اور رات

کو مطالعہ میں مصروف یہاں تک کہ نظر میں دقت پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کا امتحان لیتے تھے۔ امتحان سے میرا دل گرماتا تھا اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اس وقت تک کوئی استاد نہ ملا تھا جو دقائق کی راہ بتاتا۔ قلم کو بے راہ روی سے روکتا۔ نقائص کو دور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نوآموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشق سخن کرتا تھا اور سخن سنجی سیکھتا تھا۔ اسی طرح آہن دل کی صیقل گری اپنی ہی قوتِ بازو سے کرتا رہا۔ استادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ مذاق لطفِ کلام ذوق سے آشنا ہوا۔ انوری وسنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا۔ جو عمدہ نظم نظر آتی اس کا جواب لکھتا۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتا اسی کے انداز پر شعر کہتا۔ ایک عرصہ تک خاقانی کے دامن دولت سے لپٹا رہا۔ جو الفاظ اس کے کلام میں مغلق تھے ان کی تعلیق کی (یعنی تشریح کی)۔ اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم مقتضائے نوعمری کماحقہ حقائق کلام واضح نہیں ہوتے تھے۔ ہر چند میری ہمت آسماں پیماں تھی۔ لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی۔ بایں ہمہ عاقبۃ الامر استاد کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی چونکہ میرے کلام کا کوئی خاص مرجع نہ تھا، ہر استاد کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس لیے اس مجموعہ میں متقدمین اور متاخرین سب کا رنگ موجود ہے۔

حاصل کلام میرے والد نے تحصیل علم کے واسطے مجھے مکتب میں بٹھا دیا۔ یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کی تکرار تھی۔ میرے استاد مولانا سعدالدین خطاط مشقِ خط کی تاکید کرتے تھے۔ میں اپنی ہی دھن میں تھا۔ وہ پیٹھ پر دُرّے لگاتے تھے مجھ کو زلف وخال کا سودا تھا، انتہا یہ کہ اسی سن میں وہ شعر وغزل کہنے لگا جس کو سن کر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی"۔

مولانا شبلی نعمانی امیر خسرو کی جامع شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامعہ کمالات انسان پیدا نہیں ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے حامل انسان ایران وروم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، سعدی، انوری، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم

سخن کے بادشاہ ہیں لیکن ان کی حدودِ حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن امیر خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے ہائے سخن یعنی نظمیں، مستزاد اور صنائع بدائع کا تو شمار نہیں۔ نثر کی کتابیں الگ ہیں...... ان پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ وفات میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا (ہندوی) میں ہے''

امیر خسرو اپنی خداداد تخلیقی اور موزونیٔ طبع کی وجہ سے فی البدیہہ اشعار کہنے پر قادر تھے اور ان صفحات میں اپنی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے جوہر دکھاتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ شاعری کی خداداد نعمت ضائع ہو جاتی ہے۔ شاعر لہو ولاب کا شکار ہو کر خود کو تباہ کر لیتا ہے مگر وہ بہت ذہین اور محتاط انسان تھے، انہوں نے ایسا نہیں کیا، وہ خطرات سے خود کو بچائے کامرانی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ بقول پروفیسر حبیب:-

> ''اندھیروں اجالوں کا یہ شہر امیر خسرو کی خداداد صلاحیتوں کے لیے ایک فطری پس منظر پیش کرتا تھا۔ سیکھنے کے لیے یہاں بہت کچھ تھا اور وہ سیکھنا چاہتے تھے۔ دلّی کو انہوں نے ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ وہ ایک طرف علما و دانشوروں کی محفل کے شریک تھے۔ دوسری طرف صوفیوں وفقیروں کے روح پرور مذاکروں کے شاہد۔ وہ رقص و سرود کی نشاط انگیز مجلسوں سے بھی بے گانہ نہیں تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو ان کے سینہ میں انسانی جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شیخ سعدی شیرازی نے کہا تھا 'میں نے ہر درخت کا پھل چکھا ہے اور خسرو کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے ''شراب شیراز'' کو اپنے ساغر میں انڈیل لیا تھا۔
>
> خسروی سرمست اندر معنی برفت
> شرک از خم خانہ مستی کہ در شیراز بود

خسرو نے اپنے پیش رووں کے نقش قدم پر چلتے زندگی کا
ہر رنگ میں مشاہدہ و تجربہ کیا تھا۔ شاہی محل سے لے کر غریبوں کی
جھونپڑیوں تک اور خانقاہ سے لے کر طوائف کے کوٹھے تک انہوں
نے زندگی کا ہر جلوہ دیکھا تھا۔''

(انگریزی سے ترجمہ)

خود اپنے لیے مدح سرائی کی سزا تجویز کرتے ہیں۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں ''اے خسرو! بادشاہوں کی شان میں قصیدہ لکھنے کا کفارہ یہی ہے کہ تجے عالموں کے سامنے سر جھکا کر ان کی دعائیں لو۔ منشی سعید مارہروی بھی تائد کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ خسرو کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالطبع بادشاہوں کی صحبت اور مداحی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ خسرو کی ایک رباعی ہے:

از گفتن مدح دل بہ می رد   شعرار چہ تر و فصیح باشد
گردو زنفس چراغ مردہ   گر خود نفس مسیح باشد

شخصیت کے تضادات کسی حد تک معاشرہ کی دین بھی ہوتے ہیں۔ امیر خسرو جس معاشرہ میں سانس لے رہے تھے وہ بہت پیچیدہ تھا۔ غیر محفوظ ہونے کی تشویش ننگی تلوار کی طرح سر پر لٹکی رہتی تھی۔ امیر خسرو کی شخصیت میں اگر کچھ تضادات نظر آتے ہیں تو وہ اس عہد کا عکس تھے۔ خسرو کی مصلحت پسندی اور محتاط رویہ کو بھی اسی تناظر میں سمجھنا چاہیے یہ کوئی بڑی بات بھی نہ تھی خلجی کے عہد میں صوفی سیدی مولا کا دردناک قتل، ایک گھناؤنا واقعہ ہے (کچھ کا کہنا ہے وہ اس قتل کا خود ذمہ دار تھا) بھلا امیر خسرو جیسا ذہین اور محتاط شخص اس کے بارے میں کیوں آواز اٹھاتا۔ تاہم عہد سلطنت میں وہ ایام بڑی کشمکش اور پریشانی کے ہوتے تھے جب حکومت ایک شاہی گھرانے سے دوسرے گھرانے میں منتقل ہوتی تھی۔ دربار سے وابستہ لوگ اس عبوری زمانہ میں کنارے پر بیٹھ کر ہوا کے رخ کو دیکھتے تھے تاکہ بروقت صحیح فیصلہ کر سکیں۔ خلجی خاندان کے آخری فرمانروا سلطان قطب الدین کو اس کے غلام خسرو خاں نے جس کے ساتھ سلطان کے ناجائز تعلقات بھی بتائے جاتے ہیں، قتل کر دیا اور خود تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حکومت چار پانچ ماہ رہی۔ اس دوران خسرو دربار

سے دور رہے۔ اس لیے کہ انہوں نے آنے والی صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خسرو خاں کا دورِ حکومت چند روزہ ہے۔ اس لیے کہ نسلی برتری کے احساس میں مبتلا ترک اُمرا ایک پرواری (نو مسلم) کا تسلط زیادہ عرصہ برداشت نہیں کریں گے۔ اور ان کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ جونہی خسرو خاں کی حکومت ختم ہوئی خسرو اگلے سلطان ملک تغلق کی شان میں قصیدہ لکھ رہے تھے۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت اور ذہانت کا ثبوت ہے۔ ان چند جھلکیوں کی تفصیل اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں۔

یہاں اپنے اس عجز و انکسار کا اعتراف کر لوں کہ باوجودیکہ میں نے فارسی اشعار کی تصحیح میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر پھر بھی اندیشہ ہے غلطیاں رہ گئی ہوں گی۔ جو ظاہر ہے میرے کھاتے میں جائیں گیں۔ جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

مورخہ: ۳۱ / مارچ، ۲۰۰۶ء

شیخ سلیم احمد
D-131 B, Sector 26
Noida-201301(UP)

☆☆

تعارف

حسن الدین احمد

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ عالمی سطح پر مطالعہ خسروؒ کی کوششیں ہو رہی ہیں اور ہندوستان ان کوششوں میں سب سے پیش پیش ہے۔ میرے دوست اور سات سو سالہ تقریبات کی قومی کمیٹی کے رکن اور شعبہ نشر و اشاعت کے کنوینر شیخ سلیم احمد صاحب نے امیر خسروؒ سے متعلق نہایت قیمتی مواد کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ نہ صرف جمع کیا ہے بلکہ ترتیب و تدوین کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس تالیف کے سلسلہ میں شیخ صاحب کو کافی تحقیق و جستجو کرنی پڑی ہے۔ اور تلاش بسیار کے بعد ایسے ایسے نوادرات فراہم کئے ہیں جو عام دسترس سے باہر تھے اور امتداد زمانہ کے باعث نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ ان کو سامنے لا کر شیخ صاحب نے ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ اس کامیاب اور قابلِ قدر کوشش کے لئے میں ان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اہلِ نظر اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ امیر خسروؒ پر مرتب کردہ کتابوں میں یہ مجموعہ سب سے بلند معیار کا حامل ہے۔

امیر خسروؒ کا شمار اپنے زمانہ ہی کے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے۔ وہ جامع الکمال شخصیت کے مالک تھے۔ امیر خسروؒ ہندوستانی تھے اور ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ان کو اس دیس سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لئے ہم ہندوستانیوں پر جن کو امیر خسروؒ کے ہم وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان تقریبات میں نمایاں اور شایان شان حصہ لینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سال رواں جلسے ہوں گے۔ علمی مذاکرات ہوں گے اور رنگا رنگی محفلیں سجائی جائیں گی اور ایک سے زیادہ ملکوں کی جانب سے

اس عظیم شخصیت کو زبردست خراج ہائے عقیدت پیش کئے جائیں گے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس دوران ایسا لٹریچر بھی مہیا کردیا جائے۔ جو آئندہ کئی برسوں کی ضروریات کو پورا کرسکے۔ یہ پیش کش ان ہی کوششوں کی ایک کڑی ہے۔ انفرادی طور پر ایسی کوششیں چھوٹے پیمانہ پر سہی لیکن ان کا مجموعی تاثر اہم مضمرات کا حامل ہوگا اوران سے ہندوستان کا سر فخر سے بلند ہوگا۔ آج دنیا کو حضرت امیر خسروؒ کے پیام ان کے طریقۂ عمل اور محبت بھرے اور دلوں کو جوڑنے والے آدرشوں کی ضرورت ہے۔ یہ پیام ہندوستان ہی دنیا کو دے سکتا ہے اور ہندوستان ہی مطالعۂ خسرو کے لئے قیمتی مواد مہیا کرسکتا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ کی سات سو سالہ تقریبات قومی پیمانہ پر منانے کا خیال چند سال قبل بعض ذہنوں میں پیدا ہوا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ دوسرے ممالک میں بھی ایسا سوچا جارہا ہے اور خاص طور پر روس میں مشہور ماہر ہندوستانیات باباجاں غفوروف کی سرکردگی میں تقریبات منانے پر غور ہورہا ہے تو ہمارے یہاں بھی اس خیال کو بڑھاوا ملا۔ نواب علی یاور جنگ اور مرحوم سجاد ظہیر صاحب نے اس سلسلہ میں چند ابتدائی باتوں پر سوچ بچار کیا اور مفید مشورے دیئے۔ لیکن منظم پیمانہ پر قومی تقریبات کا لائحۂ عمل مرتب کرنے اور قومی کمیٹی کی تشکیل دینے، اور ابتدائی تنظیمی مسائل کو نہایت قابلیت کے ساتھ حل کرنے میں عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب نے جو فاضلانہ رہبری فرمائی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جو غیر معمولی دلچسپی لی اور جس طریقہ پر کام کرنے والوں کی ہمت افزائی فرمائی اور جس فراخدلی سے اپنا قیمتی وقت دیا۔ وہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔

وقت نے امیر خسروؒ کے پیام کے مقابلہ میں ہار مان لی ہے امتداد زمانہ سے ان کے کلام کا بڑا حصّہ ضائع تو ہوا اور خصوصاً ان کا ہندوی کلام اب ناپید ہے لیکن ان کے پیام کا مجموعی تاثر اور مقصد آج بھی انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ "خسرویات" کو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اور علم کی حیثیت سے ترقی دی جائے اور اس کی افادیت کو پری طرح واضح کیا جائے۔

آج سے پہلے خسرویات کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ امیر خسرو کی تصانیف میں علم ودانش اور ادبی شاہکاروں کا ایک عظیم خزانہ تحقیق وجستجو کی نظروں سے بڑی حد تک اوجھل

رہا ہے ان کے کلام کا بڑا حصہ اس زمانہ کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے جس پر ابھی تک ویسی گہری نظر نہیں ڈالی گئی جیسی کہ اس کا حق ہے۔ ان امور کے پیش نظر ''خسرویات'' کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس مختصر مجموعہ میں شیخ صاحب نے نواب اسحٰق خاں صاحب کی وہ تاریخی رپورٹ بھی شامل کی ہے جس کو خسرویات کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے اور جس کے نتیجہ کے طور پر ۱۹۱۷ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان امیر خسروؒ کی حسب ذیل کتابوں کی اشاعت کا انتظام ہوا:۔

نام تصنیف	نام مرتب	سال اشاعت
۱۔ آئینہ سکندری	سعید احمد فاروقی	۱۹۱۷ء
۲۔ دول رانی وخضر خاں	رشید احمد سالم	۱۹۱۷ء
۳۔ مجنوں لیلیٰ	حبیب الرحمٰن شیروانی	۱۹۱۷ء
۴۔ ہشت بہشت	سلیمان اشرف	۱۹۱۸ء
۵۔ قرآن السعدین	ایم اسمٰعیل	۱۹۱۸ء
۶۔ جواہر خسروی	ایم۔ امین۔ چریا کوٹی	۱۹۲۰ء
۷۔ دیوان وسط الحیات	فضل احمد حافظ	۱۹۲۰ء
۸۔ مطلع الانوار	مقتدیٰ خاں شیروانی	۱۹۲۶ء
۹۔ شیریں خسروؒ	علی احمد اسیر	۱۹۲۷ء
۱۰۔ تغلق نامہ	ہاشمی فرید آبادی	۱۹۳۳ء

محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں امیر خسروؒ سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں شیخ صاحب نے وہ بھی کھوج نکالی ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم میں امیر خسرو پر جو مقالہ لکھا ہے اس کو علمی اور تحقیقاتی اعتبار سے بلند درجہ حاصل ہے۔ وہ بھی کتاب میں شامل ہے۔

منشی احمد سعید مارہروی کی کتاب حیات خسروؒ (۱۹۰۹ء) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب نہایت جامع ومفید معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ اسی طرح امیر خسروؒ پر پروفیسر حبیب کا انگریزی مقالہ بھی ایک عرصہ سے عدم دستیاب تھا۔ یہ مضمون علی گڑھ میگزین میں ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا جسے شیخ صاحب نے ڈھونڈ نکالا اور اُردو میں

اس کا سلیس ترجمہ کیا۔

خالق باری کے تعلق سے محمود شیرانی کے تحقیقی مقالہ کو جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ خالق باری امیر خسروؒ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ۱۰۳۱ھ میں ضیاالدین خسرو نام کے ایک شخص نے لکھی۔ خسرویات میں خاص اہمیت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس مقالہ کو بھی اس مجموعہ میں شریک کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند کا مقالہ امیر خسروؒ اور ہندوستان بھی نایاب تھا۔ وہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ اس کتاب کی جامعیت وافادیت کا اندازہ آپ اسے پڑھ کر ہی لگا سکیں گے۔ ان کی تحقیق و جستجو کے لئے شیخ صاحب کو ایک بار پھر مبارکباد دیتا ہوں۔

☆☆

امیر خسرو کی خودنوشت

میرے والد سیف شمسی (منسوب بہ سلطان شمس الدین التمش) نہایت بہادر اور صف شکنی میں شہرہ روزگار تھے۔ باوجود اس کے نہایت کم سخن تھے۔ ترک کی نسبت مشہور ہے کہ "ترک درخواب فرشتہ است" مگر وہ بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔ ایسے فرشتے خواب میں آئیں تو آئیں۔ نہایت پاکباز اور باخدا تھے۔ خود تو محض امّی تھے لیکن ان کی ہمّت اس طرف متوجہ رہی کہ مجھ کو کچھ آجائے تو تھوڑی بہت قابلیت مجھ میں ہے وہ انہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ان کو شہادت کی بہت تمنا تھی خداوند تعالیٰ نے اس سعادت سے ان کو سرخرو فرمایا۔

سیف از سرم "برفت" ودل من دو نیم ماند
دریائے من روان شدد "دریتیم" ماند

(فرشتہ نے بجائے "برفت" کے "گذشت" لکھا ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے۔ مرتب)

میری عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ اس صغرسن میں جبکہ دودھ کے دانت ٹوٹتے تھے میرا کلام نمونہ درافشانی تھا۔ "درآن صغرسن کہ دندان می افتاد سخن می گفتم وگہراز دہانم می ریخت، والد کے بعد نانا نہایت بااقبال اور صاحبِ اقتدار تھے۔ اگرچہ لفظ "سلطانی" سے محروم تھے مگر حقیقت میں وہی سلطان تھے ان کی فراخ حوصلگی لفظ۔ ان کی فراخ حوصلگی نے تمام ہندوستان قابو میں کر رکھا تھا۔ تخت کی آڑ میں کل کام وہی کرتے تھے۔ مفسدوں کا منہ بند رکھنے کے واسطے بعض خدمات بھی انہوں نے لے رکھی تھیں۔ دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلام اور دس ہزار سوار ان کی سرکار میں تھے۔ سال بہ سال کثرت سے کلاہ وقبا ان کے توشہ خانہ سے تقسیم ہوتیں۔ باورچی خانہ سے بکثرت محتاجوں کو کھانا ملتا۔ ان کا فیض ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں پہنچتا تھا۔ ستر برس عہدہ عرض مملکت پر ممتاز رہے۔ میں جب ان کی

آغوشِ شفقت میں بیس برس کا ہوا تو انہوں نے ایک سو تیرہ برس کی عمر میں وفات پائی۔ نانا کے انتقال کرنے پر میں شاہزادہ قتلو خان عرف چھجو علاؤالدین محمد بن اعزاالدین کشلی خان ملقب بہ خان اعظم (سلطان بلبن کا بھتیجا) کے دامن دولت سے لپٹا۔ دو برس شہزادہ ممدوح کی سرکار میں رہا کئی قصیدے اس کی شان میں لکھے۔ میں ہمیشہ اس کی مجلس میں حاضر رہتا تھا اور اپنی خوش بیانی سے حاضرین کو مسرور کرتا۔ ایک روز بادشاہ (سلطان غیاث الدین بلبن) کا چھوٹا بیٹا بغرا خان، خان معظم قتلو خان کے یہاں مہمان آیا (یہ دونوں چچازاد بھائی تھے) چند مصاحب اور ندیم ساتھ تھے۔ منجملہ ندیموں کے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی تھے۔ خان معظم کی مصاحبت میں صرف میں ہی تھا اس طرف سے وہ سب چھیڑ چھاڑ کرتے تھے اس طرف سے صرف میں جواب دیتا تھا تاہم سب کا قافیہ تنگ تھا۔ میں نے لطائف وظرائف سے محفل کو اس قدر گرمایا کہ شاہزادہ بغرا خان نے فرطِ سرور میں ایک طبق سونے کے سکوں کا بھر کر میرے سامنے رکھوا کر کہا کہ یہ آپ کے باورچی خانہ کا خرچ ہے۔ ہمارے خان (قتلو خان) کا مزاج نہایت غیور تھا۔ اس کو یہ امر شاق ہوا میں نے ہر چند معذرت کی لیکن اس کا دل صاف نہ ہوا۔ تکدر یہاں تک بڑھا کہ میری صفائی کمزور ہونے لگی۔ آخر کار مجھ کو کنارہ کش ہونا پڑا اور بے سروسامانی میں سامانہ میں سایہ امن نظر آیا اور میں وہاں چلا گیا (سامانہ کا حاکم شہزادہ بغرا خان تھا جو سلطان غیاث الدین بلبن کا دوسرا بیٹا تھا) لوگوں نے شاہزادے سے غائبانہ میری اس قدر تعریف کی کہ وہ سراپا شوق بن گیا۔ جب میں حاضر ہوا تو ندیم خاص مقرر کیا میرا غرور روز بروز ترقی پذیر تھا کہ ناگاہ پرچم شاہی دارالملک دہلی سے لکھنوتی کی جانب روانہ ہوا (۶۷۸ھ) شاہزادہ خود عزم ہمرکابی تھا کہ قاصد سلطانی پہنچا اور شاہزادہ مع سپاہ لشکر شاہنشاہ میں آملا۔ بندہ ساتھ تھا۔ ایک سال تک قطع مسافت کرتا رہا تاہم منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ لکھنوتی (بنگالے کا قدیم اسلامی دارالسلطنت تھا گور بھی اسی کو کہتے ہیں۔ اکبر بادشاہ نے جنت آباد لقب دیا اب ویران پڑا ہے اور گنگا کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے۔ مرتب) سے ڈیڑھ سو کوس اس طرف پہنچے پھر بھی گھوڑوں کی پشت زمین سے گراں بار رہی۔ کیچڑ کا یہ عالم تھا کہ پرندہ اس پر گر پڑتا تو شہد کی مکھی کی طرح پھنس جاتا قصہ دراز اور عرصہ بیان تنگ مختصر یہ کہ طغرل کا قلع قمع ہو گیا اور شاہزادے کو حکومت لکھنوتی

عطا ہوئی۔ شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے چاہا کہ میں بھی شاہزادے کے دربار میں حاضر رہوں مگر میں عزیزوں کی مفارقت سے گھبرا گیا تھا۔ لشکر شاہی کے ہمراہ دہلی چلا آیا۔ انہی مہینوں میں قاآن الملک خان شہید (سلطان محمد جو بلبن کا بڑا بیٹا تھا۔ مرتب)

فاتح ومنصور داخل دارالسلطنت ہوا۔ میری سخنوری کی شہرت سن چکا تھا بلا کر ندیمی کا خلعت بخشا اور ملتان کو ساتھ لے گیا۔ وہاں مغلوں (منگولوں) کا معرکہ پیش آیا اور شہزادے کو شہادت نصیب ہوئی۔ میں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ مگر زندگی باقی تھی خداوند تعالیٰ نے اس بلا سے نجات دی۔ رہائی پا کر من قبۃ الاسلام (دہلی) کی زیارت سے مشرف ہوا اور والدہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ کچھ عرصہ تک مومن پور عرف پٹیالی میں گنگا کے کنارے وقت خوشی سے گذرا۔ اسی عرصہ میں سلطان عادل غیاث الدین (بلبن) نے رحلت فرمائی (۶۸۵ھ) اور دولت معزی (معزالدین کیقباد) کا علم بلند ہوا بندے کی طلبی ہوئی دربار میں ملک نظام الدین (وزیر) کا دور دورہ تھا اور اس کے دل میں ایک وجہ سے مجھ خاکی کی جانب سے غبار تھا۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ضرر نہ پہنچائے۔ اس لیے کنارہ کشی کر کے حاتم خان کے زیر سایہ پناہ لی۔ امیر موصوف نے اس قدر دولت مجھ کو عطا کی کہ اگر میں اس کو خرچ نہ کر ڈالتا تو میری اولاد کی عمر بھی آبرو اور فراغت سے بسر ہو جاتی۔ تھوڑے ہی دن حاتم خان کی ندیمی میں گذرے تھے کہ نظام الدین جنت سدھارا۔ (مجلس نظامی بہ بوستان فردوس جائے خوش کرد) اور میں دربار شاہی (معزی بادشاہ) میں حاضر ہوا خلعت ندیمی سے ممتاز ہوا اور دولت تقرب سے مالا مال۔ بادشاہ کی اقبال مندی کا زمانہ تھا اور رات دن عیش وعشرت کے چرچے تھے۔ آخر ساقی زمانہ نے اس کو وہ جام نامرادی پلایا جس کے خمار نے آنکھ کھولنے کی مہلت نہ دی۔ اس کا قرۃ العین شمس الدین تخت پر بٹھایا گیا اور شائستہ خان (جو آسمان فروزی تھا) اس کا پشت پناہ بنا۔ بندہ خسرو کی خدمت شائستہ خانی سے سرفرازی ہوئی آخر چتر شاہی خود شائستہ خاں کے سر پر آ کر ٹھہرا اور وہ فیروز شاہ (جلال الدین خلجی) بن کر تخت نشین ہوا (۶۸۸ھ) خداوند تعالیٰ اس کے اقبال کو بلند رکھے۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ درباروں ہی میں زندگی بسر کی اور شاہزادوں کا ہمنشین اور ہم زانو رہا۔ اوج ناموری پر اسی بادشاہ کی تربیت ومرحمت سے پہنچا۔ (وہ) تمام بادشاہوں میں سے زیادہ ذی علم ہے اور اگلے پچھلے دونوں بادشاہوں میں کوئی اس کے

مثل سخن فہم نہیں ہوا میرے کلام کی کچھ حقیقت ہے اس کو خوب سمجھتا ہے اور خوب قدر دانی فرماتا ہے۔ میرے چار سخن سنج اور سخن فہم دوست ہیں۔ مولانا شہاب الدین قاضی سراج الدین ''برادر'' تاج الدین زاہد اور ''برادرم'' علاؤالدین علی شاہ۔ آخر الذکر دوست موافق و منصف ہے نہ میری طرفداری کرتا ہے نہ انصاف کی جانب پشت۔ اس کا مرتبہ شاہانِ سخن میں مسلم ہے اور ایسا دوست ہے کہ اگر برادران موافق اس یوسف لقا کو ہزار جان کے بدلے بیچ ڈالیں تو بھی ٹوٹے میں رہیں گے۔

لڑکپن

بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایت ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت ورباعی کہنی شروع کی۔ فضلا و بلغا روزگاران کو سن کر تعجب کرتے تھے۔ ان کے تعجب سے میرا شوق اُبھرتا تھا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم کہ کثرت شوق کے اثر سے شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مثل قلم سرنگوں رکھتا تھا اور رات کو مطالعہ میں مصروف۔ یہاں تک کہ نظر میں رقت پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کا امتحان لیتے تھے۔ امتحان سے میرا دل گھبراتا تھا اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اس وقت تک کوئی استاد نہ تھا جو حقائق کی راہ بتاتا۔ قلم کو بے راہ روی سے روکتا۔ نقائص کو دور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نو آموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشق سخن نجی سیکھتا تھا۔ اسی طرح آہن دل کی صیقل گری اپنی ہی قوت بازو سے کرتا رہا۔ استادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا حتّٰی کہ مذاق لطیف کرم و ذوق سخن سے آشنا ہوا۔ انوری وسنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا جو عمدہ نظم نظر آئی اس کا جواب لکھتا جس دیوان کا مطالعہ کرتا اسی کے انداز پر شعر کہتا۔ ایک عرصہ تک خاقانی کے دامن دولت سے لپٹا رہا جو الفاظ اس کے کلام میں تعلیق کی (یعنی نوٹ لکھے) اگرچہ متعلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم بمقتضائے نوعمری کماحقہ حقائق کلام وضع نہ ہوتے تھے، ہر چند میری ہمت آسمان پیما تھی لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی بایں ہمہ ان اساتذہ کی پیروی

سے طبیعت بڑھنے لگی چونکہ میرے کلام کا کوئی مرجع نہ تھا، ہر استاد کے رنگ میں کہتا تھا اس لیے اس مجموعہ تحفۃ الصغر) میں متقدمین و متاخرین سب کا رنگ موجود ہے۔ حاصل کلام میرے والد نے تحصیل علم کے واسطے مکتب میں بٹھایا۔ یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کی تکرار تھی۔ میرے استاد مولانا سعد الدین خطاط مشق خط کی تاکید کرتے تھے۔ میں اپنی ہی دھن میں تھا۔ وہ پیٹھ پر درّے لگاتے مجھ کو زلف وخال کا سودا تھا انتہا یہ کہ اسی سن میں وہ شعر و غزل کہنے لگا جس کو سن کر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے استاد کو خواجہ اصیل نائب کوتوال نے خط لکھنے کے لئے بلایا، میں دوات قلم لے کر ہمراہ ہوا۔ اس عزیز کے گھر میں خواجہ عزیز الدین موجود تھے۔ خواجہ موصوف عالم متبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مطالعہ کتاب میں مصروف تھے۔ اثنائے مطالعہ میں جب کسی مضمون پر گفتگو کرتے تو منہ سے موتی جھڑتے اور جواہر آبدار زبان سے نکلتے۔ میرے استاد نے ان سے کہا ”یہ میرا شاگرد ہے اس بچپن میں نظم کا بے حد شوق ہے شعر پڑھتا بھی خوب ہے۔ کتاب اس کو دے کر امتحان لیجئے“ خواجہ عزیز نے فوراً کتاب دے کر بنانے کی فرمائش کی میں نے اشعار ترنم آمیز لہجے میں پڑھنے شروع کیے اس کے اثر سے آنکھیں پرنم ہوگئیں ہر طرف سے تحسین کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر میرے استاد نے کہا۔ پڑھنا سن لیا اب کوئی بیت پیش کر کے جودت طبع کی آزمائش کیجئے۔ خواجہ ممدوح نے چار غیر متناسب چیزوں کے نام دے کر کہا ان کو نظم میں موزوں کرو۔ وہ نام موئے، بیضہ، خربزہ، تیر تھے میں نے اسی جلسہ میں یہ رباعی موزوں کر کے سنائی۔

ہر موئے کہ در دو زلف آن صنم ست	صد بیضۂ عنبریں دراں موئے ضم ست
چوں تیر مداں راس دلش را زیرا کہ	چوں خربزہ دندانش درون تنم ست

جس وقت میں نے یہ رباعی پڑھی خواجہ نے بہت ہی آفرین فرمائی اور نام پوچھا میں نے کہا۔ خسرو۔ باپ کا نام پوچھا، میں نے کہا ”لاچین“ کہا۔ ”لاچین ترک خطا ہے؟“ میں نے جواب دیا ”بے خطا ترک ہے“ دریافت فرمایا۔ ”تم درم خریدہ ناصری ہو؟“ (اشارہ بجانب سلطان ناصر الدین) عرض کی۔ ”سلطانی شمسی ہوں“ (اشارہ جانب شمس الدین التمش

ہے۔ سلطانی اشرفی کو بھی کہتے ہیں۔ درم خریدہ کی کیسی رعایت) فرمایا کہ "چونکہ تمہاری نسبت سلطانی ہے لہٰذا سلطانی اپنا تخلص رکھو۔ اس کے بعد بہت سی باتیں میرا دل بڑھانے کو کیں اور فن کے متعلق بہت سی دقیق باتیں تلقین کیں جن کو میں اپنے دل میں رکھتا گیا۔ اس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا۔ اس دیوان میں یہ سکہ بہت رائج ہے۔ اس کے بعد میں باریک مضامین کے پیچھے پڑا رہا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر زمانہ لڑکپن تھا، اس لیے کلام کبھی جمع کرنے کا خیال نہیں کیا میرا بھائی تاج الدین زاہد (جس کی باریک بین طبیعت مشاطہ طرۂ اشعار ہے) ان اشعار کو فراہم کر لیتا تھا اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کہا اس کا ایک مجموعہ اس نے بنایا میں نے اس کو دیکھ کر کہا۔ یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہے۔ اس نے نہ مانا اور فرمائش کی کہ اس کو مسلسل کر دو۔ چنانچہ میں نے ہر حصہ کلام پر ایک شعر اس کے عنوان کے طور پر کہہ کر لگا دیا۔ یہ میری ایجاد ہے مجھ سے پیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا۔ اس دیوان کا نام "تحفۃ الصغر" رکھا۔ یہ سچ ہے کہ ہر چند اوراق باطل جمع ہیں میدان نشیب و فراز سے معمور تھا اور پاؤں میں لنگ تھی میں نے بہت چاہا کہ پائے قلم کو جنبش نہ کرنے دوں لیکن دوستوں نے نہ مانا عموماً سب (اور خصوصاً بھائی تاج الدین) برابر مصر رہے۔ میں برسوں اس تاج بلند گوہر کے سلک محبت میں سرفراز رہا ہوں۔ اور اخوت کے اثر نے ہم دونوں کو بلا مبالغہ برادران توام کی مثال بنا دیا ہے خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے۔

بسکہ جانم یگانہ شد با او
در گمانم کہ این منم با او

اس کا مقصد تھا کہ یہ دفتر پر حشو کسی شمار آ جائے۔ میں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) کہ وہ بچپن کا کلام ہے اعتراض نہ کرے گا۔ نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا۔ میں کہتا تھا کہ اس میں شتر و گربہ (رطب و یابس) بہت ہے اس کا جواب تھا کہ لوگ اس کو تعویذ بنا کر موشک و بازو (بازو کی چوہیا) رکھیں گے غرض برادر موصوف کے اصرار سے اس مجموعہ کو یاران خواب شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ بطیب خاطر قبول فرمائیں گے۔ (خلاصہ دیباچہ تحفۃ الصغر)

شباب

ایک شب کو میں بیٹھا ہوا چمن سخن کی سیر کر رہا تھا اپنے ہی کلام کا ایک گلدستہ (جو بہار جوانی کا شگوفہ ہے) ہاتھ میں تھا ؏ ربیع العمر ایام الشباب

یعنی جوانی بہار زندگانی ہے کبھی اس کے پھول پتے سے اپنے دل نہال کرتا اور کبھی اس کو ترنم میں ادا کر کے بلبل کا دل شاد کرتا۔ غرض کہ کبھی لکھتا کبھی پڑھتا۔ اسی عرصے میں برادرم علاؤ الدین شاہ کاتب (گویا اسی کی شان میں حضرت علی نے فرمایا تھا ''علیکم بحسن الخط فانّھا مفاتیح الرزق (خوش خطی سیکھو کہ روزی کی کنجی ہے) آ پہنچا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ میں نے حال کہا۔ سن کر بولا کہ تمہارے تازہ کلام کا ایک انبار میرے پاس جمع ہے جو ہنوز غیر مرتب ہے۔ اوّل اسے مرتب کردو۔ پھر اور کلام کی فکر میں پڑنا۔ میں نے ٹالا لیکن اس نے نہ مانا۔ باصرار اوّل مسودا تے کہ بر من است بیاض کن بعد از اں منشیات پیشینہ شدہ است بداں پیوند پس ضابطہ ورابطہ برآں بند بعد آں چنانچہ تحفۃ الصغر ووسط الحیوۃ را بہ محاسن دیباچہ مزین گردانیدہ جمال غرہ رانید بر و دیباچہ کمال بیاراد۔ یعنی جو مسوادات میرے پاس ہیں پہلے ان کو صاف کرو پھر انہیں میں پرانی تحریر جو طاق نسیان کی نذر ہو چکی ہے ملا دو اس کے بعد ایک ضابطہ ان پر باندھو یہ ہو چکے تو ''تحفۃ الصغر'' اور وسط الحیوۃ کی طرح غرہ کو بھی دیباچہ سے آراستہ کرو۔ آخر مجھ کو اپنے دوست کی فرمائش ماننی پڑی اور دوسرے ہی روز صبح کو مسودوں کا تھیلا کھول کر ترتیب شروع کر دی۔ شبانہ روز محنت کر کے دو ہفتے کے بعد یہ مجموعہ تیار کر دیا۔ تابعد دو ہفتہ ایں ماہ چہاردہ را کہ غرہ کمالش خوانند بآراستگی تمام برآوردم۔

زماہ سب ایں کہ خورشید است پرنور
بنا میز وچہ گویم چشم بددور

مرتب ہوتے ہی شائقین کے مطالعہ میں پہنچا اور ہر طرف تحسین و آفرین کی صدائیں آنے لگیں۔ جب دیوان مرتب ہو کر سخن شناس دوستوں کی نظر سے گذر گیا۔ اس وقت میں نے دیباچہ لکھ کر دیا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ عربی شعر کہنا نہیں آتا۔ حقیقت ایں ست کہ

طریق نیک نمید انم میں نے چند جز ہندی نظم کے بھی کہہ ڈالے۔ مجھ سے پہلے شاہان سخن میں کسی کے تین دیوان نہ تھے) دیوان کے ایک معنی دربار کے بھی ہیں) مسعود سعد سلمان کے البتہ تین دیوان ہیں۔ ایک عربی دوسرا فارسی تیسرا ہندی صرف فارسی میں تین دیوان سوائے میرے کسی کے نہیں۔ دیوان اوّل تحفۃ الصغر جو بچپن کا کلام ہے دوسرا وسط الحیوۃ عنفوان شباب کا ذخیرہ ہے۔ تیسرا یہ غرۃ الکمال۔ میرے نزدیک کلام غرۃ الکمال ہی ہے پہلا دیوان اس لیے جداگانہ مرتب کردیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بچپن کا کلام ہے اور حرف گیری سے باز رہیں۔ دوسرا اس واسطے فراہم کیا کہ اوسط مردم راصید کنم"

(خلاصہ دیباچہ غرۃ الکمال)

تصانیف

میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں۔ اور وہ اربعہ عناصر سے مرکب ہیں۔ وعظ وحکمت پر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں سنائی وخاقانی کی پیروی کی ہے اور یہ انداز بوجہ بلند آگ سے مشابہ ہے، جو عالمِ بالا کی طرف میل رکھتی ہے تخلق (قصیدہ) اور خلاصہ خیال میں طرز رضی وکمال اختیار کی ہے اور یہ انداز بوجہ روانی اور صفائی پانی سے ملتا جلتا ہے غزل اور مثنوی میں سطوری نظام کے قدم بقدم ہوں اس روانی کو بہ لحاظ لطافت وشادابی ہوا سے مناسبت ہے۔

محاکمہ

میرے کلام کا حصّہ مقطعات رباعیات معماونغز خود میرے وجود خاکی کا غبار ہے۔ جو اس لحاظ سے خاک ہے کہ اس میں بہت سے جواہرات چھپے ہوئے ہیں میری نثر بھی میری طبیعت کا جوہر ہے اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنون احسان نہیں ہوں خلاصہ کلام یہ ہے کہ استادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحب طرز خاص ہونا مجھ میں موجود نہیں میں خود کہہ چکا ہوں کہ میں نے بہت سے اساتذہ کا تتبع کیا ہے۔ دوسری شرط کہ کلام خطا اور قصور سے پاک ہو اس کا بھی مجھے کوئی دعویٰ نہیں بندے کی نظم اگرچہ رواں

ہے لیکن غزل اور لغز (چیستاں) میں جابجا لغزشیں بھی ہیں۔ نظم بندہ اگر چہ بیشتر ادانست۔ اما جا بجا در غزل و لغز یدنی ہم ہست۔ دونوں مذکورہ بالا طور کی نسبت مجھ کو اقرار ہے کہ پایۂ استادی تک میری رسائی نہیں رہی۔ تیسری شرط یہ کہ کلام شعرانہ ہو نہ کہ واعظانہ وصوفیانہ مجھ کو دعویٰ ہے کہ میرا کلام شاعرانہ ہے صوفیانہ اور واعظانہ نہیں ہے۔ چوتھی شرط کہ مرقع دوزی نہ ہو یہ بھی مجھ میں موجود ہے میں نے آج تک دوسروں کے متاع نہیں تاکے قصہ مختصر میں مالک طرز خاص نہیں خطا سے میرا کلام پاک نہیں میرا کلام اسلوب شعرا کے مطابق ہے سرقہ نہیں ہے۔ بس استادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں دو نہیں۔ میں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ

سند استادی نصف میرے قبضہ میں ہے نصف نہیں ہے ؏

ناتمام ناتمام ناتمام

☆☆

امیر خسرو

محمد حسین آزاد

اب جس قدر ممکن ہے عہد بعہد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں۔ امیر خسرو جوکہ ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کی ایک غزل نظمِ اُردو کی تاریخ میں دیکھو۔ جس کا پہلا مصرع ہے۔ ع زحال مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں۔ اس سے تمہیں کچھ کچھ حال اس وقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری بھی انہیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔ باریک بین اشخاص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں ۔

بیا برادر آؤ رے بھائی بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں کہتے ہیں ۔

لود پھٹکری مردہ سنگ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ

افیون چنا بھر مرچیں چار اُردو برابر تھوتھا ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے ترت پیڑ نینوں کی ہرے

نظم اُردو کی تاریخ میں ان کی عمدہ پہلیاں، مکر نیاں، دوسخنے، انمل میں نے لکھ دئے ہیں۔ انہیں دیکھو اور خیال کرو کہ بحریں دوہروں کی ہیں مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے۔

امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنع وایجاد کا رکھتی تھی۔ ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔ اس میں فارسی کی بحروں

نے اوّل اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اَب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں عجیب وغریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مکرنی، انمل، دوسخنے وغیرہ خاص ان کے آئینہ کا جوہر ہے۔ ہر ایک کی مثال لکھتا ہوں کیونکہ ان سے بھی اس وقت کی زبان کا کچھ نہ کچھ پتا لگتا ہے۔

بنولی کی پہیلی

تر در سے ایک تریا اتری اس نے بہت رجھایا　　باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری　　امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام بنولی

آئینہ کی پہیلی

فارسی بولی آئینہ　　ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے　　منہ دیکھو جو اُسے بتائے

ناخن کی پہیلی

بیسیوں کا سر کاٹ لیا　　نا مارا نا خون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے　　دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندر واہ کا باشا، باشے کا وہ کھاجا　　سنگ ملے تو سر پر اکھیں واہ کو را درا جا
سی سی کر کے نام بتایا، تا میں بیٹھا ایک　　اولٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال　　عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

دِلّی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں کھم گڑواتی ہیں درخت ہو تو اس میں جھولا ڈلواتی ہیں۔ مِل مِل کر جھولتی ہیں اور گیت گا کر جی خوش کرتی ہیں۔ ان میں شاید کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو۔

جو پیا آون کہہ گئے۔ اجھوں نہ آئے سوامی ہو۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے۔ آون آون کہہ گئے۔ آئے نہ بارہ ماس۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ گیت بھی انہی امیر خسرو کا ہے اور برواراگ میں لے بھی انہی کی رکھی ہوئی ہے۔ واہ کیا زبانیں

تھیں کہ جو کچھ ان سے نکل گیا، عالم کو بھایا۔ گویا زمانے کے دل پر نقش ہو گیا۔ بنانے والے والوں نے ہزاروں گیت بنائے۔ اور گانے والوں نے گائے۔ آج ہوئے کہ بھول گئے چھ سو برس گذر رے۔ یہ آج تک ہیں۔ اور ہر برسات میں ویسا ہی رنگ دیئے جاتے ہیں۔ اس حُسنِ قبول کو خداداد نہ کہیئے تو کیا کہیئے۔

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لئے تو ویسے گیت تھے۔ چھوٹی لڑکیوں کو پیار اور سوامی کی یاد میں اس طرح گانا مناسب نہ تھا۔ لیکن دل میں اُمنگ تو وہ بھی رکھتی تھیں۔ انہیں بھی فصل کی بہار منانی تھی۔ ان کے لئے اور گیت رکھے تھے۔ چنانچہ ایک لڑکی گویا سسرال میں ہے۔ برسات کی رُت آئی۔ وہ جھولتی ہے اور ماں کی یاد میں گاتی ہے۔

اماں میرے باوا کو بھیجو۔ کہ ساون آیا —— یعنی مجھے آ کر لے جائے
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری۔ کہ ساون آیا —— یعنی وہ کیونکر آ سکتا ہے
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری، کہ ساون آیا —— یعنی اس کے لئے تو وہ دونوں عذر نہیں
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری، کہ ساون آیا —— بھلا وہ میری کب سنے گا

ذرا غور کر کے دیکھو۔ باوجود علم و فضل اور اعلیٰ درجہ خیالات شاعرانہ کے جب یہ لوگ پستی کی طرف جھکتے تھے تو ایسے تہہ کو پہنچتے تھے کہ زمین کی ریت تک نکال لاتے تھے۔ ان الفاظ و خیالات پر نظر کرو کیسے نیچر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں کے ارمانوں کو کیا اصلی اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں۔

مکرنیوں کا انہیں موجد کہنا چاہیئے۔

مکرنی۔ سگری رین موہے سنگ جاگا — بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا — اے سکھی ساجن، نا سکھی دیا

مکرنی۔ سرب سلونا سب گن نیکا — وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پہ ہووے کون — اے سکھی ساجن، نا سکھی لون

مکرنی۔ وہ آوے تب شادی ہووے اس بن دوجا اور نہ کوئی
میٹھے لاگے واکے بول اے سکھی ساجن، نا سکھی ڈھول

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ کوئیں پر جا کر ایک سے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک انہیں پہچانتی تھی۔ اس نے اوروں سے کہا کہ دیکھو خسرو یہی ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے۔ جس کے سب گیت گاتے ہیں۔ اور پہیلیاں اور مکرنیاں انمل سنتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر ان میں سے بولی کہ مجھے کھیر کی بات کہہ دے۔ دوسری نے چرخہ کا نام لیا۔ تیسری نے ڈھول۔ چوتھی نے کتے کا۔ انہوں نے کہا کہ مارے پیاس کے دم نکلا جاتا ہے۔ پہلے پانی تو پلا دو۔ وہ بولیں جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا نہ پلائیں گی۔ انہوں نے جھٹ کہا۔

انمل۔ کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا۔ آیا کتا کھا گیا۔ تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا۔

اس طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انہی کی ایجاد ہے۔

ڈھکوسلا۔ بھادو پکی پیپلی۔ چوچو پڑی کپاس۔ بی مہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں۔

دوسخنے

گوشت کیوں نہ کھایا ڈوم کیوں نہ گایا۔ گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا سنبوسہ کیوں نہ کھایا۔ تلا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا وزیر کیوں نہ رکھا۔ دانا نہ تھا

دوسخنے فارسی اردو۔

سوداگر را چہ می باید۔ بوچے کو کیا چاہئے۔ دوکان
تشنہ راچہ می باید۔ ملا کو کیا چاہئے۔ چاہ
شکار بچہ می باید کرد۔ قوت مغز کو کیا چاہئے۔ بادام

موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے بڑی بجتی تھی۔ اس لئے دھریت کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان میں سے اکثر گیت ان کے آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت کے میلہ نے انہی

کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہیں نے نکالا ہے۔

لطیفہ۔ سلطان جی صاحب کے یہاں ایک سیاح فقیر مہمان آئے۔ رات کو دستر خوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ سیاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئی ختم ہی نہ ہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح نہ سمجھے۔ سلطان جی صاحب مہمان کی دلشکنی سمجھ کر کچھ نہ کہہ سکے۔ مجبور بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے۔ مگر بول نہ سکتے تھے کہ آدھی رات کی نوبت بجی۔ اس وقت سلطان جی نے کہا کہ خسرو یہ کیا بجا؟ عرض کی۔ آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا۔ اس میں کیا آواز آتی ہے؟ انہوں نے کہا سمجھ میں تو ایسا آتا ہے۔

نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو۔ خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد۔ خانہ برو خانہ برو۔

حرف حرف کی حرکت و سکون پر خیال کرو۔ ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا کر رہے ہیں اور نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد کو دیکھو اس نے کیا کام کیا۔

نقل۔ ایک دن کسی کوچہ میں سے گذر ہوا۔ دُھنیا ایک دُکان میں روئی دُھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ جس دُھنیے کو دیکھو ایک ہی انداز پر روئی دھنکتا ہے۔ سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں! کوئی بولا کہ قدرتی استاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔ آپ نے کہا کہ سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا لفظوں میں کیونکر لا سکیں؟ فرمایا

در پئے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ رفت۔ رفت۔ جاں ہم رفت + ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ آنہم رفت۔ اینہم رفت۔ اینہم۔ آنہم۔ آنہم۔ رفت + رفتن۔ رفتن۔ رفتن دِہ۔ دِہ دِہ رفتن دِہ۔ رف رف۔ رفتن دِہ۔ رفتن دِہ +

نقل۔ محلّہ کے سرے پر ایک بڑھیا ساقن کی دُکان تھی۔ چھموُ[1] اس کا نام تھا۔ شہر

---

[1] بکسر اول۔ واو مجہول

کے بیہودہ لوگ وہاں بھنگ چرس پیا کرتے تھے۔ جب یہ دربار سے پھر کر آتے یا تفریحاً گھر سے نکلتے۔ تو وہ بھی سلام کرتی۔ کبھی کبھی حقہ بھر کر سامنے لے کھڑی ہوتی۔ یہ بھی اس کی دل شکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے۔ ایک دن اس نے کہا کہ بلالوں، ہزاروں غزلیں، گیت، راگ، راگنی بناتے ہو۔ کتابیں لکھتے ہو۔ کوئی چیز لونڈی کے نام پر بھی بنا دو۔ انہیں نے کہا۔ بی چمو بہت اچھا۔ کئی دن کے بعد اس نے پھر کہا کہ بھٹیاری کے لڑکے کے لئے خالق باری لکھ دی۔ ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دو گے تو کیا ہوگا۔ آپ کے صدقے سے ہمارا نام بھی رہ جائے گا۔ اس کے بار بار کہنے سے ایک دن خیال آ گیا۔ کہا لو بی چمو سنو ~

اوروں کی چو پہری باجے[1] چمو کی اٹھ پہری — یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری — جنگلی گنواروں کا کام نہیں سفید پوش آتے ہیں
صاف صوف کر آگے راکھے جسمیں ناہیں تو سل — پیالہ بھنگ صاف مصفیٰ حاضر کرتی ہے جسمیں تس تنکا نہ ہوا
اوروں کے جہاں سینگ سمادے چمو کے وہاں موسل — بھنگڑ فخر یہ کہا کرتے کہ ہیں کہ وہ ایسی بھنگ

پیتا ہے کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سے سینگ کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے کہ یہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے خیر۔ ان کی بدولت چمو کا بھی نام رہ گیا۔ حق پوچھو تو جس طرح ہر جاندار کی عمر ہے اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے۔ مثلاً شاہنامہ کو ۹ سو برس ہوئے سکندر نامہ کو ۷ سو برس سمجھو۔ گلستاں بوستان کو ۶ سو برس کہو۔ زلیخا کی عمر تقریباً ۳ سو کے ہوئی۔ مگر اب تک سب جوان ہیں۔ اردو میں باغ و بہار بدر منیر وغیرہ جوان ہیں۔ فسانہ عجائب جاں بلب ہو گیا۔ بہت کتابیں اوّل شہرت پاتی ہیں۔ پھر گمنام ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے کہ مر گئے بہتیری تصنیف ہوتی ہیں اور چھپتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے ہیں — بعض کتابوں کی عمریں معیادِ معلوم پر ٹھیری ہوئی ہیں۔ وہ مدارس سرکاری کی تصنیفیں ہیں۔ کیونکہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں تب تک چھپتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔ لوگ پڑھتے ہیں۔ جب تعلیم سے خارج ہو گئیں۔ مر گئیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ع قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است۔ خدا یہ نعمت نصیب کرے۔

---

[1] بادشاہ کے ہاں اس زمانہ میں چو پہری نوبت بجا کرتی تھی۔

غرض اسی جوشِ طبع اور ہنگامہ ایجاد میں ایک تامہ ایجاد اور ہوا۔ جس میں ہمارے لئے تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔

(۱) مضامین عاشقانہ سے وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا جسے غزل کہتے ہیں۔ وہی قافئے یا ردیف اور قافئے دونوں کی پابندی۔ اسی طرح اوّل مطلع یا کئی مطلع پھر چند شعر۔ آخیر میں مقطع اور اس میں تخلص۔

(۲) عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا۔

(۳) فارسی اور بھاشا کو نون مرچ کی طرح اس انداز سے ملایا ہے۔ کہ زبان پر چٹخارا دیتی ہے۔ اس میں یہ بات سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے کہ انہوں نے بنیاد عشق کی عورت ہی کی طرف سے قائم کی تھی جو کہ خاصۂ نظم ہندی کا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس تعشق کا انقلاب کس وقت ہوا۔ غزل مذکور یہ ہے۔

زحال مسکیں مکن تغافل۔ دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں۔ نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں۔ تو کیسی کاٹوں اندھیری رتیاں

یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کوں ہمارے بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرّہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں۔ نہ انگ چیناں۔ آپ اویں۔ نہ بھیجیں پتیاں

بحقِ روزِ وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

ابتدائے ایجاد میں ایسا ہوتا ہے۔ زمانہ مبتدیوں کا اصلاح دینے والا ہے۔ پھر تراشیں دے کر اعلیٰ درجہ خوبی و خوش اسلوبی پر پہنچا لیتا ہے۔ مگر اس وقت اس طرف کسی اور نے ایسی توجہ نہ کی کہ جس سے اس طرز کا رواج جاری ہو جاتا۔

☆☆

’’حضرت امیر خسروؔ کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں۔ لیکن خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہیں۔ جہاں تک اس میں مذکور ہیں میں نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ امیر صاحب کی دیگر تصانیف سے بھی ان کے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ موقع بموقع ان کے حوالے دیے جائیں گے۔ ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لندن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں حضرت امیر خسرو کی تصنیفات سے ان کے حالات مرتب کئے ہیں کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہے۔‘‘

(شبلی نعمانی)

حیات خسرو

مولانا شبلی نعمانی

○ ولادت و تعلیم

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے۔ حضرت امیر خسرو اسی قبیلے کے ہیں۔ ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے۔ ترکستان میں ایک شہر کش ہے۔ وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا کہ بلخ کے امرا میں سے تھے چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوئے [1] محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا۔ ایک مہم میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے۔

لیکن صاحب بہارستان سخن۔ تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں۔

> "پس انچہ دولت شاہ در تذکرہ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسروؒ در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را در حق دے قصائد غرا است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شہزادہ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بسعلت اشتراک اسمی محمد تغلق خیال کردہ۔"

---

[1] امیر خسرو سے متعلق تمام تذکروں میں سیف الدین محمود کا سلطان شمس الدین التمش کے دور میں آنا مذکور ہے۔ محمود بن تغلق کے دور میں آنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے تغلق دور حکومت میں فتنہ منگول کم و بیش دب چکا تھا۔ صاحب بہارستان سخن کی روایت بھی غلط ہے۔ امیر خسرو، شہزادہ محمد شہید کے مصاحب تھے۔ ان کی موت پر ان کا مرثیہ موجود ہے۔

بہر حال سیف الدین کے تین بیٹے تھے۔ اعز الدین[1]۔ حسام الدین[2]۔ اور امیر خسرو[3]۔ سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر صاحب کی عمر[1] ۷ برس کی تھی۔ امیر صاحب کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھی جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اور دس ہزار فوج کے افسر تھے۔ امیر صاحب ۶۰۵ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے۔ قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا۔ مجذوب صاحب کے کمالات کا ہم انکار نہیں کرتے۔ لیکن ان کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے۔ خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت؟

جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا۔ لیکن امیر صاحب کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دُھن رہتی تھی۔ جو کچھ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اسی کی مشق کرتے تھے۔ خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے۔ وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کو بلا لیا کرتے تھے۔ ایک دن بلایا تو امیر بھی ساتھ گئے۔ خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ غوں غاں کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے کہ نہیں؟ آپ ذرا اس کے کلام کو سُن لیجئے۔ خواجہ عزیز[3] کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ امیر صاحب کو دی کہ کوئی شعر پڑھو۔ امیر صاحب نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ چونکہ آواز میں قدرتی

---

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی اماں حاملہ آئی تھیں۔ خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح نہیں ہے، تمام واقعات تاریخی سے یہ ثابت ہے کہ خسرو ہندوستانی ہیں۔ لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا۔ اب ایٹہ ہے کسی زمانہ میں دریائے گنگ اس کے نیچے بہتا تھا۔ لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے۔ یہاں اب اسٹیشن بھی ہے ۱۲

[3] ڈاکٹر وحید مرزا نے خواجہ عزیز الدین لکھا ہے

تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا۔ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور سب نے بے اختیار تحسین کی۔ ان کے استاد نے کہا۔ شعر گوئی میں امتحان لیجئے۔ خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو۔ مو۔ بیضہ۔ تیر۔ خر پزہ۔ امیر صاحب نے برجستہ کہا۔

ہر موئے کہ دردوزلفِ آن صنم است
صد بیضۂ عنبریں برآن موے صنم است
چوں تیر مداں راست دِش راز برا
چوں خر پزہ دندانش درونِ شکم است

خواجہ عزیز الدین کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا خسرو۔ باپ کا نام پوچھا انہوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا یعنی لاچین۔ خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی ''چین نہیں'' پھر کہا ''ترک خطاست'' یعنی ان کو ترک کہنا خطا ہے؟ انہوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا ''بے خطا ترک است'' یعنی قطعاً وہ ترک ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے اس لئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہیے۔ چنانچہ تحفۃ[۲] الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔

امیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی۔ لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵ یا ۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم وفنون سے فارغ ہو چکے تھے۔

درباری تعلقات

امیر خسرو صاحب سن رشد کو پہنچے تو دلّی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا۔ اس کے امرائے دربار میں سے کشلو خاں معروف بے چھجو[۳] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا۔ وہ سلطان کا بھتیجا اور باربکی کے عہدے

---

۱ جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔ ۱۲

۲ یہ تمام حالات اپنے امیر صاحب نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں ۱۲

۳ چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا (بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

پر مامور تھا۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ اور مصر۔ روم۔ بغداد۔ عراق۔ خراسان۔ ترکستان۔ وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربا میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا۔ یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

امیر صاحب کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ سب سے پہلے اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے۔ چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں۔

بود نہاں آفتاب آں دم کہ صبح　　　　ہمدمی باباد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است　　　　آسماں روئے ملک چھجو نمود

میر صاحب نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے۔

زشاہاں کسے کا ولم کرد یاد　　　　معز الدنا بودشہ کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا۔ کشلو خاں امرائیں سے تھا۔ بادشاہ نہ تھا بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر صاحب کی قدردانی کی وہ معز الدین کیقباد تھا۔ امیر صاحب اکثر کشلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لے جاتے اور مجلس گرم کرتے تھے۔

(بقیہ پچھلے صفحہ ۴۸ کا) ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں۔ امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خان عرف چھجو کے دربار میں پہنچا۔ اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں بدایونی صفحہ ۱۵۸ جلد اوّل میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ (سامانا) کا حاکم مقرر رہا تھا۔ اور سلطان معز الدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمدؒ بن اعز الدین سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا۔ سلطان نے اس کو باربک مقرر کر کے خان اعظم کوکشلی خاں کا خطاب دیا۔ بدایونی (۱۶۴) میں ملک چھجو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر، لکھا ہے کہ اس کو کشلو خاں خطاب ملا تھا۔ ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین۔ کشلو خاں چھجو ایک ہی شخص ہیں۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے۔ شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے۔ امیر صاحب نے اپنی زمزمہ سنجی سے وہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپے دیے۔ کتلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستۂ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے۔ چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوئے۔ امیر صاحب نے اس کے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی لیکن کتلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی۔

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا۔ امیر صاحب نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا۔ بغرا ان نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم[۱] خاص بنایا۔ اسی زمانہ یعنی ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔ بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ[۲] کیا۔ امیر صاحب بھی اس سفر میں[۳] ساتھ گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دہلی واپس آیا اور بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی۔ امیر صاحب کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا۔ دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے۔ لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ رخصت لے کر دلی میں آئے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قا آن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا۔ وہ نہایت قابل، صاحب علم۔ فیاض اور قدر دان علم و فن تھا۔ تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گزر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ۔ دیوان خاقانی۔ انوری۔ خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بیاض جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کئے تھے۔

---

[۱] یہ تمام حالات خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ [۲] تاریخ فرشتہ ۱۲۔

[۳] امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے۔ ایک اور دقت سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ بہت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے۔ ۱۲۔

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے ''ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر صاحب اور (خواجہ) حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے۔ یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی۔ امیر علی کے بعد امیر صاحب کے ہاتھ آئی۔ ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے[1]۔''

امیر صاحب کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا۔ سلطان محمد نے ان کو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا۔ اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو گیا تو ان کو اور ان کے ساتھ خواجہ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے۔ اس زمانے میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خاں ایران کا حکمراں تھا۔ اس کے امرائیں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لے کر لاہور اور دیبال پور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا۔ سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکل کر تیمور خاں کو شکست دی لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ ایک تالاب کے کنارے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا۔ موقع پا کر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا۔ سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا۔ اور گو بار بار ان کو شکستیں دیں۔ لیکن اتفاق سے ایک تیر آ کر لگا اور زخم کھا کر مر گیا[2]۔

امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے۔ چنانچہ تاتاری ان کو گرفتار کر کے بلخ لے گئے۔ یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا۔ امیر صاحب نے نہایت پُر اثر مرثیے لکھے اور دلی بھیجے۔ مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے[3]۔ چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید	آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ زا	رخنۂ کا سال در ہندوستاں آمد پدید
مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد	برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو	پنج ابے دیگر اندر مولتاں آمد پدید
جمع شد سیارہ در چشم مگر طوفاں شود	چوں بے برج آبی انجم را قراں آمد پدید

[1] تاریخ فرشتہ۔ [2] ایضاً [3] بدایونی صفحہ ۱۳۱

من نخواہم جز ہماں جمعیت وایں کے شود — خود محال ست ایں نبات النعش یردیں کے شود
تا چہ ساعت بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید — تیغ کافرکش برائے کشتن کافر کشید
انچہ حاضر بود لشکر، لشکر دیگر نہ جست — زانکہ رستم را نشاید منتِ لشکر کشید
چوں خبر کردندش از دشمن بداں قوت کہ داشت — بے محابا چشم در سر کرد ورایت برکشید
یک کشش از مولتانش تا بہ لاہور اوفتاد — یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید
آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خونِ شاں — کز زمیں باید شفق گونہ احمر کشید
او دریں تدبیر وآگہ نے کہ تدبیر فلک — صفحۂ تدبیر راخطِ مشیت درکشید

تاچہ ساعت بُد کہ کافر بر سرِ لشکر کشید
میگذشتند جوق جوق از آب وناگہ درکشید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے۔ اخیر کے بعد، جہاں شاہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُر اثر ہیں۔

دو برس کے بعد امیر صاحب نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی اور دلّی میں آئے۔ خانؔ شہید کے مرنے پر جو نوحہ لکھا تھا، غیاث الدین بلبن کے دربار میں جا کر پڑھا۔ دربار میں کہرام پڑ گیا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ سلطانؔ اس قدر رویا کہ بخار آ گیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا۔

امیر دلّی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے سنہ ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلاف وصیت اس کے پوتے کیقباد نے امیر صاحب کو دربار میں طلب کیا۔ لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ امیر صاحب سے صاف نہ تھا۔ امیر صاحب نے تعلق پسند نہ کیا اور خانِ جہاں جو امرائے شاہی میں تھا، اس کی ملازمت اختیار کی۔

خانِ جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر صاحب کو ساتھ لے گیا۔ چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں۔

خان جہاں حاتم مفلس نواز — گشت باقطاع اودھ سرفراز
من کہ بُدم چاکر او پیش ازاں — کرد کرم انچہ کہ بدبیش ازاں

تا چناں بخشش خاطر فریب — بندہ شدہ لازمۂ آں رکیب
درا دوم بردہ زلطف چناں — کیست کہ از لطف بتابد عناں
در اودھ از بخشش اوتا دو سال — ہیچ غم و نالہ بنود ازمنال

دو برس تک اودھ میں رہے۔ ان کی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی۔ وہ دلّی میں تھیں اور ان کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ امیر صاحب کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلّی میں آئے۔ ماں نے گلے سے لگایا، اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے۔

مادرم آں خستۂ تیمار من — چوں نظر افگند بہ دیدار من
پردہ زروے شفقت برگرفت — اشک فشاں ناں بہ درم درگرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی۔ اس کا باپ بغرا خاں بنگال میں تھا۔ یہ حالت سن کر بنگال سے روانہ ہوا۔ کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کر کے دلّی سے روانہ ہوا۔ راہ میں نامہ و پیام ہوتے رہے۔ آخر صلح پر خاتمہ ہوا اور کیقباد دلّی کو واپس گیا۔

امیر صاحب نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد — زہے عہدِ خوش چوں دو پیماں یکے شد
پسر بادشاہ، پدر نیز سلطاں — کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد
زبہر جہانداری وبادشاہی — جہاں را دو شاہِ جہانباں یکے شد
یکے ناصرِ عہد، محمود سلطاں — کہ فرمانش در چار ارکاں یکے شد
دگر شہ معز جہاں کیقبادے — کہ در ضبطش ایران وتوراں یکے شد

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں۔ امیر صاحب کو بلا کر یہ خواہش ظاہر کی[1]۔ چنانچہ امیر صاحب نے چھ مہینے کی مدّت میں قران السعدین لکھی۔ جس

---

[1] بدایونی

میں باپ بیٹے کی مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس وقت امیر صاحب کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور ۶۸۸ھ تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

ساختہ گشت از روشِ خامہ ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ازپس شش ماہ چنیں نامہ
در رمضاں شد بسعادت تمام ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ یافت قراں نامۂ سعدین نام
انچہ بتارخ زہجرت گذشت ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ بود سن شش صدو ہشتاد وہشت
سال من امروز اگر بررسی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ راست بگویم ہمہ شش بودوسی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مر گیا یا مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا خردسال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا۔ وہ بالکل بچہ تھا۔ تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اُتار کر قید کر دیا۔ اب خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا۔ اس لئے ترکی امرائے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا۔ تخت سلطنت پر بیٹھا اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ بڑے عظمت واقتدار وجاہ وجلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے ساتھ نہایت صاحب مذاق۔ رنگین طبع، خوش صحبت تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کیے ہیں۔

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ وان روے چوگلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکم ‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ہاں بانگ بلندست ایں پوشیدہ نمی خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے۔ سب قابل۔ اہل فن، موزوں طبع اور رنگین مزاج تھے۔ مثلاً ملک تاج الدین کرجی۔ ملک فخر الدین، ملک اعز الدین، ملک فرابیگ، ملک نصرت، ملک حبیب، ملک کمال الدین، ابوالمعالی، ملک نصیر الدین، کمرانی، ملک سعد الدین انیس اور ہم صحبت تھے۔

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہلِ کمال ندیمی کے لئے انتخاب کیے تھے۔ چنانچہ تاج الدین عراقی۔ خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر، ارسلاں، اختیار الدین باقی ندمائے خاص میں تھے۔ ساقی، مغنی، اور مطرب بھی وہ لوگ تھے۔ مثلاً امیر حاصہ، حمید،

راجہ، نظام، محمد شاہ، نصیر خاں، بہروز[1]۔

ایسے گونا گوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر سے زیادہ کون موزوں ہوسکتا تھا وہ عالم بھی تھے۔ فاضل بھی مغنی بھی مطرب بھی اور شاعر تو تھے ہی۔ معزالدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا۔ اُسی وقت اُس نے امیر صاحب کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کر کے خاص اپنا لباس عنایت کیا تھا۔ تخت پر بیٹھا تو امیر صاحب کو ندیم خاص بنایا اور مصحف[2] داری اور امارت کا عہدہ دیا اس کے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا ان کے لئے مقرر کیا۔ امیر صاحب امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے۔

امیر نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے۔ اور تاج الفتوح نام رکھا۔ اس کی تفصیلی کیفیت آگے آئے گی۔ جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت سلطان حاصل کیا تھا اور اگرچہ بخت ولی اور سفا کی اس کی طینت کا جوہر تھا۔ تاہم بہت بڑے عزم استقلال۔ شوکت وشان کا فرماں روا گذرا ہے تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ اس کا دربار فقرا علماء فضلاء شعرا سے ہروقت معمور رہتا تھا۔ ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں۔[3]

قاضی فخرالدین ناقلہ، قاضی فخرالدین کرمانی، مولانا نصیرالدین، غنی مولانا تاج الدین مقدم، قاضی ضیاء الدین، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی زمین الدین ناقلہ، مولانا شرکتی، مولانا نصیر الدین رازی، مولانا علاء الدین، صدر شریف، مولانا میراں بابک کلہ، مولانا نجیب الدین بیانوی، مولانا شمش الدین بخشی، مولانا شمس الدین، مولانا صدرالدین پادہ، ملونا معین الدین لولوی، مولانا افتخار الدین رازی، مولانا معیز الدین اندرپتی، مولانا نجم الدین، مولانا حمید الدین بلوری، مولانا علاء الدین کرک، مولانا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی، مولانا کمال الدین کولوی۔ مولانا وجیہ الدین کابلی، مولانا منہاج الدین، مولانا نظام الدین کلاتی، مولانا نصیرالدین کری، مولانا نصیرالدین بوبی،

---

1 تاریخ فرشتہ۔ 2 جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اس کو مصحف دار کہتے تھے
3 یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے

مولانا علاء الدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری، مولانا محبت ملتانی، مولانا حمید الدین، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخار الدین، مولانا حمید الدین ملتانی، مولانا گل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرخنہ، مولانا شہاب الدین ملتانی، مولانا فخر الدین نسوی، مولانا فخر الدین شقاقلی، مولانا علیم الدین۔

قرا:- مولانا نشاطی، مولانا علاء الدین سنجری، خواجہ زکی۔

واعظین:-مولانا حسام الدین درویش، مولانا شہاب الدین، مولانا کریم۔

شعرا:-خواجہ حسن دہلوی، صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ، مولانا عبدالحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر صاحب کے آفتاب کمال نے ان ستاروں کو بے نور کردیا تھا۔

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر صاحب کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ان کے بعد اگر کسی کے خط وخال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں، وہ بھی امیر صاحب ہی کا فیض ہے۔علاء الدین نے امیر صاحب کا ایک ہزار سالانہ ٹنکہ[1] مقرر کیا تھا۔امیر صاحب نے سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا۔جس کا نام خزائن الفتوح ہے۔تفصیل آگے آئے گی۔

۶۹۸ھ میں امیر صاحب کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا۔ لیلیٰ مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے۔نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا۔چنانچہ ہر کتاب سلطان علاء الدین اولیا (محبوب الٰہی) کے ہاتھ پر بیعت کی۔تفصیل آگے آئے گی۔سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات پائی۔اس کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین (مدت حکومت ۳ ماہ) اور اس کے بعد ۷۱۷ میں قطب الدین مبارک بن علاء الدین خلجی بادشاہ ہوا۔وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز اور سبک سر تھا۔لیکن امیر صاحب کی قدردانی سب سے بڑھ کر کی۔چنانچہ امیر صاحب نے جب ۷۱۸ھ میں اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپے دیے خود امیر صاحب قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں۔

---

[1] تاریخ فرشتہ۔غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا۔

بتاریخ ہمچوں من بے شمار — دہم بار بخشش نہ آں پیلبار
مراخود دریں رہ پدر شد دلیل — کہ میداو زر، ہم ترازوے پیل
شناسد کسے کش خرد رہنموں — کہ از پیلبارست وزنش فزوں
چو میراث شد پیل زر داد نم — نہ زیباست زیں سہل تر دادنم
شہا! گنج بخشا! کرم گسترا — معانی شناسا سخن داد را
چنیں بخششے کز تو جم یافتم — در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لابداز سحر سنج چو من — بہ اندازۂ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دے کر قلمدان وزارت عطا کیا تھا۔ اُس نے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کر کے خود تخت حکومت پر جلوس کیا۔ چونکہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کیئے۔ امراء نے بغاوت کی۔ چنانچہ چار مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۱ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی۔ دربار میں پکار کر کہا کہ مجھ کو تخت سلطنت کی آرزو نہیں۔ خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا۔ اس لئے سب نے بہ اتفاق اسی کو بادشاہ بنایا۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے نہایت عدل وانصاف سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔ تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے۔ امیر صاحب کی اس نے نہایت قدر دانی کی اور ان کو مال ودولت سے نہال کر دیا۔ امیر صاحب نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا۔ چنانچہ اس کے نام پر تغلق نامہ لکھا جو تغلق کے عہدِ حکومت کی مفصل تاریخ ہے۔

وفات، اعزہ واولاد

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر صاحب ساتھ گئے۔ تغلق واپس آیا۔ لیکن امیر صاحب وہیں رہ گئے۔ اسی اثناء میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے

انتقال کیا۔ امیر صاحب یلغار کرتے ہوئے دلّی میں آئے اور جو کچھ زر و مال پاس تھا خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر دیا۔ ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے۔ چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۲۵ۓ ھ میں انتقال کیا۔ خواجہ صاحب نے وصیّت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا۔ لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنی چاہی۔ لیکن ایک خواجہ سرا نے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا۔ غرض خواجہ صاحب کی پائنتی دفن کیا۔ اور اس سے بڑھ کر ان کی کیا خوش قسمتی ہوسکتی تھی۔ ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امراء میں سے تھا، تعمیر کرایا اور ملک شہاب معمائی نے تاریخ لکھ کر لوح پر کندہ کرائی۔

شد عدیم المثل یک تاریخ او　　　　واں دگر شد طوطی شکر مقال

امیر صاحب کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی۔ ان کے ایک صاحبزادے کا نام ملک احمد ہے۔ وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے۔ ان کی شاعری نے چنداں فروغ نہیں حاصل کیا۔ لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہلِ فن اس کو تسلیم کرتے تھے۔ ظہیر کا شعر ہے۔

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاد　　　　ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب چست ہوگئی۔ بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے۔

ایں سہل سہل بود کہ گو گردسرخ خواست　　　　گرنان خواجہ خواستی آل راچہ کردے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی۔

ایں سہل سہل بود کہ آب حیات خواست　　　　گرنان خواجہ خواستی اں راچہ کردے

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا۔ ایک اور شعر تھا۔

گر مشک خواند خاک در ست رافلک مرنج　　　　نرخ گہر بہ طعن خریدار نشکند

ملک موصوف نے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا۔

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر صاحب کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے۔ بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اس لئے بادشاہ اور درباری اس کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے۔

امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا۔ جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں۔

اے زعفت فگندہ برقع نور	ہم عفیفہ بنام دہم مستور
کاش ماہ تو ہم بہ چہ بودے	دررحم طفل ہشت مہ بودے
لیکن چون دادۂ خدائے رواست	با خداداد گاں ستیزہ خطاست
من پذیرفتم انچہ یزداں داد	کانچہ او داد بازنتواں داد
پدرم ہم زما در است اصلحہ	مادرم نیز دختراست آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم پیدا نہ ہوتیں۔ یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلّی دی ہے کہ خدا کے دیئے کو کون ٹال سکتا ہے۔ اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا۔ اور میری ماں بھی تو آخر عورت تھی۔

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی حالت بہت پست تھی۔ امیر صاحب اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے لیکن بیٹی سے کہتے تھے کہ خبردار چرخہ کا تانہ چھوڑنا، اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر نہ جھانکنا۔

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است	کالتِ پردہ پوشی بدن است
پابد امان عاقبت سرکن	رُو بدیوار و پشت بردرکن
درتماشائے روزنت ہوس است	روزنِ چشم سوزن تو بس است

امیر صاحب کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ بڑی عمر کو بھی پہونچ کر وہ اس جوش محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں۔ اور وہ

کی معقول ملازمت صرف اس بنار پر چھوڑ دی کی ماں دلّی میں تھیں اوران کو یاد کیا کرتی تھیں۔ اودھ سے جب دلّی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے۔

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے۔ چنانچہ دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں ۶۹۸ھ میں انہوں نے انتقال کیا۔ اسی سال ان کے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا۔ لیلیٰ مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے۔

امسال دو نور از اخترم رفت — ہم مادر وہم برادرم رفت
یک ہفتہ زنجت خفتۂ من — گم شد دومہ دو ہفتۂ من
بخت ازدو شکنجہ داد پیچم — چرخ ازدو طمانچہ کرد ہیچم
ماتم دوشد وغمم دو افتاد — فریاد کہ ماتم دو اُفتاد
حیف است دوداغ چوں منے را — یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دوبار برنگیرد — یک سرد وخمار برنگیرد
چوں مادرِ من بزیرِ خاک است — گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادرِ من کجائی آخر — روے ازچہ نمی نمائی آخر
خنداں زدلِ زمین بروں آئے — برگریہ وزاریم ببخشائے
ہرجا کہ زپائے تو غباریست — ماراز بہشت یاد گاریست
ذات تو کہ حفظِ جان من بود — پشت من وپشتبان من بود
روزے کہ لب تو درسخن بود — پندِ توصلاح کارمن بود
امروز منم بہ مہر پیوند — خاموشی تو ہمی دہد پند

فقر وتصوّف

اڑتالیس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے۔ اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خونِ جگر سے رنگین ہیں۔

امیر صاحب اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے۔ لیکن یہ امر ان کی اصل فطرت کے خلاف تھا۔ درباداری، خوشامد اور شخص پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی، اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں ٦٩٠ھ میں لکھی تھی۔ جب ان کو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

شب تا سحروز صبح تا شام	درگوشۂ غم نگیرم آرام
باشم زبرائے نفس خودرائے	پیش چوخودستادہ برپائے

اس پر مزید یہ ہوا کہ ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لئے بیعت کرادی تھی۔ حضرت خواجہ کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی۔ امیر صاحب کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا۔ وہ سرتاپا عشق تھے، اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی۔ آخر یہ نوبت پہونچی کہ ۷۱۳ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوئد میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی۔ اور مریدانِ خاص میں داخل کیا۔ قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹادیا اور پابدامن ہو کے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب سے امیر صاحب کی ارادت اور عقیدت، عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی۔ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کردوں گا۔ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے۔ الٰہی! بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب لبِ دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر۔ ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو صاحب بھی حاضر تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو!

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کر کے برجستہ کہا ؎

ماقبلہ راست کردیم برطرف کجکلا ہے

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوّال یہ شعر گا رہے تھے۔ میں نے ان کا شانِ نزول پوچھا۔ ملا علی احمد مہر کن نے واقعہ بیان کیا۔ مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ غش کھا کر گرے دیکھا تو دم نہ تھا۔[1]

خواجہ صاحب نے امیر صاحب کو تُرک اللہ کا خطاب دیا تھا۔ اور اسی لقب سے پکارتے تھے۔ امیر صاحب نے جابجا اس پر فخر کیا ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں۔

برزبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت　　　دست ترک اللہ گیر وہم بہ اللّٰہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا۔

امیر صاحب نے تصوّف میں جو مدارج حاصل کیے ان کو نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر صاحب کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے وہ اسی وادیِ ایمن کی شرر باریاں ہیں۔

امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں۔ حسن نہایت صاحبِ جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر صاحب کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گزرے۔ آفتاب حسن کی شعاعیں ان پر بھی پڑیں۔ وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو! حسن نے کہا کہ ایک پلڑے پر روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے میں سونا رکھے۔ سونے کا پلّہ

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۸۱۔ مطبوعہ علی گڑھ

جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کردیتا ہوں۔امیر نے کہااور خریدار مفلس ہو؟حسن نے کہاتو سونے کے بدلے درد اور نیاز لیتا ہوں۔اس انداز گفتگو نے امیر صاحب کواور بھی بے اختیار کردیا۔فوراً حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔حسن نے گوناوک اندازی کی تھی لیکن خود بھی شکار ہو گئے۔اسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہونچے،اوراپنے دل دادہ (امیر خسرو) سے ملے۔اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے[1]

امیر صاحب سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے۔امیر صاحب نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے۔چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو امیر صاحب کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی۔امیر صاحب نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی۔

زیں دلِ خود کام کار من بہ رسوائی کشید　　　خسروا فرانِ دل بردن ہمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر صاحب کے ملنے سے منع کردیا۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے۔حسن سیدھے امیر صاحب کے پاس گئے۔خان شہید کو اسی وقت پرچہ لکھا۔نہایت متحیر ہوا،اور امیر صاحب کو بلوا بھیجا۔آئے تو کہا کیا حالت ہے؟امیر نے آستین سے ہاتھ نکال کر دکھایا اور کہا۔

گواہِ عاشق صادق در آستیں باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں امیر صاحب کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے[2]

---

[1] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے۔لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے "بقیاس چناں درمی آید کہ حسن۔بہ نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد۔چہ میر حسن رادر مدح سلطان غیاث الدین بلبلن قصائد غراست و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے میتواں یافت۔"

[2] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں۔لیکن آخیر کا واقعہ آجکل کون تسلیم کرے گا۔

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے۔ اور صنف غزل پر ان کا خاص احسان ہے۔ اس لئے ان کے شیدائی۔ امیر صاحب ہی کے تذکرہ میں ان کے اشعار نقل کرتے ہیں۔

خلق گویند، دل از صبر، بجا آور باز ایدل، از صبر نشانے وہ اگر جائے ہست
اے کہ نظارۂ دیوانہ نہ گردی ہرگز قدمے رنجہ کن، ایں سوئے کہ رسوائے ہست

بر چون تو، کسے دگر گزیدن کارے دگرست، کار من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من ایں از فلک است، از حسن نیست

باز ایں دلم بسوے دلارام میرود از دام جستہ، باز سوئے دام میرود
ایام در نیامدہ بابا بدوستی واں شوخ ہم بہ سیرت ایام میرود

اے خواجہ! در محلہ تقویٰ قیام گیر درکوے عاشقی نتواں نیکنام شد
عقلم کہ زیں براُبلق ایام می نہاد آخر بتازیانۂ عشقِ تو رام شد

طرفہ سرو کارے است کہ باوعدہ معشوق صابر نتواں بود وتقاضا نتواں کرد

از حسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست ایں سخن را چہ جواب است توم میدانی
دوسہ بار، باتو گفتم کہ مراہیچ بستاں نہ شد اتفاق، شاید کہ بہ ایں بہا گرانم

تلخ کردم جہانیاں راخواب زاں دعاہا کہ مستجاب نبود
اے حسن یار گر خطائے کرد ہم شکایت ازو۔ صواب نبود

بہ تقویٰ نام نیکو بردہ بودم نکو رویاں، مرا بدنام کردند

گفتی کہ چرا حال دل خویش نگوئی من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند؟

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جو سوز و گداز۔ اور جذبہ و اثر ان کے کلام میں موجود ہے۔ ان کے کشتۂ محبت (امیر صاحب) میں بھی نہیں۔

جامعیت کمالات

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گونا گوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسیؔ، سعدیؔ، انوریؔ، عرفیؔ، نظیریؔ بے شبہ اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں۔ لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی، فردوسیؔ مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدیؔ قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوریؔ مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفیؔ، نظیریؔ غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی نظمیں، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسیؔ کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائبؔ نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہے ہیں۔ لیکن امیرؔ صاحب کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے کم ہے لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر صاحب کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاشا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرتؔ کے ماہر ہیں۔ چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

من قدرے برسر ایں کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اُس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور

قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انہوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی، اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بے کار کیا۔ لیکن ان کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کرسکا۔ چنانچہ اس کی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہے۔

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سواد نیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا۔

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا، تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی۔ کام جو سپرد تھا، وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اشغال تھے۔ لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

مسکین من مستمند مدہوش ۔۔۔ از سوختگی چو دیگ پُر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام ۔۔۔ در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رائے ۔۔۔ پیش چو خودے ستارہ بر پائے

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودّب کھڑا رہتا ہوں۔

تا خون نہ رود ز پائے تا سر ۔۔۔ دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پانوں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا۔ کھانا کھانے کو نہیں ملتا

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چندا ناموزوں نہ ہوگا۔

کمالِ موسیقی

امیر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا۔ ان کے زمانہ کا

مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد نایک گوپال تھا۔ اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح اٹھا کر لے چلتے تھے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا۔ امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں۔ نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کی جائے۔ نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا۔ ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا۔ ان سے گانے کی فرمائش کی۔ امیر صاحب نے کہا مغل ہوں۔ ہندوستانی گانا یوں ہی سا جانتا ہوں۔ پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

گوپال نے گانا شروع کیا۔ امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدّت ہوئی میں باندھ چکا ہوں۔ پھر خود اس کو ادا کیا۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا۔ امیر صاحب نے اُس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں۔ غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا تھا امیر صاحب اس کو اپنا ایجاد ثابت کر جاتے تھے۔ بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے۔ اب میں اپنے خاص ایجادات سنتا تا ہوں۔ پھر جو گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا۔[۱]

امیر صاحب چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دے کر ایک نیا علم پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان کے ایجاد کردہ راگ حسبِ ذیل ہیں۔[۲]

---

[۱] عالمگیری علما میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خاں تھا۔ ایک مشہور امیر تھا۔ ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے (گفتگوے طوطی از آئینہ خیز دعلی + گرنباشد سیف خاں مار النفس در کار نیست) وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل تھی فقیر اللہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بہت سے فوائد اضافہ کئے اور اس کا نام راگ درپن رکھا۔ چنانچہ مآثر الامراء جلد دوم ص ۴۰۹ مطبوعہ کلکتہ میں تفصیل مذکور ہے۔ اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے۔ گوپال کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی نسخہ سے لئے ہیں۔

[۲] راگ درپن کے وہ نسخے جو میرے استعمال میں ہیں دونوں غلط ہیں اس لئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے۔ اس لئے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے۔

نام راگھائے مخترعہ امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہے
بھیروی	غارہ اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے
سازگری	پوربی، گورا، کنگلی، ایک فارسی راگ قران السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں

زمزمۂ سازگری در عراق ۔۔۔ کردہ بہ گلبانگِ عراق اتفاق

ایمن	ہنڈول اور نیریز
عشاق	سارنگ اور بسنت اور نوا
موافق	توڑی و مالری و دوگاہ و حسینی
غنم	پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے
زیلف	کھٹ راگ میں سہ تار کو ملایا ہے
فرغنہ	کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے
سرپردہ	سارنگ، پلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے
باخرر	ویسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے
فردوست (یا) پھر دوست	کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرر، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے۔ باقی راگوں میں کچھ یوں ادل بدل کر کے دوسرا نام رکھ دیا ہے۔ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ۔ یہ سب بھی امیر صاحب کی ایجاد ہیں۔ ان میں سے بعض خاص ان کی ایجاد ہیں۔ بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے۔ امیر صاحب نے ان میں کچھ تصرف کر کے نام بدل دیا۔

تصانیف

جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ امیر صاحب نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ

لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔

امیر صاحب کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ خالی نہیں۔ چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے۔ اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے۔ اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴۔۵ لاکھ سطریں ہوں تو چنداں تعجب نہیں۔ لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھ دیا۔ ہندی کلام مدون نہیں ہوا۔ اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے۔ بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں۔ اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ دیوان تحفۃ الصغر[۱]	اس کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔
۲۔ دیوان وسط الحیات	اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۳ برس تک کا کلام ہے۔ اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید کتلو خاں وغیرہ کی مدح میں ہے۔
۳۔ غرۃ الکمال	یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا۔ ۲۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے۔ دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے۔ سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں۔ دو ہفتہ میں اس کی ترتیب دی اور دیباچہ لکھا۔
۴۔ بقیہ بقیہ	بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں۔ لیکن سلطان

---

[۱] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اور دو دیوانوں کے دیباچہ بھی نظر سے گذرے ہیں۔ لیکن اس وقت سامنے نہیں۔ اس لئے ان کی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر۔ آئی۔ ای۔ وی) کے اس ریویو سے ماخوذ ہے جو انہوں نے برٹش میوزیم کے کتب خانے کی فہرست میں لکھے ہیں۔ اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر پروفیسر پونہ کالج کا ممنون ہوں۔

علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اس لئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے۔

۵۔ نہایۃ الکمال	پانچواں دیوان ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اس کے ولیعہد کی مدحیں ہیں۔ ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن میں جناب امیر خسرو نے انتقال کیا ہے۔
۶۔ قران السعدین	سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جبکہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی۔ کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے۔
۷۔ مطلع الانوار	مخزن الاسرار کا جواب ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی۔ ۳۳۱۰ شعر ہیں۔ دو ہفتہ میں تمام ہوئی۔ سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔
۸۔ شیریں خسرو	رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی۔ ۴۱۱۴ شعر ہیں سکندر نامہ کا جواب ہے۔ سال اختتام ۶۹۹ھ ہے۔ اشعار کی تعداد ۴۴۵۰۔
۹۔ لیلیٰ مجنوں	۲۶۶۰ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی
۱۰۔ ہشت بہشت	سلسلۂ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے۔ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں۔ پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے۔ کُل ۱۸ ہزار شعر ہیں۔ خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں۔ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں۔
۱۱۔ تاج الفتوح	سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اوّل یعنی ۶۸۹ھ سے جمادالآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں۔

اوراسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی۔ مطلع یہ ہے

سخن بر نام شاہے کردم آغاز

۱۲۔نہ سپہر	قطب الدین خلجی کے نام پر ہے۔نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے اس مناسبت سے نو سپہر نام رکھا ہے۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی ۔۷۱۸ھ میں تمام ہوئی۔
۱۳۔دول رانی وخضر خاں	دول رانی، گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی۔ خضر خاں سلطان علاءالدین کا بیٹا تھا۔وہ دیول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی۔ خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے۔اس کی فرمائش سے امیر صاحب نے اس کو نظم کا لباس پہنایا اور عشقیہ نام رکھا۔ چار مہینے میں تمام ہوئی۔ ۴۲۰۰ شعر تھے۔ خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے۔ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا۔۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔
۱۴۔افضل الفوائد	خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں
۱۵۔اعجاز خسروی	نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں۔ ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی۔ تین جلدوں میں ہے۔
۱۶۔تغلق نامہ	غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں۔
۱۷۔خزائن الفتوح	سلطان علاءالدین کی فتوحات ہیں۔
۱۸۔مناقب ہند	تاریخ ہند

ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں۔

شاعری

امیر صاحب اگرچہ ہندی نژاد تھے۔ لیکن ایرانی شعرا کو بھی ان کی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ طوطی ہند جواُن کا خطاب تھا۔ ایرانی بھی اسی خطاب سے اُن کو یاد کرتے ہیں۔

عرفی

بروحِ خسرو ازیں پارسی شکر دادم ۔۔۔ کہ کامِ طوطیِ ہندوستاں شود شیریں

خواجہ حافظ

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند ۔۔۔ زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دہلی میں آئے۔ اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں۔ اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحتہً اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔ تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا۔ اور اس قدر تو تمام تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بُلایا تو انہوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں ان کی تربیت کی جائے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ برس سے زائد نہ تھی۔

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے۔ عبید ایک شاعر جو امیر کا معاصر ہے کہتا ہے۔

غلط افتاد خسرو راز خامی ۔۔۔ کہ سکبا پخت در دیگِ نظامی

امیر صاحب کی شاعری قدرتی تھی۔ وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے باپ دادا۔ شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے۔ دیباچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

"دراں صغر سن کہ دنداں می اُفتاد سخن می گوہر از دہانم می ریخت۔"

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''چوں مرا اُستادے سر آمدہ بر سر نیامدہ بود کہ بر سرِ وقائق دال شدے وہ آہوئے مشکبار قلم راز سواد خطا باز آوردے۔''

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے۔ اُستاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے تھے۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے۔ خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا۔ اس کے الفاظ حل کیئے۔ لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہو سکا۔ پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہے۔ امیر صاحب اس کو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بھائی کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے۔ ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے۔ شہاب کی پہلے نہایت تعریف کی ہے۔ پھر لکھتے ہیں۔

مَن بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش — اوباصلاح راند نامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم — رنج بر خود نہاد و منت ہم
نظرے تیز کرد و موے شگاف — ئنے بہ عمیا نظارۂ بگذاف
ایں وقائق کہ شد ز لغزش پوست — مو بمو شعر بیز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از وے — مس من گشتہ کیمیا از وے
ہر چہ او گفت من نہادم گوش — بر کشیدم مگس ز شربت نوش
وانچہ بنمود و من نہ جستم پے — عیب آن بر من ست نہ بر دے
یارب او چوں بہ پنج نامۂ من — بُرد بیروں خطائے خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد — در قیامت خط امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

عیب آں بر من ست نہ بروے

کیا عجیب بات ہے۔ وہ استاد جس کے دامن تربیت میں آپ جیسا شخص پل کر

بڑا ہو۔ آج اس کا نام ونشان تک معلوم نہیں۔

معاصر استادوں کے علاوہ امیر صاحب نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے وہ اُن کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے اور اُسی طرح اس سے فائدہ اٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے۔ اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں۔

زندہ است بمعنی اوستادم | در نیست منش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادکا اشارہ کرتے ہیں

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت | شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ امیر صاحب جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا

کوکبۂ خسرویم شد بلند | زلزلہ در گورِ نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی اور خسرو کی طرف بڑھی۔ خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا نام لیا۔ دفعتہً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آستین تلوار کے سامنے کردی۔ تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی۔ واللہ اعلم[1]

خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۷ برس کی ہو چکی تھی۔ یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے۔ شباب کے زمانہ میں انہوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں۔ اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اُس میں لکھتے ہیں۔

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر | وز دُر او سر بسر آفاق پر
پختہ ازو شد چو معانی تمام | خام بود پختن سودائے خام
بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست | ویں رہِ باریک بپائے تو نیست
کالبدے داری و جاں اندرو قت | ہرچہ تو دانی بہ ازاں اندروست
تا بود ایں سکہ بعالم درست | برتن تو کے بود ایں شقہ چست

---

[1] یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اُسی قدر تاریخ کے بھی خلاف ہے۔

مثنوی اوراست ثنائے بگوے — بشنوش ازدورود عائے بگوے
ایں ہمہ زانصاف نگرزورنیست — گرتونہ بنی وگرے کورنیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں۔

زندہ است بمعنے اوستادم — درنیست منش حیات دادم

غرض امیر صاحب نے کبھی اساتذہ کی استادی سے انکار نہیں کیا۔ وہ تمام اُستادوں کا نہایت ادب کرتے تھے۔ مطلع الانوار میں جو کہہ دیا ہے وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی۔

خود اپنی شاعری کی نسبت اظہار رائے

امیر صاحب کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں۔ اور اسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ ان کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزارائے نہیں دے سکتا۔ قران السعدین میں انہوں نے کیقباد اور بغرا خاں کا حال لکھا ہے۔ لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے۔ اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں۔

وصف براں گونہ فرو راندہ ام — کر غرض قصہ فرد ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام — کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چوں منم اندر قلب کان خویش — معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب یکے نیست کہ جویند باز — چوں ہمہ عیب است چگویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) استاد تمام جو کسی طرز خاص کا موجد ہو۔ جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی۔ (۲) استاد نیم تمام خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں۔ لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے۔ (۳) سارق جو اوروں کے مضامین چُراتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اُستادی کی چار شرطیں ہیں۔ طرز خاص (۱) کا موجد ہو۔ اس کا کلام (۲) شعرا کے انداز پر ہو (۳) صوفیوں اور واعظوں

کے طریقہ پر نہ ہو۔ (۴) غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں در حقیقت اُستاد نہیں۔ اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں۔ لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں اوّل تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں۔ دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

بندہ را از اں چہار شرط اُستادی کہ گفتہ شد۔ اوّل شرطے کہ ملک طرز ست بر حکم ماجرائے کہ در مجرائے قلم جویاں یافت کہ چندیں استاد را متابع کلمات بودہ ام۔

چوں پس رد طرز ہر سوادم   پس شاگردم نہ اوستادم

وشرط دوم آں کہ در نافۂ سواد بوے خطا نباشد از اں نیز نتوانم زو کہ نظم بندہ اگر چہ بیشتر ردان است۔ اما جا بجا در غزل و نغز بغز یدنی ہم ست دریں دو شرط معترفم کہ از لاف اُستادی قرعہ بر فال نتوانم غلطانید۔

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے۔ امیر صاحب کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتی ہے۔

امیر صاحب نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں، کس کے پیرو ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔

غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی، مواعظ و حکم میں سنائی و خاقانی اور قصائد میں رضی الدین نیشاپوری و کمال الدین اسمٰعیل خاں المعانی۔

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا منہ ہے۔ ہم دبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قران السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر صاحب نے شعر و شاعری کے متعلق دیوانوں کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ

میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے۔ فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں۔

(۱) عربی ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے — اس سے ثابت ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی برداشت نہیں کر سکتے۔

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد مرادف الفاظ ہیں۔ اس لئے شاعری آسان ہے۔ ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے۔ بخلاف اس کے فارسی شعرا پر میدانِ شاعری تنگ نہیں۔

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔

اب غور کرو، عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے۔ وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں۔ لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے۔ ردیف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ نرے قافیہ پر مدار ہے۔ جس قدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ۔ ان سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے۔ زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے لیکن زبان دانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے۔ فارسی کی وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ "اور بہت سی وجہ ہیں لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے۔

خصوصیات شاعری

امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں۔ خاص خاص اصناف شاعری میں

کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی ونظامی مثنوی میں۔ انوری اور کمال قصائد میں۔ سعدی اور حافظ غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے امیر قصائد، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں۔ مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا۔ غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے۔ مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تفصیل اس کی آگے آئے گی۔

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں۔ مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میووں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں، نہیں ملتیں۔ جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ امیر صاحب نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا۔ انہوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ اور اس کتاب سے ان کا بڑا مقصد اس قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

بود در اندیشۂ من چند گاہ — کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم — مجمع اوصاف خطایش دہم
طرز سخن راروش نودہم — سکۂ ایں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خورزیں فن اندیشہ زاے — تانہ نشانم نہ نشینم زپاے
وصف نہ زاں گونہ شد از دل...... — کاں دگرے رابدل آید کہ چون

اس قسم کی شاعری کا نام امیر نے وصف نگاری رکھا۔ اور یہ نہایت موزوں نام ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا۔ بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھایا ہے تاہم جس قدر ہے غنیمت ہے۔

کاغذ کی تعریف

کاغذ[۱] شامی نسب وصبح دام — آں کہ شد آرایش صحبش زشام
سادہ حریرے دلے اصلش زخویش — باقصب وخز شدہ پیوند خویش

---

۱ معلم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا۔

تاے حریر آمدہ اندر نورد | طرفہ حریرے کہ تواں جزو کرد
آمدہ احزاش فراہم زآب[1] | لیک پراگندگیش ہم زآب
بسکہ شد از کوبش بسیار پست | پشت دوتا گردوش از یک شکست
گہہ بود از دستہ تیغش گذر | گہہ دہد از تیغ بہ مقراض سر
گہہ خلۂ موزن مسطر کشد | گہہ کشش رشتۂ دفتر کش
حرف بحرف از قلم آرد سخن | لیک بہ پیچد ہمہ برخویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں ہم نے قلم انداز کر دیے۔

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمت کار آگہاں | خانۂ گردندہ بہ گرد جہاں
نادرۂ حکم صدائے حکیم | خانہ رواں، خانگیانش مقیم
اہل سفر را ہمہ بروے گذر | ہمرہ اوساکن واو در سفر
جاریۂ ہند زبانش سلیم | حامل چندیں بچہ لیکن عقیم
بیشتر از مرغ پرد۔ در کشاد | بیشتر از بادر وروز روز باد
رفتہ دو منزل بہ دمے بل دو چند | بارسن و سلسلہ و تختہ بند
ہمچو کلنگاں بہ ہوا سرفراز | پرچو حواصل زدو سو کردہ باز
ہر طرفش رہ بہ شتاب دگر | ہر قدمش بر سر آب دگر
گرچہ بہ دریا گذر و بیش و کم | آب نباشد نگرش تا شکم
دست چو در آب فراز افگند | آب بدست آرد و باز افگند
لطمہ زدہ بررخ دریا بہ زور | آب ازاں لطمہ بہ فریاد وشور
دررہ بے آب نداند شدن | کیست کہ بے آب تواند شدن!

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے۔ لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدماء کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا

---

1. اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے۔ پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا۔

دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں۔ امیر نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں۔ چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

تشبیہات نو بسیار است ایں مجمل جملہ را تحمل نتواند کرد۔ امادو سہ نظیر برائے یاد کردن گردشدہ۔

اس کے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں۔

زانتظار دوماہی ساق تو صد چشم | بزیر ہر موئے دارم چودام ماہی گیر
مژہ ہائے کشر دل آویزت | کشرہائے دوکان قصاب است

زہے خرامش آن نازنیں بہ عیاری | کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری

امیر چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اس لئے تشبیہات میں ان کو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی۔ آخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے۔ فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہہ دیتے تھے۔ ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہہ ہے۔ لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرامی کی سب سے اچھی تصویر ہے۔

قصیدہ، مثنوی، غزل میں انہوں نے جو جدتیں پیدا کیں ان کی تفصیل علیحدہ علیحدہ عنوان میں آگے آتی ہے۔

مثنوی

مثنوی میں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔ نظامی کے پیرو ہیں۔ نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں۔ رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، امیر خسرو نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہے۔ البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قران السعدین۔ یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی۔ اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے۔ لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند، رواں اور

برجستہ ہے۔ مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا۔ یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط وکتابت اور حملہ کی تیاری۔ بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحبِ تخت تھا اور اسی کی فرمائش سے یہ مثنوی لکھی گئی۔ بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں، جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا۔ مفصل اور آب ورنگ کے ساتھ لکھی جائیں۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے۔ تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے۔ اس جھوٹی منطق کو امیر نے جہاں تک ہوسکا۔ خوب نباہا ہے۔ چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں۔

گر بہ گہر تاج ستان توام | عیب مکن گوہر کانِ توام
در ہوس تاج ترا درسراست | من گہرم تاج مرا درخوراست
چوں سرم از بخت سرافراز گشت | تاج توبرتارک من باز گشت
تخت جہاں بہر توبرپاے کرد | لیک براں تخت مراجاے کرد
ملک بہ میراث نیابد کسے | تانہ زند تیغ دو دستی بسے
از تواگرنام پدرروشن است | خطبۂ جدبیں کہ بنام من است
ہردو جوانیم من وبخت من | بادو جواں پنجہ بہم در مزن
گرچہ برویت نہ کشم درستیز | ازپئے تعظیم توشمشیر تیز
لیک تودانی کہ چوکیں آورم | شیر فلک رابہ زمیں آورم
جز توکسے گردم ازیں درزدے | سرزنش تیغ منش سرزدے
لیک توئی چوں بہ پئے ایں سریر | من ندہم گرتوتوانی بہ گیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح...... حرف پدرانہ محبت کے نشہ سے چور ہے

اے زنسب گشتہ سزائے سریر | وزپسری ہمچوپدر بے نظیر
گرچہ غباراست زکار توام | سرمۂ چشم است غبار توام
تاتونہ دانی کہ دریں گفتگوے | ازپئے ملک است مراگفتگوئے
گرچہ توانم زتوایں پایہ برد | از توستانم بکہ خواہم سپرد
شکرکہ شد ندہ در ایام تو | من زتو ونام من از نام تو
باش بہ کام وکہ بکام توام | زندہ ونازندہ بنام توام

خواہمت از جان کہ پناہی مرا | در تو بہ خواہی ونہ خواہی مرا
جز بہ تمنائے تو سودام نیست | بہتر ازیں ہیچ تمنام نیست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک | تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم زتوائے نیکبخت | نے خوشم از تاج ونہ شادم زتخت
بخت من از پائے برافلاک سود | باتوچو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان خارا گداز الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا۔اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوش محبت میں کہتا ہے۔

من کہ گلے رستۂ باغ توام | پرتوے از نور چراغ توام
گرہمہ برماہ رسد افسرم | ہم بہ تہ پائے توباشد سرم
زابروِ خودکن تواشارت بچیں | من سرخاقان فگنم بر زمیں
تاج زمن سرز توافراختن | عاج زتو۔تخت زمن ساختن
در بہ ملاقات رہی رائے تست | افسر من خدمتی پائے تست
نیست مرا آن محل وآں شکوہ | کز سرخود سایہ فشانم بکوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا۔باپ کو دیکھ کر بے اختیار تخت سے اُترا اور باپ کی طرف بڑھا۔باپ نے چھاتی سے لگایا، دیر تک دونوں جوشِ محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا۔

گرم فروجست زتخت بلند | کرد بہ آغوش تنِ ارجمند
داشت بہ آغوش خودش تا بدیر | سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر
باخودش از فرش بہ اورنگ برد | تخت کیاں باز کیاں را سپرد
گاہ زدیدہ بہ نثارش گرفت | گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت
گاہ نظر بر رُخِ زیباش کرد | گاہ دل از مہر شکیباش کرد
پرسش از اندازہ زغایت گذشت | حد نوازش زعنایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں۔اسی طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان

باتوں کو نہ لکھتا۔

خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار، شریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینہ اسکندری، ہشت بہشت۔

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ یہی اُن کی تصنیف کی ترتیب ہے۔ چنانچہ امیر نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے۔ ان پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے اور یہ قادر الکلامی اور پر گوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اگر چہ اس میں شبہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے اُن میں نسبتاً امیر صاحب کا خمسہ سب سے بہتر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر کے دل میں بے اطمینانی تھی۔ آئینہ اسکندری میں لکھتے ہیں۔

دگر بازگیری تو پیوند خویش　　　مرا خود عزیز است فرزند خویش
سزد گرچہ آواز خر، خندہ را　　　بود ارغنواں گوش خربندہ را
بردباد بخشایش داد گر　　　کہ برمن بہ بخشش گمارد نظر
ہنر جوے درعیب جوئی مکوش　　　ترا نیز عیبے ست برخود بپوش

نظامی کے پرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں ان کے زور طبع کا یہ نمونہ ہے۔

بہ گردوں شد از نائے زریں خروش　　　بہ دریائے لشکر در افتاد جوش
ہزاہز در آمد بہ ہردو سپاہ　　　روارو در آمد بخور شید و ماہ
علم سرز عیوق برتر کشید　　　سنان چشم سیارہ برسر کشید
بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت　　　جہانے پراز شیرو شمشیر گشت
غبار زمیں کلّہ برماہ بست　　　نفس راد رون گلوراہ بست
چناں گشت روے ہوا گرد ناک　　　کہ سیارہ گم کرد خود را بخاک
سپاہ از رہ موج زن تا بہ اوج　　　چو دریا کہ باشد درآر بموج
بہ دریائے آہن جہاں گشتہ غرق　　　ہوا پرز میغ وزمیں پرز برق

زبانگ ہیونان گیتی نورد | شدہ پر صدا گنبدلا جورد
عرق کردن توسناں درشتاب | زدریاے آتش برانگیخت آب
شرارہ کہ زد نعل ہنگام رو | ستارہ بروں ریخت از ماہِ نو
نفیرزہ از چاشتی کماں | شدہ چاشنی بخش جاں ہرزماں
گرہ برگرہ دشت پیکاں زناں | زرہ برزرہ پش روے ......
بزیر سپر تیغ رخشاں زتاب | چناں کزتہ برگ نیلو فر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں۔ مثنوی امیر کا اصلی مذاق نہیں سلاطین کی فرمائش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے۔ چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی۔ میرا یہ حال ہے کہ پانوں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے۔

مسکین من مستمند بے ہوش | از سوختگی چودیگ در جوش
شب تاسحر وزصبح تاشام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم زبراے نفس خودراے | پیش چوخودے ستادہ برپاے
تاخون نہ رود زپاے تاسر | دستم نہ شود زآب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب ان کے خاص مذاق کی ہے۔ یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی اُنہوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے۔

میداد چونظم نامہ را ہیچ | باقی نہ گذاشت بہر ماہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں اور ان کا کمال دکھایا ہے مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں۔

آتش زدہ گشتہ کوہ دکاں ہم | تفسیدہ زمین و آسماں ہم

جاے نہ کہ دیدہ رابروخواب ابرے نہ کہ تشنہ رادہدہ آب
مرغان چمن خزیدہ راشاخ دررفتہ چہ ندگاں بہ سوراخ
ریگ از تفِ پختہ درگرانی چوں مایۂ روز میہمانی
از گرمی ریگہاے گرداں پُر آبلہ پاے رہ درداں

عشق ومحبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھ کر کون سا موقع مل سکتا تھا۔ اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُر درد غزل ہے۔ سگِ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرا نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے۔ امیر خسرو نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے۔ مجنوں، کتے سے خطاب کرتا ہے۔

بستیم من و تو ہر دو شب گرد لیکن تو بہ نالۂ من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے برخاک درش زمن نہی روے
ہر خس کہ برو گذاشت کامے از من برسانیش سلامے
ہرجا کہ نہاد پاے روشن زنہار بوسی ازلب من
خواہد چو ترا درون دہلیز یادش دہی ازسگ دگر نیز
زنجیر خودت نہد چو بردوش از گردن من مکن فراموش

اس پیرایۂ ادا کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھ کو ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو ایک اور سگ در کو یاد دلا دینا۔ جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھ میری گردن کو بھول نہ جانا۔

عاشق کا پیغام وسلام سب لکھتے ہیں۔ لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے اور کیونکر لکھتا ہے۔ نہایت نازک مقام ہے دیکھو امیر اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں کو لکھتی ہے۔

اے عاشق دور ماندہ چونی وے شمع زنور ماندہ چونی
روزت دانم کہ شب نشان است شبہاے سیہ برچہ سان است
از من یکہ ے بری حکایت باخود ز کہ می کنی شکایت
درگوشِ کہ؟ نالہ می رسانی درپاے کہ؟ قطرہ می فشانی

بازارِ تو در کدام سوی است   سیلاب تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور دردِ دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا اب اس کی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے؟ کس سے دردِ دل بیان کرتا ہے؟ کس کے آگے میرا نام لیتا ہے۔ یہ باتیں تو رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں۔ ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

آئینۂ اسکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی ان کے مذاق کا جو میدان آیا ہے اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں۔ نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے۔ خاص اس موقع پر خوب زورِ طبع دکھایا ہے جہاں وہ دلربا سکندر کی ایک ایک وصف پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے۔

خسرو نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے اور اسی طرح بت چینی کا فخریہ لکھا ہے نظامی کے فخریہ سے ملا کر دیکھو معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے۔

مشعبد کہ داند جہاں سوختن   ز من بایدش بازی آموختن
ہمہ خون خوبان کُشی می خورم   ولے نوش بادم کہ خوش میخورم
رخ ہر صنم ناپدید از من است   صنم خانہ ہا را کلید از من است
سپہر آفتابِ زمیں خواندم   دگر ماہ بیند۔ ہمیں خواندم
سکندر کہ گرد آب حیواں ہوس   نظیر منش بود مقصود و بس
گر او ہست کیخسرو جام جزے   مرا جام گیتی نمائیست روے
گر از مجلسِ او کمن مے دمد   مرا لالہ وگل، ز تن مے دمد
گر او راست بر تخت پائے نشست   مرا در دل اوست جائے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہاں خراج   من از سروراں سر ستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت درا یا ورند   مرا ہر دو چوں کمتریں چاکراند
گر او دشمناں را بجوں خوردن است   مرا خوں صد دوست بر گردن است
گر او را یک آئینہ بر کف نشست   دو آئینہ دارم من از پشتِ دشت

کمان دے از صید بند دندام　　من آنم کہ صیادگیر دبدام
گراوراکلا ہے است برآسماں　　مراصد کلاہ است برآستاں

ہشت بہشت۔ یہ سب سے آخری مثنوی ہے اور امیر کی شاعری اس میں پختگی اور پرُ کاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے۔ خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے۔ ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں۔ لیکن التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جائے اُس کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوئی جاتی ہے، ادا کئے جائیں۔

تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا۔ اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا۔ حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا، جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منھ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو، دیدے۔ اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے۔ چیونٹی تار کو لئے ہوئے۔ اوپر چڑھتی چلی گئی۔ حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لے کر اس سے رسّی بٹی اور پھر ایک خاص تدبیر سے اسی کے سہارے نیچے اترا۔ تمام قصہ بہت لمبا ہے۔ ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں۔

چوں نگہ کرد خواجہ از بالا　　کہ زنش در رسید باکالا
دادش آواز گفت برسرتار　　پارۂ قند کن بزودی یار
وہ بمورے کہ می رود برمیل[1]　　تا بہ بالاش می رود بتعجیل
رشتہ راز دوز و دمی کن باز　　کز نشیب آورد بہ سوے فراز
ہمچناں کردزن کہ اوفرمود　　داد رشتہ بمورومور ربود
راند بالاے میل تارکشاں　　رسن فتنہ برحصار کشاں
چوں بہ نزدیک رخنہ رفت بزور　　ریسماں راربود خواجہ زدور

---

[1] لاٹ عملا

قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے۔ کمالؔ، اسمعیلؔ، خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں۔ اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں۔ اُس کا تتبع کرتے ہیں۔ خاقانیؔ کا مشہور قصیدہ ہے۔

مجلس دو آتش دادہ بر ایں از شجر رواں از حجر ایں کرد منقل را مقرر واں جام را جا داشتہ

اس کے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے۔ وہی انداز، وہی ترکیبیں، وہی استعارے ہیں۔ اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے۔ اس لئے ۱۰۷ شعر کہہ کر دم لیا ہے۔ اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے۔ عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے۔

هر سو جوانان نوسلب هر سو عروساں در قصب طفلاں نہ خفتہ از طرب دیدہ بہ فرداد داشتہ
از شیر و خر ما مرد و زن، در شیر خواری تن نہ بن چوں شیر خواراں در دہن، پستان خرما داشتہ
خورشید چوں سر بر زدہ، ہر کس براہے در شدہ ایں روبسوی میکدہ، اودر مصلا داشتہ
فاسق کہ مے نا خوردہ گہ، در عید گہ بیہودہ رہ سر بر بساطِ سجدہ گہ دل سوے صہبا داشتہ
دارد مے معلول ست مے، بل جان محلول است مے خورشید مخول است مے، در طاسِ مینا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے اُن کو پسند نہیں۔ صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں۔ اس لئے قصیدہ میں اور اور مضامین کو لیتے ہیں اور اُن میں زورِ طبع دکھاتے ہیں۔ مثلاً بہار کا سماں، برسات کی رُت، صبح و شام کی کیفیت، ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہدیا ہے۔

بر ما رید و ہمہ روے زمیں را تر کرد خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم صبا گشت بوستاں فرمود بساطِ خاک ز دیبا و پرنیاں فرمود
چو ور دے نازک گل تابِ آفتاب نداشت زمانہ بر سرش از ابر، سایہ باں فرمود
ز لالہ خواست چمن ساغر و سبک بخشید ز ابر خواست زمیں شربت و رواں[1] فرمود
ہر انچہ در درق خویش غنچہ مشکل داشت بنفشہ گوش نہاد و صبا بیاں فرمود

---

[1] رواں فرمودن۔ فوراً حاضر کرنا

صبح کا سماں

سپیدہ دم کہ فلک روشنی بہ گیہاں داد ‏ نسیم غالیہ در دامن گلستاں داد
چو چرخ پیر بہ رخ زد سپیدی و سرخی ‏ بدستش آئینہ داد آفتاب و خنداں داد
درست مغربی آفتاب را کہ فلک ‏ نہاد زیر زمیں بامداد تاباں داد
ستارہ راز چہ شد دیدہ خیرہ از خورشید ‏ چو شب زحقہ میناش سرمہ چنداں داد
غلامِ بادِ صبا ام کہ بامداد وپگاہ ‏ صلاے عیش بہ عشرت سرائے متاں داد

باغ

و بہار است و چمن جلوہ چو حورا کردہ ‏ ابر بار تختنی لولوِ لالا کردہ
گرہِ طرۂ سنبل کہ صبا باز شدہ ‏ دامن لالہ پر از عنبر سارا کردہ
بر گل و لالہ میرود آنکہ قمری ‏ پاے آلودہ بخوں پائچہ بالا کردہ
عاشقاں رفتہ بگلزار و دل سوختہ را ‏ بہ تکلف زگل و لالہ شکیبا کردہ

نو بہاران سال مارا روزہ فرماید ہمی ‏ گل چناں تر دامن از سے لب نیالاید ہمی
بر دہان غنچہ گہ گہ می زند بوسہ نسیم ‏ کان شکر لب جز بہ بوسہ روزہ نکشاید ہمی
باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد ‏ گل بخندہ گفت، آرے ایں چنیں باید ہمی
نرگس رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا ‏ گوئیا می خوارہ ماہِ عید را باید ہمی
(گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے)

برسات

ہوائے خرم است و ہر طرف باراں ہمی بارد ‏ نگویم قطرہ کز بالاے گل ریحاں ہمی بارد
نگون سر، شاخہاے سبز گوئی در ہمی چیند ‏ زبس کا بر دُر افشاں لولوی غلطاں ہمی بارد
یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ اُن کے رو کنے کو جھکی ہیں۔
چکاں قطرہ زسرہاے انار تر تو پنداری ‏ کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندرو پنہاں ہمی بارد
خوش آں وقتیکہ مطرب در سماع نیکواں سرخوش ‏ خراماں درمیان سبزۂ و باراں ہمی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت واخلاق میں ہیں۔ان میں بحرالابرار جو بڑا اسیر حاصل قصیدہ ہے مشہور ہے۔التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعویٰ اور اس کے ساتھ دلیل ہو۔

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش در دسراست ۔۔۔ ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و براست
عاشقی رنج است و مرداں راسینہ راحت ست ۔۔۔ سلسلہ بنداست و شیراں را بگردن زیوراست

یعنی عاشقی میں گو تکلیف ہے۔لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے۔جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اس کا زیور ہے۔

مرد پنہاں در گلیمے بادشاہے عالم است ۔۔۔ تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشوراست
راہرو چوں در ریا کوشد مرید شہوت است ۔۔۔ بیوہ زن چوں رخ بیاراید بہ بند شوہراست
نفس خاکِ تست ہر گہ نور بالا بر تو تافت ۔۔۔ سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ برتاک خوراست
کار اینجا کن کہ تشویش است در محشر بسے ۔۔۔ آب زینجا بر کہ در دریا بسے شور و شراست
ناکس و کس ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است ۔۔۔ عود سرگیں ہر چہ در آتش فتد خاکستراست
اے برادر، مادر دہر ار خورد خونت مرنج ۔۔۔ چوں ترا خوں برادر بہ ز شیر مادر است
دہر خاکے رانمونہ میکند کیں مردم است ۔۔۔ بحر آبے را غلولہ میکند کیں گوہراست

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعری کی جدت طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے۔اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ان کے مخلص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں۔

برسات کے ذکر کے بعد

برآمد ابر در بخشش و گرزاں پایہ در غلطد ۔۔۔ نگیرد ہیچکس دستش مگر شاہ جہاں گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل از کم عمر شد گو باش دانی ۔۔۔ کہ در خور کیست عمر جاوداں را
نہال باغ شاہی رکن حق آں کہ ۔۔۔ ز بزم اوست رونق بوستاں را

کشادہ چہرہ کہ ماہے شدم بروے زمیں ۔۔۔ در ملک بنمودم کہ آسماں ایں است

طلوع صبح کا بیان

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست　　　آسماں روئے ملک پچھو نمود

ندارد روئے آں نازک زگرما ہیچ آسیبے　　　مگر در سایہ رایاتِ شاہ کامگار آمدہ

طلوع آفتاب کے بیان کے بعد

خورشید جہانگیر میندار کہ در بزم　　　شمشیر کشیدہ ملک اشرق برآمد

قصائد میں امیر نے جس قدر جدید مضامین۔ لطیف استعارات، نئی نئی تشبیہیں، گونا گوں اسلوب پیدا کئے اُس کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعر کا پامال میدان ہے لیکن امیر اس میں بھی سب سے الگ ہیں۔

بوستاں بشگفت د روئے لالہ خنداں گشت باز　　　بر رخ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز

سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت　　　بلبل آنگہ از خط خوباں غزلخواں گشت باز

خون لالہ گوئیا خواہد چکید از تیغ کوہ　　　یا چکید آں خوں کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل

اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدماء کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی۔ سعدیؔ نے غزل کو غزل بنا دیا۔ امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانہ سعدی کی شراب ہے، جو دوبارہ کھنچ کر تیز ہو گئی ہے۔

غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق عجز و نیاز اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں، وہی زبان ہو جس میں عاشق، معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں۔ جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی اُلجھاؤ نہ ہو، قریب الفہم خیالات ہوں، اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انہوں نے غزل کی اصلیت

کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیے۔ یہ سب اجمال تھا۔ تفصیل ذیل میں ہے۔

بحروں کی موزونی وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جس میں خواہ مخواہ بات کو صفائی۔ سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے مثلاً

سرے دارم کہ سامان نیست اورا | بہ دل دردے، کہ درماں نیست اورا
فرامش کرد عمرم روز راز آں کہ | شبے دارم کہ پایاں نیست اورا
بہ راہ انتظارم ہست چشمے | کہ خوابے ہم پریشاں نیست اورا

یار من دل زدوستاں برداشت | مہر دیرینہ از میاں برداشت
در دل او نہ کرد کار از چہ | سنگ از نالہ ام فغاں برداشت
دے بہ تندی بلند کرد ابرو | از پے کشتنم کماں برداشت

آں دوست کہ بود برگراں شد | واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر گردی اے دل | دیدی کہ بہ عاقبت ہماں شد
دل بردگرے نہم ولیکن | عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے راچونامہ باز کنید | نام من برسرش طراز کنید
گر شما دینِ عاشقاں دارید | بعد ازیں پیش بت نماز کنید
گاہ مردن شنیدہ ام محمود | گفت رویم سوے ایاز کنید

داد من آں بتِ طراز نہ داد | پاسخے نیز دل نواز نہ داد
خواب مارا بہ بست و باز نہ کرد | دل مارا ببرد و باز نہ داد
تو چہ دانی نیاز مندی چیست | چوں خدایت بہ کس نیاز نہ داد

سوز وگداز۔ سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

آگ سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اس میں بھی معشوق سے اپنا حال کہہ رہے ہیں کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ پر اُن کو رحم آتا ہے۔

ماجرائے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال　　اے سرت گردم چہ میپرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق، معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اُس کو رونا آتا ہے۔ ٹھہر جاتا ہے۔ رو لیتا ہے۔ پھر آگے بڑھتا ہے۔ اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔

خسرو است و شب افسانہ دیارد ہر بار　　قدرے گریدو پس برسر افسانہ رود

زانوش خسرو بہ زیر سرینا فت　　سرنہادہ بر سر زانو بخفت

اے آشنا کہ گریہ کناں پند میدہی　　آب از بروں مریز کہ آتش بجاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہیے۔ پھر دل پر غصہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات نہیں ہو سکتی اُس کے کہنے سے کیا فائدہ۔ اس معاملہ کو یوں باندھتے ہیں۔

غصہ ام می کشد اے دل سخن صبر مگوے　　وہ چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد می بردی اے دشمن! بعقل و دانش خسرو　　بیا تا برمراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج و غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔ عاشق (جس کا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے) عاشق ہو کر تمام فضل و کمال اور عقل کھو چکا ہے۔ وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید برآئی۔ اس کو کس موثر طریقے سے ادا کیا ہے۔

جان زتن بردی و در جانی ہنوز　　درد بادادی و در مانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روے خود نمائیمت　　ایں سخن بیگانہ را گو، کاشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بردل سلطاں زند　　ورنہ رنجی بردل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے۔ اور برا نہ مان تو فقیروں پر بھی۔

"ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے۔

کشتم از تیغ جفایش خویش را ... برتو آساں کردم و برخویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریاد من ... شب نمی خسپد کسے درکوے تو

صبر طلب میکنند از دل عاشق ... ہمچو خراجے کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول لگایا جائے۔

اے دیدہ چہ ریزی از بروں آب ... کیں شعلہ بہ جاں گرفت مارا
اے خواب! بروکہ باز امشب ... سودائے فلاں گرفت مارا

اے عشق کارتوبہ چومن تا کسے افتاد ... گویا کسے نماند جہان خراب را

دل ندارم غم جانا بچہ بتوانم خورد ... پیش ازیں گرچہ غمے بوددلے ہم بودہ است
کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تودوش بمن ... از شب تیرہ، خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیابردوستاں جاناں قضاکن ... ہرآں تیرے کہ بردشمن خطاشد

دل باز سوے آں بت بد خوچہ میرود ... آں خوگرفتہ باز دراں کوچہ میرود
جاں میرود زتن چوگرہ میزند بہ زلف ... مردن مراست از گرہ اوچہ میرود

گربہ بینی دل ویرانِ مرا ... گوئیا ہیچ گہ آباد نہ بود

کافرے رخت دلم غارت کرد ... شہر اسلام و مرا داد نہ بود

میرا انصاف نہ کیا گیا

کرشمہ چندکنی برمن آخرایں جاں است ... نمی دہدز زمیں وصبا نمی آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی۔

کرشمہ چندکنی برمن آخرایں جاں است ... نمی دہدز زمیں آسماں نمی بارد

به لبم رسیده جانم تو بیا که زنده مانم　　پس از انکه من نمانم بچه کار خواہی آمد

جدت اسلوب۔ غزل کی ترقی کا نوروز، لطفِ ادا اور جدت اسلوب ہے۔ جس کے موجد شیخ سعدیؔ ہیں۔ لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا۔ امیر خسرو کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرایے کر دیے۔ جو اگلوں کے خواب وخیال میں نہ آئے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم وستم کے ساتھ بھی محبوب ہے۔ یوں ادا کرتے ہیں۔

جاں زتن بردی ودر جانی ہنوز　　در دہا دادی ودر مانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔

ہر دوعالم قیمت خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے۔ اسی مضمون کو دیکھو، امیر خسرو نے کس انداز سے کہا ہے۔

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج وغم سے بے خبر ہونا۔ عام مضمون ہے اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے۔

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست　　اوہمیں کار رنگ وبود اند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اس کو یوں باز رکھتے ہیں۔

ہنوز ایماں ودل بسیار غارت کردنی دارد　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا۔

می روی دگریہ می آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق۔

گفتم چگونہ می کشی وزندہ می کنی　　از یک نگاہ کشت ونگاہ دگر نہ کرد

سعدی کا شعر ہے؟

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجے کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن امیر خسرو نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا۔

جراحتِ جگر خستگاں چہ می پرسی ۔۔۔ زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو ۔۔۔ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

بتے و آفتِ تقویٰ و آخر ایں نمیدانی ۔۔۔ کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے۔ بجائے اس کے کہ خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے۔ گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے۔

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

جان زنظارہ خراب وناز او زاندازہ بیش ۔۔۔ مابوئے مست وساقی میدہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا۔

شراب لطف پرور جام میریزی و میترسم ۔۔۔ کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

اکثر جگہ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں۔

چشم بدور از چناں روئے ۔۔۔ کہ از وچشم دور نتواں کرد

مردماں در من وبیہوشی من حیرانند ۔۔۔ من درآں کس کہ تا ربیند و حیراں نشود

گفتیم ناخوش چرائی خسروا! ۔۔۔ چوں کنم! آں قد وآں بالا خوش ست

گفتم کہ ترا ہمیں غلامم ۔۔۔ گر ہست گناہ من ہمین است

دہنت ذرّہ کم از ذرہ است ۔۔۔ رخ زخورشید ذرۂ کم نیست

ایہام۔ یعنی ذو معنیین الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں۔

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم ۔۔۔ چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

پیش ازیں برخودم یقینے بود که دلم ہیچ دلستاں نبرد
توببردی ہمہ یقین مرا بطریقے کہ کس گماں نبرد

دی روے تودیدم ونہ مردم شرمندہ بماندہ ام زردیت

دیگر سرآں نست کہ من زہد فروشم ساقی قدے بادہ کہ برروے تونوشم

اکثرجگہ جملۂ معترضہ یاجملۂ شرطیہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں اور یہ ان کا خاص مذاق ہے۔

بروابادا! بوسہ زن برآں پائے دگر چیزے نگوید بردہاں ہم

غمزۂ تو برصف سلطاں زند ورنہ رنجی بردل درویش ہم

رشکم آید کہ برم پیش تونام دگراں دگرانصاف بودپیش توہم نتواں گفت

کشتم ازتیغ جفایت خویش را برتو آساں کردم وبرخویش ہم
غمے دارم کہ باد از دوستاں دور بحق دوستی کز دشمناں ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی

مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں۔مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت۔

دل وجانم بتومشغول ونظردرچپ وراست تاندانند رقیباں کہ تومنظور منی

"امانا سخ نقوش مانوی امیر خسرودہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقع گوئی گردیدواساس آں رابلند ساخت۔"

عشق وہوس بازی میں جوحالات پیش آتے ہیں۔اُن کے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں۔اہلِ لکھنؤ نے اس کا معاملہ بندی نام رکھا ہے۔بہرحال اس طرز ادا کے

موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا امیر خسرو ہیں۔
شرف فزوینی۔ ولیٔ دشت بیاضی۔ اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہنچا دیا۔ آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں۔

خوش آں زماں کہ بروئیش نظر نہفتہ کنم　　چو سوئے من نگہ دارد، نظر بردانم
غلامِ آن نفسم کادمم چو خانۂ او　　بخشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بر درش بسیار، درباں گفت ایں مسکیں　　گرفتار است شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر صاحب کے کلام کے زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے نازک و لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں۔

چند گویند کہ گہہ گہہ بہ دلش میگذری　　ایں حدیثے کہ بہر دل مانیز کنند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو! تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے۔ لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ اس لئے کیونکر اعتبار آئے۔

جانا! اگر شبیت دہن بردہن نہم　　خود را بخواب ساز مگو کیں دہان کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے مُنہ پر مُنہ رکھدوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا۔ یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منہ ہے۔

دل من مست بود وقصۂ دوست　　گہے ز انجام و گہ ز آغاز میگفت

اندک اندک گہے بایار بودن خوش بود　　وز میسر گردم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ می نمائی بہ بر کہ بودی؟ امشب　　کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

مست آں ذوقم کہ شب در کوئی خویشم دید و گفت　　کیست لیں؟ گفتند مسکینے گدائی میکند

جاں باد فدات آں دم کز بعد دو سہ بوسہ　　گویم کہ یکے دیگر۔ گوئی تو کہ نہ توانم

وعدہ میخواہم ودر بند وفا نیز نیم　　غرض آنست کہ بارے بہ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال

عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہوگئی ہے۔ جس کا نام علمی زبان ہے۔

سعدی و نامی وغیرہ کی زبان اگر بولنے کی قلمبند کی جاتی تو بوستاں اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی۔ بلکہ آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں دقت ہوگی۔ لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے۔ بے شبہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہئے۔ کیونکہ عاشق معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔

قدماء میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے۔ سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی۔ شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا گر یہی ہے۔

امیر کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف اور سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں جو آج ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اس زمانہ کے روز مرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں۔

دل بسے بردۂ نکو بشناس　　　آں کہ مجروح تر ازان ......ست

یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں۔ خوب غور کر کے دیکھو۔ جو بہت زخمی ہو وہی میرا دل ہے۔

صبح روے تو بدنیساں کہ برآمد امروز　　　نیست امکاں کہ چو من سوختہ تا شام کشد[1]

لب و دہان و رخت ہر یکے بلائے دل اند　　　یکے دلم چہ کند، جانب کدام شود

---

[1] تا شام کشد یعنی شام تک زندہ رہ جائے۔

یعنی تیرا لب و دہن اور چہرہ سب بلا ہیں میرا دل کیا کرے۔ کدھر کدھر جائے۔

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی　　عاقبت رفت ہماں گفتہ من پیش آمد[1]

خلقے براہ منتظر جاں سپردن اند　　اے ترک نیم مست عناں را کشید تر

ذرا باگ کو روکے ہوئے

بوسۂ گفت و زباں گردانید　　خود ہمی گوید دے گرداند

بوسہ دینے کو کہا۔ اور پلٹ گیا۔ آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے۔

بوے خوشم آید از تو در جیب　　گل داری، یا ہمیں ست بویت

تیرے بدن سے خوشبو آ رہی ہے۔ تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے۔

خشک سالیست دریں عہد وفا را اے اشک　　زاں حوالی کہ تو می آئی باراں چوں است

جدھر سے تم آئے ہو ادھر بارش کیسی ہے

اے گل ذہن تنگت صد تنگ شکر چیزے　　گل با تو نمی ماند در حُسن مگر چیزے

ذرا سا

گویم غم و درد م بیں گوئی کہ تبرخواہم　　بسم اللہ اگر خواہی ریں ہر دو بر چیزے

چو سبزہ خویش را خط تو خواند جاے آں باشد　　کہ گل از خندہ بر خاک او فتد غنچہ شکم گیرد

یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

دلم میخواستی برہم عفاک اللہ چناں دیدی　　مرا میخواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

اے صبادی کہ فلانے بچمن مے میخورد　　ہیچ یادِ من گم گشتہ زندانی کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم　　بوے گل نیست کہ می آیدم این بوے کسی است

دل من دور نہ رفت ست نکو میدانم　　باز جوئید ہمیں جائے کہ در کوئے کسی است

---

[1] یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا

مشتبہ می شودم قبلہ زرویت چہ کنم؟ کہ زابروے توچشم بدومحراب افتاد

تیراچہرہ دیکھ کرمجھ کوقبلہ میں دھوکاساپڑتا ہے۔کیونکہ مجکو تیری ابروسے دومحرابیں نظرآتی ہیں۔

رخ جملہ را نمود و مراگفت تومبیں زیں ذوق مست وبیخبرم کان سخن چہ بود

سب کومنہ دکھلایااورمجھ سے کہا کہ تونہ دیکھ میں اس مزہ میں ہوش ہوں کہ یہ کیابات کہدی۔

ساکنان سرکوے تونباشند بہوش کاں زمینے است کہ انجاں ہمہ مجنوں خیزد

زچشمت کارواں صبرمن تاراج کافرشد مسلماناں کسے دیدست کاندرشہررا افتد

مسلمانوں کسی نے شہرمیں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے

بہ بازی سوئے من آمد بشوخی دل زمن بستد بدوگفتم چہ خواہی کرد گفتا کارمی آید

عام محاورہ بکارآید ہے۔کارمی آید۔امیرخسرو کے سوااورکسی کے کلام میں نظرسے نہیں گذرا۔

حسن توعالمے بخواہد سوخت ہم در آغازمی تواں دانست

نرخ کردی بہ بوسۂ جانے بندہ بخرید ورایگاں دانست

(تونے ایک بوسہ کی قیمت جان قراردی میں نے خریدااوریہ سمجھا کہ مفت لیا)

ازبہرآں کہ لاف جمال تومیزند صدبارلالہ بردہن یاسمیں زدہ ست

ماجاں فدائے خنجر تسلیم کردہ ایم خواہی بخش خواہ بکش رائے رائے تست

ساقی بیارمے کہ خیاں سوخت دل زعشق کزسوزایں کباب ہمہ خانہ بوگرفت

راست کردی زابرواں محراب می نماید نماز خواہی کرد

(ابروؤں سے تونے محراب درست کی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کاارادہ ہے)

من آن ترک طناز رامی شناسم من آں مایۂ ناز رامی شناسم

شم تازہ شد جاں بہ دشنام مستی توبودی من آواز رامی شناسم

بادصبا چو از رخ اوزلف دررلود — ابرسیہ کشادہ شدوآفتاب کرد

—————دھوپ نکل آتی ہے

توحال من ہم ازیں روے زرو بیروں بر — کہ من بروے توپدا نمیتوانم کرد

سالہاشد کہ نیابم خبرو درکویت — دل ویراں شدہ راآیم وآواز کنم

————

من اَز سرزندہ گردم گر تو باریک ایک سخن گوئی — تومیدانم نگوئی لیک من گفتار میگویم

—————مجھ کو معلوم ہے کہ تم نہ کہو گے لیکن میں ایک بات کہتا ہوں

دعوائے خون بہاے دل خویش میکنم — یک بوسہ برلبم زن ومالا کلام کن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا اور اہلِ زبان کے کلام میں نہیں ملتے۔ مثلاً

ازگرہِ او چہ میرود۔

آواز کردن۔ پکارنا۔

گفتار میگویم۔ یوں ہی اک بات کہتا ہوں مالا کلام کردن۔ کسی کو ساکت اور بند کرنا۔

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقراء پر اعتماد نہیں۔ اس لیے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے۔

مسلسل غزلیں

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے۔ قصائد کا موضوع مدح ہے۔ مثنویاں قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں۔ قطعات میں بھی اور باتیں ہوتی ہیں۔ عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں تو کیونکر کریں۔ اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ لیکن قدماء بلکہ متاخرین میں بھی اس کا رواج بہت کم ہوا۔ امیر خسرو نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ مثلاً عاشق۔ قاصد یا اپنے راز دار سے

معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں؟ وغیرہ وغیرہ دیکھو کس اشتیاق سے کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں۔

اے صبا باز بمن گوی کہ جاناں چون است؟ ۔۔۔ آن گل تازہ وآں غنچۂ خنداں چون است؟

با کہ مے میخوردآں ظالم دورے خوردن ۔۔۔ آں رخ پر خوے وآں زلف پریشاں چون است؟

چشم بہ خوش کہ ہشیار نباشد مست است ۔۔۔ چشم میگونش کہ دیوانہ کندآں چون است؟

روے وزلف بے تعیار کہ آں ہر دوخوش اند ۔۔۔ دل دیوانۂ من پہلوایشاں چون است؟

روز باشد کہ دلم رفت ودراں زلف بماند ۔۔۔ یارب آں یوسف گم گشتہ بزنداں چون است؟

پوچھتے پوچھتے دفعتہً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلاف عاشقی ہے اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے۔

ہم بجاں وسر جاناں کہ کم وبیش مگوے ۔۔۔ گو ہمیں یک سخن راست کہ جانا چوں است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کہہ۔ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے۔

معشوق نے روزہ رکھا ہے۔ اُس پر عاشق کے دل میں جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اُن کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے۔

ماہ من روزہ میان شکر ستان دارد ۔۔۔ اے خوش آں روزہ کہ جادر لب جانان دارد

لب میں آلودہ دہاں پر شکر ونرگس مست ۔۔۔ اے مسلماناں؟ کس روزہ بدنیساں دارد

خضر گر برلبش آید، شکند روزۂ خویش ۔۔۔ کاں پسر درتہ لب چشمۂ حیواں دارد

می خورد آخر منش پنہاں نیست ۔۔۔ من گرفتم کہ خود اوروزہ پنہاں دارد

جان من گرتو قدم رنجہ کنی۔ بندۂ تو ۔۔۔ قدرے آب دو چشم ودل بریاں دارد

معشوق سروساماں کے ساتھ سوار آرہا ہے۔ عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آرہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں۔ معشوق آرہا ہے۔ لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا۔ اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہئے۔ ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں۔

کہ می آید؟ چنیں یارب مگر مہ برزمیں آمد — چوگرداست اینگہ میخیز دکہ باجاں ہمنشیں آمد
کہ می راند جنیبت سواری راکہ میداں عنبرآگیں شد — کدامیں بادی جنبد کہ بوئے یاسمیں آمد
بتے وآفتِ تقویٰ وآخرایں نمی دانی — کہ درشہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

بہار آئی ہے۔عاشق باغ میں جاتا ہے۔مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں۔ قاصد کومعشوق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے۔سبزۂ لب جو۔اورعالم آب کی سیر قابل دید ہے۔قاصد سے یہ بھی کہدیا ہے کہ ادھراُدھر کی باتوں میں ٹالنا چاہے تو نہ ماننا۔جس طرح ہوسکے ساتھ لانا۔اوراگر عالم مستی میں ہوتواسی طرح مست اُٹھالانا۔ان تمام خیالات کوتفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا۔

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش — وقتے مست[۱] خوش بہار کہ وقت بہار خوش
درباغ باترانۂ بلبل دریں ہوا — مستی خوش ست وبادہ خوش ست وبہار خوش
مائیم و مطربے و شرابے و محرمے — جامے بزید سایۂ شاخ چنار خوش
اے باد کاہلی مکن وسوے دوست رو — مارا بکن بہ آمدن آں نگار خوش
چیزے دگر مگوے ہمیں گوکہ درچمن — سبزہ خوش ست وآب خوش وجوئبار خوش
گرخوش کندترابہ حدثے کہ باز گرد — پیشش کن وبیاروشوز ینہار خوش
دربینیش کہ مست بود خفتنش مدہ — ہم ہمچنانش مست بہ نزدمن آرخوش
من مست خوش حریفی اویم کہ آں حریف — سرخوش خوش ست ومست خوش وہوشیار خوش
بااودراں زماں کہ منش[۲] راہ می دہد — بازی خوش ست وبوسہ خوش ست وکنار خوش
سروپیادہ خش بود اندر چمن ولیک — آں سرومن پیادہ خوش ست وسوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہیے؟اس کوتفصیل سے لکھتے ہیں۔

ہنگام گل ست بادہ باید — ساقی وحریف سادہ باید
گر غنچہ گرہ در ابرو افگند — پیشانی گل کشادہ باید
ساقی برخیز، وبیار نیشاں — کیں شستۂ وآں ستاردہ باید
وانگاہ حریف سادہ ومست — درچنگ من اوفتادہ باید

---

۱ وقت کسے خوش بودن۔دعائیہ جملہ ہے۔یعنی خدا ان کوخوش وخرم رکھے۔ ۲ طبیعت

بہار کا سامان

بوستاں جلوہ در گرفت اینک　　گل زرخ پردہ در گرفت اینک
آتش لالہ برفروخت زباد　　دامن کوہ در گرفت اینک
بلبل آمد نشست برسر گل　　بے نوا بود، زر گرفت اینک
غنچہ در پیش فاختہ زاصول[1]　　سبقے تازہ بر گرفت اینک
ورق غنچہ راکہ ترشدہ بود　　ورقش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے اس لئے چپک کر رہ گئے۔

آب راگرچہ چشم ہا پاک است　　بوستاں رابہ برگرفت اینک
طوطی آغاز شعر خسرو کرد　　روے گل در شکر گرفت اینک

جدّت

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ امیر خسرو کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں۔ اور یہ دعویٰ بدیہی دعویٰ ہے۔ ان کی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہو۔ چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

راز خون آلود خویش اے دل منہ بامن بروں
ایں ورق خام است حرف ازوے بروں خواہد گذاشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ۔ کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا۔

زلف او پہلوی خال لب او　　گوئی از شہد مگس می راند

نہ رود مہ براوج درشب تار　　تا رزلف تونرد باں نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا۔ جب تک تیری زلوں کی سیڑھیاں نہ لگائے۔ (چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)

ہست صحرا چوں کف دست و برداز لالہ جام　　خوش کف دستے کہ چندیں جام صہبا بر گرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے۔

دیدہ ام شاخ گلے برخویش می پیچم کہ کاش می توانسم بیک دست اینقدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی۔ اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے ہی پیالے، لے سکتا۔

غلام نرگس مستم کہ بامداد پگاہ قدح بدست گرفتہ زخواب برخیزد

گلستان نسیم سحر یافتہ است صبا غنچہ راخفتہ دریافتہ است

چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب کہ گویا یکے جام زریافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور یہ تشبیہ عام تھی۔ لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آ گیا ہے۔ ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔ اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں۔ اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے۔

میروی وگریہ مے آید مرا ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھ کو رونا آتا ہے اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے۔

مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اس لئے وہ جانا چاہے گا تو بارش ہوگی۔ اور وہ اس لئے کبھی نہ جاسکے۔

مے میان شیشۂ ساقی نگر آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ ساغر لالہ شراب کرد در گوشہ ہائے باغ بجئے دور ناب کرد

فراش باغ بارگہ خود بباغ زد وانگہ برآب خرگہ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب نخفت زفریاد بلبلاں بنہاد سربہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی

خیال بندی اور مضمون کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن کمال کی جدّت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے۔ غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے۔

غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا امیر خسرو کی ایجاد ہے اور انہیں پر خاتمہ بھی ہوگیا۔ متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں۔ لیکن اس کا دوسرا انداز ہے۔ وہ اور سلسلہ کی چیز ہے۔ چنانچہ آگے چل کر اس کی حقیقت کھلے گی۔

امیر خسرو کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں۔ مثالوں سے اندازہ ہوگا

به خانۂ توہمہ روز بامداد بود ــــ کہ آفتاب نیارد شدن بلند آں جا

تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے۔ کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہوسکتا

زلف تو بہ چراست؟ مانا[1] ــــ بسیار در آفتاب گشتہ است[2]

مشتبہ می شودم قبلہ زرویت چہ کنم ــــ کہ زابروے تو چشم بدو محراب افتاد

چشم مستِ تو کہ دی بر من بیتاب افتاد ــــ تو نیفکندی از آلودگی خواب افتاد

زبہر آں چنیں تاریک باشد خانہ چشم ــــ کہ ہرگز آفتاب من دریں روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست ــــ روز روشن چراغ نتواں کرد[3]

می روی وگریہ می آید مرا ــــ ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دل من بہ زلف درویت شد اسیر وچوں نگردد ــــ شب ماہتاب وروزے کہ بخانۂ درآید

زہے عمر دراز عاشقاں گر ــــ شب ہجراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کرلیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے۔

زلف ازاں می برد آں شوخ کہ شبہائے غم ــــ گر شود کو نہ ازاں جا بمہ پیوند کند

یعنی اپنی زلف وہ اس لئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہوجائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھادے۔

راہے است برائے بردنِ دل ــــ ابروے تو کز میاں کشاد است

---

[1] غالباً۔ [2] دھوپ میں پھرا ہے۔ [3] چراغ کردن۔ چراغ جلانا

یعنی تیری دونوں ابروؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے۔ اس لئے کہ دل لیجانے کے لئے راستہ رہے۔

زلف سروپا شکستہ زاں است   کز سرو بلندت اوفتاد است

یک شب زرخ خویش چراغیم کرم کن   تاقصۂ اندوہ توہم پیش تو خوانم

یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اس کی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں)

خانہ چشم من خراب شد است   کہ بہ بنیاد خانہ نم رفتہ است

کے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی   مگر کہ زندہ کنی خلق راو باز کشی

شکریں لعل تو کان نمک است   گرچہ شکر نہ مکان نمک است
آب روے تو ملاحت افزور   گرچہ از آب زیان نمک است

خواہی اے جان برو دخواہ بمن باش کہ من   مردنی نیستم امروز کہ جاناں اینجاست

آئینہ کرد، حسن وے از آسماں سوال   برخاست آفتاب و بہ زانو جواب کرد
(یعنی اس کے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا۔ آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے)

سرابروے توگردم گرہش بازکشائی   کہ کمانت نہ باندازۂ بازوی کسی است

ہر چند کہ زلف تو سپاہی است جہانگیر   زیں گونہ پریشان نتواں کرد سپہ را

بہ سایہ خفتہ بُدم من کہ بار آمد و گفت   چہ خفتۂ کہ رسید آفتاب درسایہ
اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے۔

ع۔ دردہا دادی دور مانی ہنوز۔

ع۔ یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم

امیر خسرو نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہم کو بڑا ڈر تھا کہ جو جال انہوں نے بچھایا اس میں خود نہ پھنس جائیں لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں۔ مثلاً فرخی وابن المعتز وغیرہ۔ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے۔

امیر خسرو اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں۔ تاہم ان کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہونچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آجائیں۔ صنعت طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں۔ ع

دردہا دادی دور مانی ہنوز

زبند دوجہاں آزاد گردم اگر تو ہمنشین بندہ باشی

من درویش را کشتی بغمزہ کرم کردی الٰہی زندہ باشی

گفتیم ناخوش چرائی خسروا! چوں کنم؟ آں شکل وآں بالا خوش است

بندہ را در غم تو نیست خبر ہمہ یار ان بندہ را خبر است

خرسالے بمن کند بیداد اے بزرگاں شہر داد دہے

عربیت

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امیر خسرو کو عربی علم وادب میں کمال تھا اور اس فن کی نادر کتابیں ان کے حافظہ میں مخزون تھیں۔ تاہم ان کو اس فن میں دعویٰ نہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعتراف عجز کے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ اشعار یہ ہیں۔

ذاب الفوادوسال من عینی الدم وحلی الدوامع کل ماانا اکتم

دل پگھل گیا۔ اور آنکھوں سے خون بہا اور آنسوؤں نے وہ سب کہہ دیا جو میں

چھپاتا تھا

واذابحت لدیے الورے کرب النوی　　بتکی الاحبة والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے

یاعازل العشاق، وعنی باکبا　　ان السکوت علی المحب، محرم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے۔

من بات مثلے فھویدر خلیلتے　　طول اللیالی کیف بات میتم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے۔

اعجاز خسروی میں۔ عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں۔ جن سے اُن کی عربیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں۔ لیکن یہ اس زمانہ کا عام انداز تھا۔ تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا۔

وان فالامن غزیة ان غوت　　غویت وان ترشد غزیته ارشد

میں بہر حال قبیلہ غزیّہ کا آدمی ہوں۔ غزیّہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ ہے تو میں بھی ہوں۔

صنائع وبدائع

امیر خسرو نے صنائع وبدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں اگرچہ کون کندن وکاہ برآوردن ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے کہ ان کی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے۔ ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے۔

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں۔ لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اس لئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ مثلاً صنعت منقوطہ یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو۔ امیر خسرو نے اس

قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں بعض فارسی میں تھیں۔ لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص نہ لکھ سکا۔ امیر خسرو نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں اُنہوں نے تصرفات کیے۔ اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں۔ چنانچہ ہم اُنہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں۔

دوُ رو

یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ لفظوں کے رد و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور بامعنی ہو۔ امیر نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں۔ لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسید، بدیدی، مرا، دی، نجانے زمانے بباشی، بہ یاری بشانی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ کل تو آیا اور تو نے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا۔ ایک ذرا ٹھہر جا۔ تو دوستی کرنے کے قابل ہے لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں۔

رشید، ندیدی، مرادی نجاتے رومانی بیاس بتادی نسائے

''تو میرا ہدایت یافتہ ہے، بے نظیر ہے، میری مراد ہے، میری نجات ہے۔ مجھ کو اس بات نے ناامید کیا کہ عورتیں باہم لڑتی ہیں۔

قلب اللسانین

بہت اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں۔ لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے۔ مثلاً

بسی با کامرانی در جہاں باش۔
می باش بکار شادمانی۔
بای یاد ما کہ کارمی کینم بہم
دوست ما یار منی بہ یاری ما آئی۔
بکن داد و بکشو و کامراں باش۔

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے۔

وصل الحرفین

یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے بلکہ دو دو یا تین تین حرف کا لفظ ہو مثلاً:۔

چاکر، خاصہ، شرقانی، سرخدمت، برپایت می مالد، ومی گوید، کہ بدیں جانجا طرما با فرحت قریں می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما نامہ فرماید۔ تا ہر خوشی کہ برماست فرخی کامل باید۔

یہ اس صنعت کا نقیض ہے جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً:۔

در، دور، دوار، آورد، روداد، واری، دراری، دوّار، ذات واور دوران را۔ الخ۔

امیر نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

اربعۃ الحرف

اس صنعت پر امیر کو بہت ناز ہے۔ کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف، ہ، واو، یے کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے۔ یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں۔ لیکن جو عبارت لکھی ہے۔ وہ بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنۃ والشفا

اس صنعت پر بھی ان کو ناز ہے۔ اس میں ایسے الفاظ جمع کیے ہیں کہ سطروں کی سطریں پڑھتے جاؤ لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمۃ اللفظ

یہ صنعت بھی خاص ان کی ایجاد ہے۔ اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے۔ سا کے بعد کا لفظ۔ دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے مثلاً

یہ فارسی مصرع ہے۔ لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو ''مارا'' ہوگا۔ اس لئے مصرع اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے۔

محتمل المعانی

ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے سات معنی ہیں اور ہر معنی وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں۔

موقوف الآخر

ایک رباعی لکھی ہے۔ جس کا ہر قافیہ دوسرے مصرعہ کے آغاز کا محتاج رہتا ہے مثلاً۔

در حسن ترا کسے نماند الا　　　خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند وپائے تو بوسد، اتا　　　بنی تو بسوے او چو پا بوسد تا

انہی صنعتوں اور بیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں۔ اگر کسی صاحب کو امیر خسرو سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں۔

☆☆

حیات خسرو

جس میں

طوطیٔ ہند امیر خسرو علیہ الرحمۃ المتوفی ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء کے

سوانح عمری۔ تصنیف وتالیف۔ ایجاد واختراع کے مفصل حالات اور

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین محمد بدایونی قدس سرہٗ کے مختصر واقعات

بطور ضمیمہ درج ہیں

مؤلفہ

منشی محمد سعید احمد مارہروی

نذر

بعالیخدمت عالیجناب نواب وقارالدولہ وقارالملک مولوی محمد مشتاق حسین صاحب خان بہادر انتصار جنگ میں نہایت ادب سے اپنی اس ناچیز تالیف کو جناب والا کے نامِ نامی پر نذر کرتا ہوں۔ اس حقیر تالیف کو جنابِ والا کے نام نامی سے منسوب کرنے میں نہ تو جنابِ والا کی اُس خداداد عزت اور شہرت میں جو بفضلہٖ تعالیٰ اس وقت حاصل ہے کوئی بیشی ہو سکتی ہے۔ نہ یہ نذر کسی ستائش تمنا یا صلے کی توقع کے خیال سے ہے۔ بلکہ محض اس خیال سے ہے کہ میری قوم میں جناب والا علاوہ دیگر اوصافِ حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے سب سے زیادہ علمی معاملات میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ پس آپ سے فخرِ قوم کے نامِ نامی کی برکت سے مجھے امید قوی ہے کہ ان اوراقِ پریشاں کو قبولیت کا مرتبہ حاصل ہوگا۔

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

خاکسار محمد سعید احمد مارہروی

خدا را کُنم بر سرِ نامہ یاد
کہ بر بندہ درہائے معنی کشاد

(امیر خسرو)

دیباچہ طبع ثانی

رمضان ۱۳۲۲ ہجری میں حیات خسرو کو میں نے ایک ماہ کے عرصے میں تالیف کر کے چھپوایا تھا۔ اُس وقت کئی کتابیں باوجود تلاش بسیار مجھے دستیاب نہیں ہوئیں تھیں۔

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمتہ کے شجر کمال کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اُن کی سوانح عمری لکھنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ محض حسن عقیدت کے جوش نے مجھے اس دشوار گذار راستے پر قدم رکھنے کی ہمت دلائی تھی مگر افسوس کہ بے بضاعتی کی وجہ سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ اور سوانح عمری تو کیا معمولی حالات بھی جمع نہ ہو سکے۔

اُردو زبان میں کسی کتاب کا دوبارہ طبع ہونا معراج کمال سے کسی طرح کم نہیں سمجھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ اب تک طبع ثانی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب مخدومی شیخ غلام محمد صاحب مینجنگ ڈائرکٹر وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرتسر کی توجہ سے اس کتاب کے طبع ثانی کا وقت آیا۔ اس مرتبہ بہت سے جدید حالات اضافہ کئے گئے ہیں جو امید ہے کہ دلچسپی سے دیکھے جاویں گے۔ اس بات کا افسوس رہا کہ اس مرتبہ بھی حضرت امیر خسرو کی کئی تصنیفات مثل آئینہ اسکندری دیوان غرۃ الکمال وغیرہ کا کہیں پتہ نہیں ملا ورنہ ممکن تھا کہ ان سے کچھ اور زیادہ معلومات حاصل ہوتی۔

سعید مارہروی، آگرہ

۲۲ شعبان ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۹۰۸ء

يَافتّاحُ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

سبحان اللہ والحمد للہ ولاالٰہ الااللہ واللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم. سبحانک لاعلم لنا لاماعلمتنا ولامعرفۃ الاما الھمتنا انک انت العلیم الحکیم. وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہٖ واصحابہ وازواجہ اجمعین. برحمتک یاارحم الراحمین

آج کل اہل یورپ ہر قسم کے علوم وفنون میں ترقی کرتے ہوئے آسمانِ کمال پر پہنچتے جاتے ہیں۔ ان کی علم کی قدردانی کا یہ حال ہے کہ وہ ہزاروں لاکھوں روپے صرف کر کے نہ صرف اپنے بلکہ دیگر مشرقی لوگوں کے مصنفوں، مؤلفوں، صناعوں، مصوروں اور دیگر اہلِ کمال لوگوں کے حالات زندگی نہایت تلاش وجستجو سے بہم پہنچا کر ان کو حرز جاں بناتے ہیں اور ان سے سبق حاصل کر کے ترقی کے معراجِ کمال پر پہنچتے جاتے ہیں۔ وہ نامور شعرا اور مصنفوں کی یادگاریں قائم کر کے ان کے یادگار کی چیزوں کو نہایت عزت وافتخار کے ساتھ بطور تبرک بڑے بڑے عجائب خانوں میں رکھتے ہیں۔ ان کے جائے پیدائش کے نقشے اتار کر اُن سے جنتریوں اور کتابوں کے اوراق کو مزین کرتے ہیں۔ ان کی یادگار میں اُن کی پیدائش کے دن میلے قائم کرتے ہیں۔ انگلستان میں وہاں کے مشہور ڈرامانویس شیکسپیر کی پیدائش کے دن ہر سال میلہ ہوتا ہے۔ جس میں اس فاضل کی وہ چوکی جس پر وہ ایام زندگی میں بیٹھا کرتا تھا بطور تبرک اور عجیب شے کے پیش کی جاتی ہے اور ہزاروں لوگ دور دور سے اُسے دیکھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اسی طرح مدت سے مشہور شاعر عمر خیام کی یادگار میں ایک کلب قائم ہے جس میں اس صاحبِ کمال کی رباعیات نہایت ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں اور انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ان کی رباعیات کے متعدد ترجمے شائع کئے گئے ہیں۔ مشہور ومقبول مصنف لارڈ مکالے کے دس دس جگہ کاٹ چھانٹ کئے

ہوئے مسودے نہایت اعزاز سے آج تک لندن میوزیم (عجائب خانہ) میں رکھے ہوئے زیارت گاہ خاص وعام ہیں۔ اسی طرح فریرا (اٹلی کے شمالی حصے میں ایک مقام ہے) کے مشہور مصنف اریسٹو کے آٹھ آٹھ جگہ کاٹے ہوئے مسودے نہایت عزت سے اب تک محفوظ رکھے گئے ہیں۔

برعکس اس کے مسلمان جو آٹھویں صدی ہجری تک علمی سرمایوں پر تنہا قابض تھے اور جن کے ہادی برحق کا یہ ارشاد ہے اذکرو محاسن موتاکم یعنی اپنے مُردوں کی خوبیاں بیان کرو۔ آج کل ایسے خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں کہ کسی طرف توجہ نہیں کرتے اور روز بروز قعرِ مذلت میں گرتے جاتے ہیں۔ ہمارے اس خواب غفلت لاپرواہی خود مطلبی سے ہمارے سیکڑوں ہزاروں مشاہیر کے حالات گوشۂ گمنامی میں ایسے ناپید ہو گئے کہ قیامت تک ان کا پتہ چلنا مشکل ہے۔ بقول شیخ سعدی ؎

بس نامور بزیر زمین دفن کردہ اند ۔۔۔ کز ہستیش بروے زمیں یک نشاں نماند

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نہایت دلسوزی سے تحریر فرماتے ہیں۔

میرے دوستو! زندگی کے معنی کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سورہنا، اور منہ سے بولے جانا نہیں ہے۔ زندگی کے معنی یہ ہے کہ صفات خاص کے ساتھ نام کو شہرت ہو۔ اور اسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو۔ کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں۔ انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آویں اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم رہیں۔ اُن کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر اُن کے اہل وعیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے۔ جس سے ان کے کمال مرجائیں گے اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غمناک ہے۔"

ہماری اس لاعلمی سے روز بروز بزرگانِ سلف کی عظمت ہمارے دلوں سے کم ہوتی جاتی ہے۔ ایک انگریزی مصنف کا قول ہے "کہ وہ قوم کبھی آئندہ ترقی کی امید نہ رکھے جس کو اپنے گذشتہ عظمت پر ناز نہیں ہے" بڑے بڑے فضلا کا اس امر پر اتفاق ہے کہ گذشتہ مشاہیر قوم کے کارنامے افسردگانِ قوم کے ولولے بڑھاتے ہیں۔ گذشتہ مصائب سے نصیحت اور عبرت حاصل کرنا ترقی اور بہبودی کی جڑ ہے۔ بزرگوں کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاق

پسندیدہ ہم کو سکھاتے ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگی اسی طرح اعلیٰ بنا سکتے ہیں۔ اُن کی تصنیفیں، تالیفیں ان کی زندہ یادگاریں دنیا میں موجود ہیں اور اگر ہم چاہیں تو اُن سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔

نہ سعدی و نہ فردوسی در جہاں باقی ست　　ولے مناقب و ذکرِ سخنوراں باقی ست
کجاست خسرو[1] پرویز جاہ و شوکت او　　نہ طاقدیس[2] و نہ گنجِ شائیگاں[3] باقی ست

کیا یہ افسوس کی بات نہیں تھی کہ ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی زبان یعنی اُردو میں ہندوستان کے بلبل ہزار داستان فخر الشعراء اعلم علماء صاحبِ اختراع و ایجاد امیر خسرو دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی موجود نہ تھے۔ یہ صاحبِ کمال جس کا نامِ نامی آفتاب کی طرح روشن اور جن کی تصنیف و تالیف اور کلام معجز نظام کسی تعریف و توصیف کا محتاج نہیں ہے، دماغ انسانی کے کمالات کا ایسا اعلیٰ نمونہ تھا جو عام نہیں ہے۔ یہی نہیں کہ وہ ہندوستان کی پرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری کے دربار کے ایک اعلیٰ رکن تھے۔ نہ صرف انہوں نے حسن و عشق ہی کے میادن میں کمال دکھایا ہے بلکہ کمالات انسانی کے ہر میدان میں قدم مارا ہے۔ ان کی تصنیف و تالیف اور حالاتِ زندگی طالبان نصیحت کے لئے ناصح مشفق۔ اہلِ نظر کے لئے بصیرت۔ غافلوں کے لئے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا آلہ۔ مردہ دلوں میں جان ڈالنے کے لئے دمِ عیسیٰ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

اس باکمال کی سوانح عمری میں جو علمی اور اخلاقی خوبیوں سے مرصع ہے۔ یہ امر بھی نہایت دلچسپ ہے کہ اقلیم تصنیف و تالیف میں ہماری زبان اُردو کی عالیشان عمارت کا بنیادی پتھر اسی صاحبِ کمال کے مبارک ہاتھ سے رکھا گیا تھا۔

"میں اِن پراگندہ اوراق میں اس برگزیدہ روزگار کے یہ نامکمل حالات پیش کرتا ہوں اور سچے دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میری علمی استعداد ہرگز اس قابل نہیں کہ ایسے باکمال کے کمالات کا حال لکھ سکوں۔ نہ میں شاعر ہوں کہ اُن کے نکات شاعری کا اظہار کر سکوں۔ محض جوش عقیدت میں مجذوب کی بڑ کی طرح یہ حالات لکھ مارے ہیں ورنہ ان کے اوصاف و کمال کا حال وہی لکھ سکتا ہے جو ویسا ہی صاحبِ کمال ہو۔

ہو جو اُس جیسا تو وصف اس کا لکھے　　آج اس جیسا مگر پیدا کہاں

---

[1] نام شاہ عجم۔ [2] نام تخت خسرو پرویز۔ [3] نام خزانہ خسرو پرویز۔

قدرداں ناظرین کی خدمت میں بصد عجز التماس ہے کہ کوئی مضمون، کوئی کتاب، کوئی علم ایک مصنف یا مؤلف کے بیان میں محصور نہیں ہوسکتا اور کتب تاریخ کا اختلاف بھی تو اُس کو دامنِ عفو میں چھپا کر از ارہِ ہمدردی مطلع فرمائیں اور اس خاکسار کو انگشت نمانہ فرمائیں۔ بقول شیخ سعدی علیہ الرحمۃ ؎

تو نیز ار بدی بینی اندر سخن　　　بخلق جہاں آفریں کارکن

اور جن صاحبوں کو کوئی مضمون پسند آوے تو اسے محض تائیدالٰہی سمجھ کر شکر خداوند کریم کا بجالاویں اور مجھ گنہ گار عاجز و شرمسار کے حق میں دعائے خیر اور سلامتی ایمان کی فرماویں۔

رباعی

از خاطرِ حق پذیرِ یاراں　　　یک فاتحہ التماس دارم
تا کار شکستہٗ برآید　　　آں دامنِ شاں نمے گذارم

اب میں نہایت صدق دل سے اپنے مخدوم جناب مولوی محمد وارث علی صاحب سابق ایڈیٹر اخبار اسلام آگرہ صاحبِ شمس التواریخ و سانحہ کربلا وغیرہ کا جن کی ادنیٰ توجہ سے بقول حضرت امیر خسروؒ ؎

شمعِ من یافتہ ضیا دے　　　نفس من کشتہ کیمیا ازوے

اور جناب مولوی محمد معین الدین صاحب اکبرآبادی سرشتہ دار کلکٹری متھرا اور جناب منشی محمد طٰہٰ صاحب مارہروی اور جناب منشی محمد عابد علی صاحب ایٹھوی اور جناب منشی محمد عزیز الدین صاحب فتحپوری کی اس امداد کا جو انہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں مجھے دی ہے تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور بارگاہِ خداوند قدیر میں دست بدعا ہوں کہ اس ناچیز کتاب کو قبولِ عام کا درجہ نصیب ہو اور اس کے پڑھنے اور سننے والوں کو سعادت دارین حاصل ہو۔ آمین وافوض امری الی اللّٰہ ان اللّٰہ بصیرٌ بالعباد۔

یکم رمضان ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۹۰۳ء　　بندۂ گنہگار امیدوار مغفرت پروردگار

محمد سعید احمد ابن مولوی محمد سلطان احمد

ساکن مارہرہ ضلع ایٹہ۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

☆☆

باب اوّل

حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کے بزرگ، پیدائش اور بچپن کے حالات

سنہ ہجری کی ساتویں صدی کے شروع میں جبکہ چنگیز خانی مغلوں کے ظلم وستم اور کشت وخون کے سیلاب نے اسلامی دنیا کو تہ وبالا کر رکھا تھا اور اس خونخوار انقلاب سے بچنے کے واسطے سیکڑوں ہزاروں اعلیٰ وادنیٰ اسلامی خاندان اپنے پیارے ہم وطن املاک کو خیر باد کہہ کر نہایت پریشانی اور بدحواسی سے بھاگتے پھرتے تھے۔ ترکوں کے ایک نامی سردار امیر سیف الدین محمود نے سرزمینِ ہند میں قدم رکھا اور قصبہ مومن آباد میں جو اب پٹیالی کے نام سے موسوم اور ضلع ایٹہ میں گنگا کے کنارے واقع ہے، سکونت اختیار کی۔

اس زمانہ میں ترک سکونت اور تبدیل وطن کرنا بہت دشوار اور ناممکن امر خیال کیا جاتا ہے لیکن جس زمانہ میں کہ مسلمانوں کے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا اور ان کی سلطنت کا پھریرا ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں اور بعض حصص یورپ پر لہرا رہا تھا وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں تبدیل وطن کرنا ایسا ہی آسان سمجھتے تھے کہ جیسے آج ہم دخانی انجن کی بدولت ہندوستان میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانا آسان سمجھتے ہیں۔

امیر سیف الدین محمود کے حالات صرف اس قدر معلوم ہیں کہ وہ ترکوں کے قبیلے لاچین کے سردار اور اُمرائے ہزارہ بلخ سے تھے اور قریش کے اطراف میں رہتے تھے۔

اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندوستان کو امیر سیف الدین محمو کی میزبانی کا فخر مغلوں کے ظلم وستم کی وجہ سے حاصل ہوا یا اس جنت نشان کی سرسبزی وزرخیزی اور مہمان نوازی کی عظیم الشان شہرت نے اپنی کشش مقناطیسی سے اس صاحب کمال کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بہر حال جو کچھ وجہ ہو۔ ہندوستان نے اپنے عزیز مہمان کو سر آنکھوں پر لے کر نصیبے کی یاوری

سے شاہی دربار تک پہنچادیا۔ دہلی کے تخت پر اُس وقت سلطان شمس الدین التمش[۱] رونق افروز تھا۔ اس قدر دان اور کمال پرور سلطان نے امیر سیف الدین محمود کی خداداد قابلیت اور پسندیدہ اوصاف کو بہت جلد اپنے امراء کی سلک میں منسلک فرمایا۔

امیر سیف الدین محمود نے ہندوستان میں نواب عماد الملک[۲] کی دختر نیک اختر سے جو علم وفضل سے موصوف اور زیور صلاح وتقویٰ سے آراستہ وپیراستہ تھیں شادی کی اور اس عفیفہ کے بطن سے اوّل اعز الدین علی شاہ اور ان کے بعد حسام الدین احمد پیدا ہوئے اور ۶۵۳ھ[۳] ۱۲۵۵ء میں بمقام پٹیالی اُس صاحب کمال نے عالم ارواح سے کشور اجسام میں قدم رکھا جسے علم وفضل کے عالیشان دربار سے خسروِ اقلیمِ سخن کا خطاب عطا ہوا اور اس کی فصاحت وبلاغت تصنیف وتالیف نے اس کو بقائے دوام کے دربار میں معزز جگہ عطا فرمائی۔

امیر سیف الدین محمود نے اپنے نومولود فرزند کا نام ابوالحسن رکھا جو اس خسروِ اقلیمِ

---

۱ سلطان شمس الدین التمش دہلی کے نیک نام بادشاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اسی باعظمت بادشاہ کے واسطے ۶۲۶ھ ۱۲۲۸ء میں عباسی خلیفہ نے مصر سے خلعت اور القاب بھیجا تھا اس کی خوشی میں بادشاہ نے تمام شہر میں آرائش کی اور خوب جشن منائے۔ ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء میں یہ بادشاہ تخت نشین ہوا اور ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء کو وفات پائی۔

۲ نواب عماد الملک فاضل کامل بلکہ امع الکمالات بزرگ تھے۔ ان کا شمار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے کمالات صوری ومعنوی کے ساتھ امارت خاندانی کا بھی جوہر رکھتے تھے۔ امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی صفت دیباچۂ دیوان غرۃ الکمال میں تحریر فرمائی ہے۔ آپ کا مکان دہلی قدیم میں لاہوری دروازے کے قریب تھا۔ حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ نے بعد واپسی اجودھن کے اوّل اسی مکان کے قریب قیام فرمایا تھا۔ یہ موقع اب درگاہ حضرت قطب صاحب کے قریب بی بی نور کے مقبرہ کے متصل واقع ہے۔

۳ امیر خسروؒ کے سنہ پیدائش میں موخروں نے اختلاف کیا ہے لیکن امیر خسروؒ قران السعدین میں جو ۶۸۸ھ کی تصنیف ہے اپنی عمر ۳۶ برس تحریر فرماتے ہیں۔ جس کے حساب سے ۶۵۳ھ صحیح نکلتے ہیں۔

انچہ بتاریخ زہجرت گذشت — بود سنہ شش صد وہشتاد دہشت
سال من امروز اربرسی — راست بگویم ہمہ شش بودی

سخن کے تخلص خسرو کے آگے مشہور نہ ہوا البتہ خاندانی خطاب کا خوشنما طرّہ مزیّن کر کے امیر خسرو کر دیا گیا۔

منقول ہے کہ امیر سیف الدین محمود کے مکان کے قریب ایک مجذوب صاحبِ حال رہتے تھے۔ جس وقت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ آپ ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر ان مجذوب کی خدمت میں لے گئے۔ امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھتے ہی ان مجذوب نے فرمایا کہ یہ لڑکا عارف باللہ اور یگانہ روزگار ہوگا۔ قیامت تک اس کا نام یاد رہے گا۔ اور دو قدم خاقانی سے آگے بڑھ جائے گا۔ اس کے بعد دعا دی کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہر دلعزیز کرے[1]۔

چار برس کی عمر تک امیر خسرو رحمت اللہ علیہ نے نہایت ناز و نعمت سے پٹیالی میں پرورش پائی۔ اس کے بعد اپنے والد ماجد کے ہمراہ دہلی تشریف لائے۔ ان کے بچپن اور تعلیم و تربیت کے حالات صرف اس قدر معلوم ہوئے ہیں کہ آٹھ برس کی عمر تک اپنے باپ اور بھائیوں کی صحبت میں جو زیورِ علم اور لباسِ فضل و کمال سے آراستہ اور صفاتِ حمیدہ سے موصوف تھے تحصیل علم و کمال کرتے رہے۔ جب نویں برس میں قدم رکھا شفقتِ پدری کا مبارک سایہ سر سے اُٹھ گیا یعنی امیر سیف الدین محمود نے جن کی عمر اس وقت پچاسی برس کی تھی کسی لڑائی میں کفار کے ہاتھ سے شہادت پائی۔

بنی نوع انسان کے وہ افراد جنہیں صانع قدرت صفتِ کمال سے موصوف کرتا ہے ابتدائے عمر ہی سے اپنے ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں ہندی میں مثل مشہور ہے۔ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' چنانچہ امیر خسروؒ کی رسائی ذہن اور طبیعت کی برّاقی کا اِس عمر ہی میں یہ حال تھا کہ جس وقت انہیں اپنے والد ماجد کی شہادت کا حال معلوم ہوا اُن کے مرثیہ میں فوراً یہ بیت موزوں کی ؎

سیف از سرم گزشت و دلِ من دو نیم ماند
دریائے ماروان شدد دُرِّ یتیم ماند

امیر سیف الدین محمود کی شہادت کے بعد اُن کے بڑے بیٹے اعز الدین علی شاہ اُن کے قائم مقام ہوئے۔ لیکن امیر خسروؒ کی تعلیم و تربیت اُن کے صاحب کمال نانا نواب

---

[1] خزانہ عامرہ۔ مونس الارواح۔ تذکرۃ الاولیائے ہند۔ سیر الاولیا۔

عماد الملک نے جن کی عمر اُس وقت ایک سو تیرہ برس کی تھی نہایت شفقت سے اپنے ہاتھ میں لی اور اس قدر توجہ اور التفات آپ کی طرف مبذول فرمائی کہ بہت تھوڑی مدّت میں انہوں نے جملہ علوم عقلی و نقلی میں جو اُس عہد میں مروّج تھے سند فضیلت حاصل کی۔ اور فضلائے عہد میں شمار ہونے لگے۔

حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پہلے دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں اپنی ابتدائی شاعری کے دلچسپ حالات لکھے ہیں جن کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

"بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایت ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی۔ فضلاء اور بلغاء روزگار اُن کو سن کر تعجب کرتے تھے۔ اُن کے تعجب سے میرا شوق اُبھرتا تھا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم تھا کہ کثرت شوق کے اثر سے شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مثل قلم سرنگوں رہتا تھا اور رات کو مطالعہ میں مصروف یہاں تک کہ نظر میں دقّت پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کا امتحان لیتے تھے۔ امتحان سے میرا دل گرماتا تھا۔ اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اس وقت تک کوئی استاد نہ ملا تھا جو دقایق کی راہ بتاتا۔ قلم کو بے راہ روی سے روکتا۔ نقائص کو دور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نوآموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینے کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشق سخن کرتا تھا اور سخن سنجی سیکھتا تھا۔ اسی طرح آہن دل کی صیقل گری اپنی ہی قوتِ بازو سے کرتا رہا۔ اُستادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا۔ حتّٰی کہ مذاق لطفِ کلام ذوق سخن سے آشنا ہوا۔ انوری و سنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا۔ جو عمدہ نظم نظر آتی اس کا جواب لکھتا۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتا اسی کے انداز پر شعر کہتا۔ ایک عرصے تک خاقانی کے دامن دولت سے لپٹا رہا۔ جو الفاظ اُس کے کلام میں مغلق تھے اُن کی تعلیق کی (یعنی نوٹ لکھے) اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم مقتضائے نوعمری کما حقہ حقایق کلام واضح نہیں ہوتے تھے ہر چند میری ہمت آسمان پیما تھی لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی۔ بایں ہمہ عاقبۃ الامر اُستاد کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی چونکہ میرے کلام کا کوئی خاص مرجع نہ تھا ہر اُستاد کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس لیے اس مجموعہ میں

متقدمین اور متاخرین سب کا رنگ موجود ہے۔

حاصل کلام میرے والد نے تحصیل علم کے واسطے مجھے مکتب میں بٹھایا۔ یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کی تکرار تھی۔ میرے اُستاد مولانا سعد الدین خطاط مشق خط کی تاکید کرتے تھے میں اپنی ہی دُھن میں تھا۔ وہ پیٹھ پر دُرّے لگاتے تھے مجھ کو زلف وخال کا سودا تھا، انتہا یہ کہ اُسی سن میں وہ شعر و غزل کہنے لگا جس کو سن کر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے اُستاد کو خواجہ اصیل نائب کوتوال نے خط لکھنے کے واسطے بُلایا۔ میں دوات قلم لے کر ہمراہ ہوا اُس عزیز کے گھر میں خواجہ عزیز الدین کالوگلاتی نظر بند تھے۔ خواجہ موصوف عالم متبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مطالعہ کتاب میں مصرف تھے اثنائے مطالعہ میں جب وہ کسی مضمون پر گفتگو کرتے تھے تو اُن کے مُنہ سے موتی جھڑتے اور جواہر آبدار زبان سے نکلتے۔ میرے اُستاد نے ان سے کہا کہ یہ میرا ذرا سا شاگرد اس بچپن میں نظم کا بے حد شائق ہے۔ شعر پڑھتا بھی خوب ہے۔ کتاب اس کو دیکر امتحان لیجئے۔ خواجہ عزیز نے فوراً کتاب مجھ کو دے کر سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اشعار ترنم آمیز لہجہ میں پڑھنے شروع کئے۔ اُس کے اثر سے آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ہر طرف سے تحسین کی آواز آنے لگی۔ پھر میرے استاد نے کہا کہ اب پڑھنا سن لیا کوئی بیت پیش کر کے جودت طبع کی آزمائش کیجئے۔ خواجہ موصوف نے چار غیر متناسب چیزوں کے نام لے کر کہا کہ ان کو نظم میں موزوں کرو۔ وہ نام مو۔ بیضہ خربزہ اور تبر تھے۔ میں نے اسی جلسہ میں یہ رُباعی موزوں کر کے سُنائی۔

ہر مُوے کہ درد و زلف آں صنم است	صد بیضۂ عنبریں براں موئے صنم است
چوں تیر بداں راس دلش راز برا کہ	چوں خربزہ دندانش وردنِ تنم است

جس وقت میں نے یہ رباعی پڑھی خواجہ نے بہت ہی آفرین فرمائی اور نام پوچھا۔ میں نے کہا خسرو: باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا لاچین کہا لاچین ترک خطا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بے خطا ترک ہے۔ دریافت کیا کہ تم درم خریدہ ناصری (اشارہ بجانب سلطان ناصر الدین) ہو۔ عرض کی سلطانی شمس (اشارہ بجانب سلطان شمس الدین شمسی) ہوں (سلطانی اشرفی کو کہتے تھے۔ درم خریدہ کی کیسی رعایت ہے) فرمایا کہ چونکہ تمہاری نسبت سلطانی ہے لہٰذا سلطانی اپنا

تخلص رکھو۔ اس کے بعد بہت سی باتیں میرے دل بڑھانے کی کیں اور فن کے متعلق بہت سی باتیں تلقین فرمائیں جن کو میں دل میں رکھتا گیا۔ اس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا۔ اس دیوان میں یہ سکّہ بہت رائج ہے۔ اس کے بعد باریک مضامین کے پیچھے پڑا۔[1]

امیر خسرو کی شاعری کا فخر خواجہ شمس الدین[2] خوارزمی کو بھی اس لحاظ سے حاصل ہے کہ انہوں نے آپ کی مشہور تصنیف پنج گنج کی اصلاح فرمائی ہے۔ دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ اور پنج گنج کے آخری گنج یعنی مثنوی ہشت بہشت میں حضرت امیر خسروؒ نے آپ کے علم و فضل کی بہت کچھ تعریف کرکے اُن کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے، جس کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

---

[1] از انتخاب مخزن (مترجمہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

[2] خواجہ شمس الدین خوارزمی فاضل متبحر اور علمائے کبار سے تھے اور شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ سلطان ناصر الدین محمود شاہ کے عہد (۶۴۳ھ ۱۲۴۵ء بغایت ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء) کے سب سے بڑے عالم اور شاعر مشہور تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے عہد کے آخر زمانے میں ان کو شمس الملک کا خطاب عطا فرما کر اور صوبہ بنگال کا میر منشی کرکے اپنے بیٹے نصیر الدین بغرا خاں کے پاس بھیجدیا تھا۔ تاج الدین سنگریزہ نے اُن کی مدح میں فرمایا ہے ؎

شمسا کنوں بکامِ دلِ دوستاں شدی — فرماں دہِ ممالکِ ہندوستاں شدی

قبل خدمت سلطانی کے یہ طلباء کے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور ایک حجرہ مطالعہ خاص کے واسطے مخصوص کر رکھا تھا۔ تین شاگرد خاص جو صاحبِ استعداد ہوتے تھے وہ اس حجرہ میں مولانا سے سبق پڑھتے تھے بقیہ شاگرد باہر تعلیم پاتے تھے۔ بڑے بڑے بزرگ اور اولیاء اللہ مثل حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ اور مُلّا قطب الدین ناقلہ اور ملّا برہان الدین عبدالباقی کی استادی کا فخر آپ کو حاصل تھا نمونہ کے طور پر آپ کے اس مقدس قصیدے سے جو سلطان ناصر الدین محمود کی مدح میں لکھا ہے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ایں ہمہ کارِ دلم از توبہ نادانئے خام — دادۂ دوشِ مرا وعدہ مہمانی خام
پختہ کردم ہمہ شب چشم ندانستم کاں — طمعے بود ازاں گونہ کہ ے دانی خام
شاہ محمود شہ سلطاں کہ از وفرِ پدر — دیگ درآز دلیش نیس ز سلطانی خام
خسرو، شمس وبیراست قوی پختہ سخن — نیست چوں دفتریاں سوختہ دیوانی خام
ہست آویختہ شعرش چو زر پختہ و نیست — سخنش چوں سخنِ پختۂ خاقانی خام
پختہ کردست فلک بہر تو ملکت یارب — پختۂ او بہ کرم باز نہ گردانی خام

(علم وفضل کی تعریف وتوصیف کے بعد تحریر فرماتے ہیں)

نورِ دل چوں بہ عالم افگندہ — سایہ برکارِ من افگندہ
من بدو عرض کردہ نامۂ خویش — او بہ اصلاح راند خامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم — رنج بر خود نہاد منّت ہم
ایں دقائق کہ شد زمغزش پوست — مو بمو شعر بیز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا ازوے — نفس من گشتہ کیمیا ازوے
ہرچہ اوگفت من نہادم گوش — برکشیدم مگس زشربتِ نوش
وانچہ نمود من نجستم پے — عیبِ آں بر من ست نے بروے
صد ہزار آفریں برآں دل پاک — کہ بروں برُد زیں چمن خاشاک
آنچہ او دید بس نہایت دید — خس وخارے زگلشنے برچید
رب اوچوں بہ پنج نامۂ من — برو بیروں خطائے نامۂ من

نامۂ اوکہ ہرزجانش باد
درقیات خطہ اومانش باد

☆☆

باب دوم

امیر خسرو کا حضرت سلطان المشائخؒ کا مرید ہو کر صوفیانِ صافی دل کے زمرے میں شریک ہونا اور اس کے متعلق دیگر حالات۔ اور عشق ومحبت کا دلچسپ اور دلفریب مرقع

جب امیر خسروؒ علم وفضل کے کمالات ظاہری سے فیضیاب ہو چکے تو نوشدا روے حقیقت یعنی کمالاتِ باطنی کے حصول کا شوق دامنگیر ہوا اُس وقت دہلی میں حضرت سلطان[1] المشائخ رحمتہ اللہ علیہ کی ہدایت وارشاد کا بازار گرم تھا اور ان کے انفاس متبرکہ سے فیض وبرکت کے چشمے جاری تھے۔ جس سے ایک عالم سیراب ہو رہا تھا۔ امیر خسروؒ بھی نہایت صدق دل سے حضرت سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے چشم بصیرت سے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ تیری پیشانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے گلشن ولایت سے تجھے نفع پہنچے گا۔ یہ سن کر امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ فوراً شرف بیعت سلطان المشائخؒ سے مشرف ہو کر زمرۂ مریداں جاں نثار میں شامل[2] ہوئے۔ امیر خسروؒ خود فرماتے ہیں ؎

۱؎ سلطان المشائخؒ سے مراد حضرت محبوب الٰہی نظام الدین محمد بدایونی قدس سرہ سے ہے کل کتاب میں جہاں لفظ سلطان المشائخ آیا ہے آپ ہی کی ذات والاصفات سے مراد ہے۔ آپ کا مختصر حال ضمیمہ میں تحریر کیا گیا ہے۔

۲؎ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ ۶۸۵ھ ۱۲۸۶ء میں جب سلطان معز الدین کیقباد نے موضع کیلوکھڑی میں جو متصل غیاث پور جائے قیام حضرت سلطان المشائخ کے تھا۔ قصر شاہی اور قلعہ تعمیر کرایا اور شہر آباد کر کے جامع مسجد بنائی اُس وقت سے ایک انبوہ کثیر آدمیوں کا (بقیہ صفحہ ۱۲۹ پر)

کالبدِ سوختہ برجاں رسید — مردہ بسر چشمۂ حیواں رسید
کارشناس از نظرِ دور بیں — شدزدل تیرہ من نوربیں
دیدہ زرم رابتہِ کورہ در — علّت بمیار بہ قارورہ در
گفت زیمائے توشدرو شنم — کت نفسے ے رسداز گاشنم

حلقہ مریدان جاں نثار میں شامل ہوکرامیر خسروؒ نے اس قدر ریاضاتِ شاقہ فرمائیں کہ حضرت سلطان المشائخؒ کی توجہ سب مریدوں سے زیادہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔اورانہوں نے اپنے اخلاص اوراعتقاد سے بہت جلد حضرت کی خدمت میں ایسی عزّت ومنزلت حاصل کی کہ کسی دوسرے مُرید کومیّسر نہ ہوئی۔

شاہزادی جہاں آرا بیگم بنت شہنشاہ شاہجہاں سے کتاب مونس الارواح میں منقول ہے کہ عنایت حضرت سلطان المشائخؒ کی امیر خسروؒ پراس درجہ تھی کہ آپ فرماتے تھے کہ میں سب سے تنگ ہوتا ہوں مگراے تُرک تجھ سے تنگ نہیں ہوتااورایک روزفرمایا کہ میں سب سے تنگ ہوتا ہوں یہاں تک کہ اپنے سے خودتنگ ہوجاتا ہوں مگر تجھ سے کبھی تنگ نہیں ہوتا۔

صاحب سیر الاولیاتحریرفرماتے ہیں کہ ابتدائے حال میں ایک دن حضرت سلطان المشائخؒ نے امیر خسرو سے دریافت کیا کہ شغل عبادت کا کیاحال ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ آخری شب میں چندروز سے رونا آتا ہے۔حضرت سلطان المشائخؒ نے فرمایا کہ الحمدللہ کچھ ظہور ہوناشروع ہوا۔

چندروز کے بعدحضرت سلطان المشائخؒ نے امیر خسروؒ کوخرقۂ خلافت عطافرماکر ترک اللہ کاخطاب مرحمت فرمایا۔لیکن محبت سے کبھی کبھی صرف ترک ہی سے مخاطب فرمایا کرتے تھے۔امیر خسروؒفرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۲۸ کا) حضرت سلطان المشائخ کے اس آنے لگااوراسی زمانہ میں امیرسیف الدین لاچین معہ اپنے لڑکوں اعزالدین علی شاہ اورحسام الدین اورابوالحسن (خسرو) کے حضرت کے مرید ہوئے اور اس وقت امیر خسرو کی عمرآٹھ برس کی تھی۔تاریخ تحقیقات سے یہ روایت غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ ۶۸۵ھ میں امیر خسروؒ کی عمر بائیس تیئس برس کی تھی اوراُن کے والد کاانتقال نوبرس کی عمر میں ہوچکا تھااورامیر خسرو ۶۸۵ھ سے پہلے حضرت کے مریدوں میں شامل ہوچکے تھے (ملاحظہ ہوسیر الاولیاجوبہت مستندکتاب ہے)

بر زبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت ‏ ‏ ‏ دست ترک اللہ بگیر و ہم بہ اللہش سپار

چوں من مسکیں ترا دارم ہمینم بس بود ‏ ‏ ‏ شیخ من لیکن مہربان و خاتمم آمرز گار

صاحب سیر الاولیا نے اس خطاب کی نسبت امیر خسروؒ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

"بندہ را خواجہ ترک اللہ خطاب کردہ است و چندین فرمان و موشح و مزین بخط مبارک ایشان بدین خطاب در حق بندہ مبذول بودہ و بندہ آن را تعویذ ساختہ تا بوقت دفن برابر بندہ باشد فردائے قیامت رحمٰن بحق من بیچارہ بداں کاغذہا بخشاید انشاء اللہ تعالیٰ الکریم۔

در پیش توائے از ہمہ کس بسکہ منم ‏ ‏ ‏ در راہ غمت کمینہ ترخس کہ منم"

ایک مرتبہ کسی مرید نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ جیسی عنایت و مہربانی امیر خسروؒ کے حال پر ہے، امیدوار ہوں کہ بندہ کے حال پر بھی مبذول فرمائی جاوے۔ آپ نے جواب دیا کہ اپنے میں و یسی قابلیت تو پیدا کر لو۔

علامہ زماں میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانہ عامرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ جس وقت امیر خسرو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی وہ نظم جو حضرت کی مدح میں لکھی تھی نظر انور سے گذرانی۔ آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اس کا کیا صلہ چاہتا ہے چونکہ اُس زمانہ میں ان کا میلان طبع شاعری کی طرف بہت تھا اس وجہ سے جواب دیا کہ اپنے کلام میں شیرینی چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ ہماری چارپائی کے نیچے طشت میں شکر رکھی ہے اس کو لا کر اپنے سر پر سے نثار کر اور تھوڑی اُس میں سے کھا لے۔ امیر خسرو حضرت کا حکم بجا لائے اور شیرینی کلام کی دولت سے مالامال ہوئے صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں کہ اخیر عمر میں امیر خسروؒ اپنی اس التجا پر بہت افسوس کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے اس سے بہتر کوئی خواہش کیوں نہ کی[1]

نفحات الانس میں عارف ربانی مولانا جامیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک دن حضرت سلطان المشائخ کے اشارے سے امیر خسرو خواجہ خضر کی ملاقات سے مشرف ہوئے اور خواہش لعاب دہن کی انہوں نے فرمایا کہ یہ دولت شیخ سعدی کی قسمت کی تھی۔ امیر خسرو نہایت

---

[1] اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ نے امیر خسروؒ کو ہدایت فرمائی کہ "بطرز صفاہانیاں بگو یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز۔"

شکستہ دل ہو کر حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کل حال بیان کیا۔ حضرت نے اپنا لعاب دہن اُن کے منہ میں ڈالا اور برکت اس کی ظاہر ہوئی۔ امیر خسرو مثنوی نہ سپہر میں خود فرماتے ہیں

من از و بے لعاب زباں یافتم   کز یں گونہ آب روان یافتم

دو قطرہ از و در دوات افگنیم   تظلم در آب حیات افگنیم

امیر خسرو خود فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے دل میں خیال گذرا کہ میرا تخلص خسرو اہل دل سے نسبت رکھتا ہے اگر فقرا کی طرف منسوب ہوتا تو کیا خوب ہوتا تا کہ قیامت کے دن میں اسی نام سے پکارا جاتا۔ میں نے ایک دن یہ امر حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ میری تمنا ہے کہ قیامت کے دن مجھ کو فرشتہ خسرو کہہ کر نہ پکاریں کیونکہ یہ نام متکبر ہے حضرت نے فرمایا کہ وقت سعید میں تیرا تخلص رکھا جاوے گا۔ پھر چند روز کے بعد ارشاد فرمایا کہ مجھے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ صحرائے محشر میں تجھے محمد کاسہ لیس کہہ کر فرشتے بلاوینگے۔

امیر خسرو خود فرماتے ہیں کہ ایک دن بعد فارغ ہونے وظائف صبح کے حضرت پیر روشن ضمیر نے بندہ کو طلب کیا اور ارشاد فرمایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے تو بھی سن۔ شب آدینہ کو میں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ صدر الدین پسر شیخ بہاؤ الدینؒ میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے ان کی تعظیم کی اور انہوں نے ایسی تواضع کی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد دیکھا کہ اے ترک تو دور سے پیدا ہوا اور میرے پاس آ کر بیان معرفت شروع کیا اُسی وقت اذان کی آواز سُنی اور میں بیدار ہوا۔ اس کے بعد زبان الہام بیان سے ارشاد فرمایا کہ دیکھ کیا مرتبہ ہے۔ میں نے نیاز مندی سے عرض کیا کہ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ یہ سب آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ آپ کو یہ سن کر رونا آیا اور چلا کر روئے میں بھی اُس وقت بہت رویا بعدہٗ آپ نے کلاہ خاص طلب فرما کر دست مبارک سے میرے سر پر رکھی اور فرمایا کہ کلمات مشائخ کو زیادہ دیکھا کرو اور یہ رباعی زبان مبارک سے ارشاد فرمائی۔

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست   ملکیت ملک سخن آں خسرو ماست

آں خسرو ماست ناصر خسرو نیست   زیرا کہ خدا ناصر ایں خسرو ماست

منقول ہے کہ جب حضرت سلطان المشائخ بعد نماز عشا پلنگ پر تشریف لے

جاتے اُس وقت آپ کے دستِ مبارک میں تسبیح دی جاتی تھی اوراس کے بعد کوئی شخص سوائے امیر خسرو کے آپ کی خدمت میں نہیں جاسکتا تھا۔ امیر خسرؒو روزانہ تشریف لے جاتے اور حضرت کے روبرو بیٹھ جاتے تھے۔ جب آپ ارشاد فرماتے کہ ترک آج کیا خبر ہے اُس وقت یہ ہر قسم کی حکایتیں دن بھر کے واقعات اور دیگر راز و نیاز کی باتیں بیان کرنا شروع کرتے۔ جب کسی مرید کو حضرت کی خدمت میں کچھ التجا کرنی منظور ہوتی تو اوّل ان سے کہتا اور یہ اس موقع پر حضرت کے گوش گذار کر کے اُس کی سفارش کرتے تھے۔ حضرت سلطان المشائخ ان کی وجہ سے برابر سر ہلاتے رہتے تھے اور گفتگو ختم ہونے کے بعد مناسب جواب ارشاد فرماتے تھے۔ اکثر و بیشتر ان کی سفارش منظور ہوتی اسی سعادت کی نسبت امیر خسرؒو فرماتے ہیں ۔

زہے سعادت واقبال چشم آں کس را　　　　که در جمال تو دستوریۓ نظر باید

بیت دیگر

نخفت خسروِ مسکیں ازیں ہوس شبہا　　　　کہ دیدہ برکفِ پایت نہد بہ خواب شود

شیخ برہان الدین غریبؒ جو خلیفہ اور مرید حضرت سلطان المشائخ کے تھے ایک دن اُن کی شکایت شیخ علی زنبیلی اور ملک نصرت نے حضرت سلطان المشائخ سے کی کہ مولانا بُرہان الدین پیر بن کر اور خرقہ پہن کر کمبل بچھا کر بیٹھتے ہیں اور خلقِ کثیر اُن کے پاس جمع ہوتی ہے۔ اُنہوں نے دکانِ شیخی کی خوب گرم کر رکھی ہے حضرت سلطان المشائخ یہ حال سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور جب مولانا برہان الدین خانقاہ میں حاضر ہوئے تو آپ اُن کی طرف متوجہ نہ ہوئے اُسی وقت خدام نے مولانا سے کہا کہ تم کو مناسب ہے کہ ابھی یہاں سے چلے جاؤ یہ جگہ تمہارے بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ مولانا حیران و پریشان وہاں سے اُٹھ کر مکان پر آئے جب پیر کی مفارقت سے نہایت بے تاب ہوئے۔ اکثر یاروں سے سفارش کرانا چاہی مگر کسی کی ہمت سفارش کرنے کی نہ پڑی آخر امیر خسرؒو کی خدمت میں التجا سفارش کی لے گئے آپ کو رحم آیا اور دستار اپنے سر سے اُتار کر اُن کی گردن میں ڈالی اور اسی ہیئت سے سلطان المشائخ کی خدمت میں لے گئے۔ اُس وقت آپ کلاہ مبارک سر پر کج رکھے ہوئے وضو کر رہے تھے۔ امیر خسرؒو نے دیکھتے ہی یہ بیت موزوں کر کے پڑھی۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

حضرت نے نظر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا کر فرمایا کہ ترک اللہ کیا حال ہے انہوں نے کہا کہ یہ بندہ معافی جرائم مولانا برہان الدینؒ کا خواہش مند ہے حضرت نے اُسی وقت مولانا کا قصور معاف فرمایا اور اُٹھ کر دونوں سے بغلگیر ہوئے[۱]

ایک مرتبہ سلطان علاؤ الدین خلجی نے چاہا کہ حضرت شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندرؒ کی خدمت میں جو اولیائے نامدار اور مشائخ صاحب اسرار چشت اہل بہشت سے حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر اور ایسے مست الست تھے کہ بڑے بڑے صاحبِ کمال درویشوں کی ہمت بھی اُن کے سامنے جانے کی نہ پڑتی تھی کچھ نذر ارسال کرے۔ امراء سے مشورہ کیا کہ کون لے کر جاوے۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کلام کرے بعد بحث و مباحثہ سب کی یہ رائے قایم ہوئی کہ امیر خسروؒ کو روانہ کیا جاوے۔ بادشاہ نے ایک امیر کو حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں روانہ کیا اور اجازت چاہی۔ پہلے تو آپ نے تامل فرمایا لیکن پھر کچھ سوچ کر اجازت دیدی۔ اور چلتے وقت امیر خسرو کو نصیحت کر دی کہ جو کچھ قلندر عاشق اللہ فرماویں اس کو تسلیم کرنا اور کسی بات پر معترض نہ ہونا امیر خسرو نذر سلطانی لے کر دہلی سے پانی پت روانہ ہوئے اور تیسرے دن وہاں پہنچ کر اپنے آنے کی اطلاع قلندر صاحب کو کرائی انہوں نے فرمایا کہ آنے دو۔

امیر خسروؒ نے نزدیک پہنچ کر سلام علیک کی۔ قلندر صاحب نے اس کے جواب میں کوئی لفظ ہندی کا فرمایا جس کے معنی گانے والے کے ہیں۔ یہ سن کر امیر خسروؒ نے پھر سلام کیا اور کہا کہ یہ آپ کی عنایت ہے جو میری طرف خطاب ہو اور نہ میں ایک ناچیز بندہ ہوں، اس کے بعد قلندر صاحب نے فرمایا کہ تصنیف ہائے خود چیزیں بگو یعنی اپنی تصنیف سے کچھ کہو امیر خسروؒ نے نہایت خوش الحانی سے اپنی وہ غزل سنائی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔

اے کہ گوئی ہیچ مشکل چوں فراقِ یار نیست
گر امید وصل باشد ہمچناں دشوار نیست

---

۱ سیر الاولیا میں اِس روایت کو خفیف تغیر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

چند گویندم کہ بر وز شنبہ بت پرست
بر تن خسرو تو کلبی رگ کہ آں زنار نیست

یہ غزل سن کر قلندر صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ خسرو خوب کہتا ہے۔ خوش رہے گا۔ خوش جاوے گا۔ پھر یہ شعر خود پڑھے:

دیجیہ خسرواں بر وہ لعل اشتر است ۔ خسرو کہے کہ طاقہ تجرید بر سر است
عقل کل است علم لدنی بہ عارفان ۔ ایں عقل و علم جیسے بوسے مختصر است

یہ اشعار سن کر امیر خسرو کو رقت پیدا ہوئی۔ قلندر صاحب نے فرمایا کہ کچھ سمجھا بھی یا ویسے ہی روتا ہے[1]۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو رونا اسقدر آیا کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ یہ جواب سن کر قلندر صاحب بہت خوش ہوئے اور بادشاہ کی نذر قبول فرمائی اور کہا کہ اگر مولانا نظام الدین (سلطان المشائخ) کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو میں ہرگز قبول نہ کرتا اس کے بعد خدام کو حکم دیا کہ امیر خسرو کو خانقاہ میں اعزاز و اکرام سے رکھو۔ تین دن امیر خسرو نے قیام کیا اور پھر اجازت چاہی قلندر صاحب نے اجازت دی اور چلتے وقت دو خط ایک بنام حضرت سلطان المشائخ اور دوسرا بنام سلطان علاؤ الدین تحریر کر کے ان کے حوالہ کئے۔ علاؤ الدین خلجی کے نام جو خط تھا اس کی عبارت یہ تھی — علاؤ الدین شحنۂ دہلی مقرر داند کہ با بندگان خدائے تعالیٰ نیکو کند۔ جب دربار میں یہ خط پڑھا گیا تو بعض خوشامدی امرا نے کہا کہ بادشاہ خلیفۃ اللہ کو ایسا لکھنا ترک ادب میں داخل ہے سلطان نے کہا کہ غنیمت ہے کہ اس ذرہ بے قدر کو اس مرتبہ شحنۂ دہلی تو لکھا ہے ایک مرتبہ تو شحنۂ اودھ لکھا تھا۔

شاہزادہ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک محتاج فقیر برائے طلب حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مطلب بیان کیا۔ اتفاق سے اس وقت خانقاہ عالی میں کچھ موجود نہ تھا آپ نے فرمایا کہ ٹھہر جا جو کچھ فتوح آجائے گی وہ تجھے دوں گا اس دن کچھ نہ آیا۔ پھر فرمایا کہ کل جو فتوح ہوگا وہ تیرا ہے اتفاق سے دوسرے دن بھی کچھ نہ آیا اور اسی طرح جب چار یا پانچ دن گذر گئے اسی وقت مجبور ہو کر آپ نے اپنے کفش مبارک اس فقیر کو عطا فرمائے اور اس نے نہایت اعتقاد سے حضرت کے اس عطیہ

---

[1] قلندر صاحب نے ہندی کا یہ فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔ "کچھ بوجھ کر روتا ہے یا یوں ہی"

کو منظور کیا اور دہلی سے روانہ ہوئے اور امیر خسرو جس زمانہ میں کہ شاہزادہ محمد سلطان خاں شہید کی مصاحبت میں ملتان میں رہتے تھے ہر سال اُس کے ہمراہ ایک بار دہلی آیا کرتے تھے۔ اُسی زمانہ میں دہلی آ رہے تھے، اتفاقیہ اُس فقیر سے راستے میں ملاقات ہو گئی۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کہاں سے آئے ہو اُس نے کہا کہ دہلی سے آپ نے فرمایا کہ حضرت سلطان المشائخ کا کچھ حال معلوم ہے اُس نے کہا خیریت سے ہیں اس کے بعد انہوں نے دریافت کیا کہ حضرت کی کچھ نشانی تمہارے پاس ہے۔ اس نے کفش مبارک دکھائے اور کُل حال بیان کیا امیر خسرو نے کہا کہ ان کو فروخت کرو گے اُس نے اقرار کیا اُس وقت پانچ لاکھ تنکہ (روپیہ) ان کے پاس موجود تھے جو ایک قصیدہ کے صلے میں ملے تھے وہ کُل اس فقیر کو دے دیئے اور پیر کے کفش مبارک اُس سے لے لئے۔ جب دہلی پہنچے اُن کو سر پر رکھے ہوئے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے یہ حال دیکھ کر فرمایا کہ اے خسرو ارزاں خریدی سبحان اللہ کیا عقیدت اور کیا نیاز تھا جن کے ایسے عقیدے ہوں انہیں اپنے مرشد کامل سے کیوں نہ فیض پہنچے اور کیوں نہ اُن کے پیر اُن سے خوش اور راضی رہیں۔

اسی قسم کی ہزاروں حکایات اور کلمات امیر خسرو کے مشہور ہیں جنہیں بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

آپ نے اپنی تصنیف و تالیف میں حضرت سلطان المشائخ کی مدح اور شان میں بہت کچھ کہا ہے جس میں سے کچھ تھوڑا سا تبرکاً اس مقام پر درج کیا جاتا ہے۔

قصیدہ

اے شربتِ عاشقی بہ جانت — و ز دوست زماں زماں پیامت

در خیر سیاہ و سال ہر دو عالم — داخل بہ مسافتِ دو گامت

شد سلکِ فرید از تو منظوم — زانست کہ شد لقب نظامت

شد جانِ شریفِ پاک را چرخ — لب تشنۂ الحمد و نوت تا تمامت

درگاہ تو قبلہ و ملائک — پران چو کبوتران بہ بامت

سودا زدگانِ شوقِ حق را — تسکین ز مفرح کلامت

جاوید بقاست بندہ خسرو
چوں شد بہ ہزار جاں غلامت

قطعہ

نے زابرار دیدہ کس علمش — نے زابدال یافتہ بدلیش
ہر شبش زاوج عالم اسرار — صبح دولت دمیدہ درشبِ تار

مثنوی

در حجرۂ فقر پادشاہے — در عالم دل جہاں پناہے
شاہنشہ بے سریر و بے تاج — شاہانش بخاکپائے محتاج

بیت

دراثنائے نماز اے جاں نظر برقامت دارم
مگراز قامتِ خوبت قبول افتد نمازِ من

دیگر

جدا از خانقاہِ اوتبقدیم — حطیم کعبہ را ماند بہ تعظیم
ملک کردہ بہ سقفش آشیانہ — چواندر سقفہا گنجشکِ خانہ

مثنوی ہشت بہشت میں فرماتے ہیں۔

خسروا پائے نیک مرداں گیر — بامسیحا نشین و پیش بمیر
بایدت خانۂ حیات درست — از خضر باید آب حیواں جست
خواہی از خاک برسپہر خرام — خاک شوزیرپائے شیخ نظام

حضرت سلطان المشائخ نے بہت سے رقعے نہایت ذوق وشوق سے امیر خسروؒ کے نام تحریر فرمائے ہیں اور اُن میں بہت سے نصائح فرمائے ہیں۔ ایک رقعہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

بعدازز حالطت جوارح اشتغال بأمور نامرضیہ شرع اجتناب نماید۔ ودر مراعات اوقات ہم کوشد وعمر عزیز راکہ سبب تحصیل کل مرادات است غنیمت شمرد روزگار را بہ بطالت مصروف نہ گرداند۔

مُرقّعِ اُلفت

امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ اور امیر حسنؒ کے عشق و محبت کا قصہ بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ منقول ہے کہ آغاز شباب میں امیر خسروؒ ایک دن حضرت سلطان المشائخ کے ہمراہ بازار تشریف لے گئے تھے۔ امیر حسن علاء سجزی مشہور شاعر جو حسن و جمال میں بے مثال اور فضل و دانش میں کمال رکھتے تھے اور اس زمانہ میں روٹی کی دُکان کیا کرتے تھے اپنی دُکان پر بیٹھے ہوئے روٹیاں بیچ رہے تھے جونہی امیر خسروؒ کی نگاہ اُن سے دوچار ہوئی۔ چونکہ عشق کی حرارت سے دل ان کا گداز ہورہا تھا فوراً ان کے شکل زیبا اور حرکاتِ موزوں کو دیکھ کر قفسِ محبت میں گرفتار ہوا۔ امیر خسروؒ نے دُکان کے قریب جاکر دریافت کیا کہ میاں روٹی کس حساب سے بیچتے ہو۔ مثل مشہور ہے کہ عشق اور مشک نہیں چھپتا اور محبت کی آنکھ فوراً پہچان لی جاتی ہے۔ امیر حسن نے امیر خسروؒ کے حال پر مطلع ہوکر ظرافت سے جواب دیا کہ میں ترازو کے ایک پلّہ میں روٹی رکھ کر خریدار سے کہتا ہوں کہ زر دوسرے پلّہ میں رکھ جب زر اس کا روٹی کے وزن سے بہت بھاری ہوجاتا ہے اس کو لے کر خریدار کو راستہ بتاتا ہوں۔ امیر خسروؒ نے کہا کہ اگر خریدار مفلس ہو تو اس کی کیا تدبیر ہے جواب دیا کہ اُس سے زر کے عوض درد و نیاز لیتا ہوں۔ امیر خسروؒ اس حسن کلامی سے حیران رہ گئے اور حقیقت حال اپنے مرشد کامل حضرت سلطان المشائخ سے آکر بیان کی۔

امیر خسروؒ کی سچی محبت نے بہت جلد امیر حسن کے دل میں بھی درد پیدا کردیا۔ انہوں نے دُکان ترک کردی اور حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ میں امیر خسروؒ کے پاس آمدورفت شروع کرکے اوّل زیادہ علوم و کمال ظاہری کی تحصیل میں مشغول ہوئے اور ان دونوں کے باہم ایسی محبت پیدا ہوئی کہ یک جان دو قالب کا مضمون ہوگیا۔

عشق صادق کا اگر فریاد رتبہ ہو حصول
یار کے دل میں بھلا دیکھیں اثر کیونکر نہ ہو

اس کے بعد امیر خسروؒ اور امیر حسن نے شاہزادہ محمد سلطان ابن غیاث الدین بلبن حاکم ملتان کی ملازمت اختیار کی امیر خسروؒ شاہزادے کے مصحف دار اور امیر حسن

دوات دار مقرر ہوئے۔ جب شاہزادہ ملتان سے دہلی آتا دونوں عزیز شاہزادہ کی خدمت سے فارغ ہوکر اکثر اوقات حضرت سلطان المشائخ کی خدمت بابرکت میں حاضر رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی عاشقی اور معشوقی کا اس قدر شہرہ ہوا کہ اہل غرض نے شاہزادہ کے گوش گذار کیا کہ تمام خلق امیر خسرو اور امیر حسن کو اہل ملامت لئے جانتی ہے یہ ہرگز شاہزادہ کے قرب خدمت کے قابل نہیں تھیں۔ انہیں دنوں میں امیر خسرو نے ایک غزل میں یہ اشعار موزوں کئے تھے

دوستان من ہوس دارم بنالیدن ولیک — درد چوں در سینہ باشد نالہ تار آورد
صد گلہ دارم و لے چوں باشد آں دور نظر — کیست کاں ساعت زبانم را بگفتار آورد
وین سوال خود کہ کام کار من بر سوائی کشید — خسروا فرمان دل بردن ہمیں بار آورد

شاہزادہ نے مطلقاً امیر حسن کو امیر خسرو کی مصاحبت اور اختلاط سے ممانعت کردی لیکن چونکہ رشتہ محبت ان کے درمیان میں مضبوط تھا ممانعت نے کچھ فائدہ نہ بخشا اور اہل غرض نے پھر یہ حال شاہزادے سے عرض کیا۔ اس مرتبہ شاہزادے نے غصہ میں آکر چند تازیانے امیر حسن کے ہاتھ پر مارے۔ مثل مشہور ہے۔ ملامت صیقل زنگار عشق است۔ امیر حسن تازیانہ کھا کر اسی وقت امیر خسرو کے مکان پر پہنچے۔ شاہزادے کو بھی اسی وقت یہ حال معلوم ہوگیا۔ متعجب ہوکر ایک مصاحب سے کہ جو حقیقت حال سے مطلع تھا فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبت مجازی زیور حقیقت سے آراستہ اور ان کا جمال حال پردہ عفت و صلاح سے پیراستہ ہے۔ اسی وقت شاہزادے نے امیر خسرو کو طلب فرماکر ان سے دریافت کیا کہ محبت تمہاری آمیزش ہوا سے پاک ہے یا نہیں۔ امیر خسرو نے جواب دیا کہ ہمارے درمیان سے دوئی کوچ کر گئی ہے۔ شاہزادے نے کہا کہ اس کا ثبوت کیا ہے۔ یہاں بقول شخصے

خوں رگ مجنوں سے ٹپکا فصد لیلیٰ سے جو لی
عشق میں تاثیر ہے پر جذب کامل چاہیے

جذب کمال درجہ پر پہنچ چکا تھا فوراً ہاتھ آستین سے نکال کر فرمایا

گواہ عاشق صادق در آستین باشد

شاہزادے نے دیکھا کہ نشان تازیانہ کا اسی مقام پر امیر خسرو کے ہاتھ میں لگا

تھا۔ اسی مقام پر امیر خسروؒ کے ہاتھ پر موجود ہے۔ نہایت تعجب سے سکوت اختیار کیا امیر خسرو نے اسی وقت یہ رباعی پڑھی:

عشق آمد و شد چو خونم اندر رگ و پوست ... کرد ... ز پوست
اجزائے وجودم ہمگی دوست گرفت ... نیست برمن باقی ہمہ اوست

اس وقت نسیم عالم تحقیق ان کے باغ امید پر چلی۔ عالم و مافیہا ان کی نظر ہمت میں ایک خس دکھائی دیا۔ شاہزادے کی ملازمت سے استعفیٰ پیش کیا۔ لیکن شاہزادے نے نہایت اصرار اور خوشامد سے اُن کو اس ارادے سے باز رکھا۔[1]

ممکن ہے کہ اکثر کج فہم جو لذات نفسانی اور بہائم کے پورا کرنے کو عشق بازی سمجھتے ہیں اس روایت کو دیکھ کر امیر خسروؒ پر امرد پرستی کا الزام لگا دیں لیکن در حقیقت یہ بات نہیں ہے عشق مجازی عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہے۔ عاشق صادق اپنے معشوق کی صفات کا عاشق ہوتا ہے نہ کہ اس کی ذات کا۔ پردۂ حسن و جمال میں قدرت الٰہی کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے اکثر صوفیان صافی دل معشوق حقیقی کے جلوے کو معشوق مجازی کے حسن میں دیکھا کرتے ہیں شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نظر بر نیکواں رمیست معہود ... نہ ایں بدعت من آوردم بہ عالم
حدیث عشق اگر گوئی گناہ است ... گناہ اوّل زحوا بود و آدم
اگر دعوئی کنی پرہیز گاری ... مسلّم دار مت واللہ اعلم
دگر گوئی کہ میل خاطرم نیست ... من ایں دعوئی نمیدارم مسلم

اور چونکہ بہ نسبت عورت کے عشق کے امرد کے عشق میں گنہگاری کا کم خدشہ ہوتا ہے اس وجہ سے اکثر صاحب دل امردوں کے عشق و محبت میں گرفتار پائے جاتے ہیں۔ عشق کی نسبت حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں۔

زندہ نہ آنست کہ جانے در دست ... اوست کہ از عشق نشانے دو دست
چند بری عشقِ بہ بازی بسر ... عشق دگر باشد و بازی دگر
مرد کہ در عشق ز جاں مرد نیست ... گر صفتِ کافر شکند مرد نیست

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

زندہ دلاں خوش زغمِ دل شوند   جانوراں پاک بہ بسمل شوند
پاک روانے کہ بہ آگاہی اند   کشتۂ حق چوں ملخ وماہی اند
روے نکوراحتِ نظارگی ست   بردلِ عاشق غم و آوارگی ست
آنکہ تو بینی رُخِ زیباے شمع   شورشِ پروانہ شدوزیب جمع
صورتِ شاہد اجلِ معنوی است   خطِ مسلسل رقم جادوئی ست
دل شگاں رارُخِ زیبا مُل است   مستے بلبل نہ زمُل کز گُل است
گرنبود دیدۂ شہوت گراے   چیست بہ از دیدنِ صنع خداے
دیدنِ خوبانست بشہوت وبال   قند چوے گشت نباشد حلال
گرنگری پاک رخِ لالہ فام   نیت گل لالہ بہ دیدن حرام
آنکہ زحق پاکئ چشمش عطا است   منع زرخسارِ بتانش خطا است
دیدہ کہ دروے نظرِ پاک نیست   سرمۂ آں دیدہ بجز خاک نیست
دیدہ نباشد کہ نظر نیستش   کورچہ بیند کہ نظر نیستش
دیدۂ بادام کہ بے نورزیست   ازگلِ بادام چہ اگرکہ چیست

☆☆

باب سوم

امرائے شاہی اور سلاطین عہد کی ملازمت اور مصاحبت اور دیگر حالات

جب امیر خسروؒ کے کمالاتِ شاعری اور فضیلت علمی کا عالمگیر شہرہ ہوا تو شہزادہ محمد سلطان خاں شہید کے دربار میں بھی ان کے علم و فضل اور کمالاتِ شاعری کا مذکور ہونے لگا شاہزادہ نے طلب فرمایا اور نظر جوہر شناس سے دیکھ کر اپنی مصاحبت کا افتخار بخشا اور خدمت مصحف داری پر مامور فرمایا اور امیر خسروؒ نے بھی اس مقولہ پر عمل کر کے اس خدمت کو منظور کر لیا۔

مراد اہلِ طریقت لباسِ ظاہر نیست
کمر بخدمتِ سلطاں بِبند و صوفی باش

شاہزادہ محمد سلطان سلطان غیاث الدین بلبنؒ[1] بلبن کا بڑا بیٹا اور ولی عہدِ سلطنت مکارمِ اخلاق اور محاسن اوصاف سے موصوف اور فضیلت و دانش علم و ہنر میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس کی درگاہِ عالی درگاہ محمودی اور سنجری پر ترجیح رکھتی تھی شاعران فراست آئین اور فاضلانِ سعدات قرین اور علمائے دین اور مشائخ طریقت اُس کی مجلسِ ہمایوں میں ہمیشہ جمع رہتے اور اُس کی حاتمی بذل و احسان اور گلزار سخاوت کی صبا سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ ایسا مہذب اور مودّب تھا کہ مجلس فرماں دہی میں اگر تمام دن و رات اجلاس کرتا تو بھی

---

[1] سلطان غیاث الدین بلبن جمادی الاول ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء میں اکیس برس اور چند مہینے سلطنت کر کے اسی برس کی عمر میں اس دار ناپائدار سے سدھارا۔ یہ شاہ فرخندہ آثار اور بادشاہ معدلت شعار اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ سے آراستہ و پیراستہ تھا اُس کا زمانہ خیر القرون سے...... کارہائے سلطنت کو سنجیدگی اور فہمیدگی سے انجام دیتا تھا۔ اور سوائے اکابر اور مردمِ دانا کے کسی کے سپرد نہ کرتا (بقیہ صفحہ ۱۴۲ پر)

اپنا زانو بلند نہ کرتا تھا اور قسم اُس کی لفظ حقا کے سوا نہ تھی۔ اُس کی مجلسِ عالی میں ہمیشہ شاہنامہ اور دیوانِ خاقانی و انوری اور خمسۂ مولانا نظامی اور اشعار امیر خسروؒ پڑھے جاتے تھے۔ ارباب فہم و دانش اُس کی شعر فہمی کے مُقر تھے۔ امیر خسروؒ سے منقول ہے کہ میں نے جذتِ طبع اور دریافتِ معنی دقیق اور سخن شناسی اور یادداشتِ اشعار متقدمین و متاخرین میں کسی کو مثل محمد سلطان کے نہیں دیکھا۔ بیس ہزار بیت کی ایک بیاض کتب متقدمین سے انتخاب کر کے بہت خوش خط لکھی تھی امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ ان اشعار پسندیدہ سے محظوظ ہوئے اور شاہزادے کی شعر فہمی اور ادراکِ بلند کی مدح و ثنا کی۔ شاہزادے کی شہادت کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے یہ بیاض امیر علی جامدار کو عطا فرمائی اور ان سے امیر خسروؒ کو ملی۔ تمام شعراء نے اس بیاض کو دیکھ کر اُس کے منتخب اشعار اپنی اپنی بیاضوں میں نقل کئے تھے۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۱ کا) اور اراذل کو کارہائے سلطنت میں دخل نہ دیتا تھا اور جب تک دیانت داری اور صلاح و تقویٰ کسی شخص کا مشخص نہ کر لیتا کوئی شغل اور عمل نہ فرماتا اور نسب کی تصحیح میں مبالغہ بلیغ اور تفحص کثیر کرتا اور جو شغل اور عمل پیرا کرنے کے بعد کسی میں نقص ذاتی اور صفاتی کا گمان ہوتا تو اسے فوراً معزول کرتا تھا اُس نے اپنے تمام ایام سلطنت میں مسخروں اور ارباب نشاط کو کبھی منہ نہیں لگایا اس کے عہد دولت میں سلطنت دہلی کو وہ شان و شوکت حاصل ہوئی کہ سلاطینِ عراق اور خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ اُس کی دوستی کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ چنگیز خانی مغلوں کے ظلم و ستم سے جو بادشاہ اور شاہزادے وسط ایشیا سے اس کے عہد سلطنت میں ہندوستان تشریف لے آئے تھے وہ اس کے عالیشان دربار میں فرشِ عزت اور سرداری پر متمکن ہو کر نہایت ذوق و شوق سے تخت کے روبرو دست بستہ کھڑے رہتے تھے صرف دو شاہزادے جو خلفائے عباسیہ کی اولاد میں سے تھے ان کو پائے تخت پر بیٹھنے کی عزت حاصل تھی۔ جس وقت بادشاہ اور شاہزادے یا بزرگانِ وقت اُس کے عہد میں یہاں وارد ہوتے سلطان اظہار بشاشت کر کے شکر الٰہی بجا لاتا تھا اور ہر ایک شاہزادہ کے واسطے علیحدہ محلہ مقرر کرتا تھا۔ اُس کے عہد میں یہ پندرہ محلے جدید دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ (۱) محلہ عباسی (۲) سنجری (۳) خوارزم شاہی (۴) دیلمی (۵) علوی (۶) اتا بکی (۷) غوری (۸) چنگیزی (۹) رومی (۱۰) سنقری (۱۱) یمنی (۱۲) موصلی (۱۳) سمرقندی (۱۴) کاشغری (۱۵) خطائی۔ سلطان کے عدل و انصاف کی نسبت مؤرخوں نے بہت سی حکایتیں تحریر کی ہیں جس میں سے دو یہاں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) ملک تعیق ابن جاندار نے جو امرائے بزرگ سے تھا اور چار ہزار سوار خاصہ کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امیر خسروؒ کے ہمراہ امیر حسنؒ بھی شاہزادے کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور ان دونوں صاحب کمالوں نے اپنی شگفتہ بیانی اور عقل و دانش، فہم و فراست کی بدولت شاہزادے کے مزاج میں ایسا دخل پایا کہ خلوت و جلوت، مقام و سفر کی حالت میں اس کو ان کی جدائی گوارا نہ تھی اگرچہ کمال کی قدردانی اور سخاوت اس صاحب کمال جوہری کی عام تھی مگر جو عزت و منزلت امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ کی تھی وہ کسی دوسرے مصاحب کی نہ تھی۔

شاہزادہ محمد سلطان ملتان کا حاکم تھا امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ اور دیگر صاحب کمال شعراء اور علماء اور فضلا کی وجہ سے ان دنوں خطۂ ملتان رشک گلستان ارم ہو رہا تھا۔ شاہزادے نے دو مرتبہ اپنے مقربوں کو بہت سا روپیہ اور نادر و نایاب تحفہ دیکر شیراز میں حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں روانہ کیا اور امیر خسروؒ کے اشعار بھی شیخ کے ملاحظہ کے واسطے روانہ کر کے نہایت ادب سے التماس قدوم میمنت لزوم کی فرمائی اور ارادہ کیا کہ ملتان میں حضرت شیخ کے واسطے ایک خانقاہ تیار کرا کر کچھ دیہات اس کے اخراجات کے واسطے وقف کرے مگر دونوں مرتبہ حضرت شیخ نے ضعف پیری کا عذر تحریر کیا اور ہر بار اپنے ہاتھ سے اپنے کلام کی بیاض مرتب کر کے شاہزادے کے پاس روانہ کی اور امیر خسروؒ کے کلام کی بہت تعریف لکھ کر ان کے ہم صحبت ہونے کی مبارکباد دی اور لکھا کہ اس جوہر قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہیئے۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۲ کا) رکھتا تھا اور ولایت بدایوں اُس کی جاگیر میں تھی بدمستی کی حالت میں ایک غریب فراش کے اس قدر کوڑے مارے کہ وہ مر گیا۔ چند دنوں کے بعد جب بادشاہ بدایوں کے دورے پر گیا فراش کی بیوی دربار میں آ کر فریادی ہوئی۔ بادشاہ نے بعد ثبوت جرم ملک تغلق کے اس ستم رسیدہ کے روبرو اس قدر کوڑے لگوائے کہ اُس کے شوہر سے جا ملا۔

اسی طرح اُس کے ایک غلام صاحب اعتبار نے جس کا نام ہیبت خان اور اودھ کا جاگیردار تھا ایک شخص کو حالت مستی میں مار ڈالا اُس کی زوجہ دربار سلطانی میں دادخواہ ہوئی سلطان نے ہیبت خان کو پانچ سو کوڑے مار کر اُس عورت کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ یہ آج تک میرا غلام تھا اب تیرا مملوک ہے تجھے اس کے قتل یا رہائی کا اختیار ہے — ہیبت خان نے ایک جماعت کے ذریعے سے بصد تضرع و زاری مبلغ ایک لاکھ روپیہ اُس ضعیفہ کو دے کر آزادی حاصل کی اور اس حادثہ کے بعد مرتے وقت تک غیرت کے مارے باہر نہ نکلا۔

شیخ آذری نے کتاب جواہر الانوار اور حاجی لطف علی خاں نے آتشکدہ میں تحریر فرمایا ہے کہ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ عین پیرانہ سالی میں شیراز سے امیر خسروؒ کی ملاقات کو آخری مرتبہ ہندوستان میں تشریف لائے تھے اور ایک دوسرے کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور شیخ سعدیؒ شعر میں حق استادی امیر خسروؒ پر ظاہر کرتے تھے۔ بعض مورخین اس روایت کو محض اس شک پر مشکوک خیال کیا ہے کہ جس وقت ہندوستان اور ایران میں امیر خسروؒ کی شہرت ہوئی۔ اُس وقت شیخ کا عالم ضیفی تھا اور یقین نہیں آتا کہ اس عمر میں شیخ نے اس قدر دُور دراز سفر محض ایک نوجوان کے دیکھنے کی خاطر اختیار کیا ہو۔

امیر خسروؒ کی دلی ارادت اور اعتقاد کا حال جو شیخ سعدیؒ کی نسبت تھا ان کی اس بیت سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

خسروِ سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ سعدی کہ در شیراز بود

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں ع

جلدِ سخنم دارد شیرازۂ شیرازی

امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ پانچ برس تک ملتان میں شاہزادہ محمد سلطان کی مصاحبت میں رہے۔ ۶۸۳ھ ۱۲۸۴ء میں دفعتاً فلک شعبدہ باز نے ایک نیا رنگ بدلا۔ تیمور یا تیمر نامی مغل نے کہ امرائے عظیم الشان چنگیز خانی سے تھا دریائے راوی کو عبور کر کے لاہور کے قریب فساد برپا کیا حاکم لاہور نے شاہزادہ محمد سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع بذریعہ عرضداشت کی دی، اُس نے اپنے دربار میں بتیس ہزار فوج کو تین ہزار پڑھا اور نہایت کم سامان سے کوچ کرتا ہوا لاہور کے قریب دریائے راوی کے کنارے پر آپہنچا۔ یہاں مغلوں سے مقابلہ ہوا اور لڑائی کے بعد تیمور مغل شکست کھا کر بھاگا۔ امرائے ہند نے مفروروں کا تعاقب کیا چونکہ شاہزادے نے ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی جلدی سے معہ پانچ سو غازیوں کے دریا کے ایک مقام پر نماز میں مشغول ہوا اسی عرصے میں ایک مغل سردار نے کہ جس کے ہمراہ دو ہزار سوار تھے شاہزادے پر حملہ کیا۔ شاہزادے نے نماز سے فارغ ہو کر ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کئی بار حملہ کر کے بہت سے مغلوں کو قتل اور پسپا کیا۔ قریب تھا کہ مظفر و کامیاب ہو کہ ناگاہ ایک تیر

شست قضا سے چھوٹ کر شاہزادے پر آیا اور فوراً طائرِ مرغ روح قفسِ عنصری سے بجانب روضۂ قدس پرواز کر گیا مغل شاہزادے کے بہت سے ساتھیوں کو قید کر کے اور جو کچھ سامان ہاتھ لگا اُسے لے کر سپاہ ہند کے اجماع کے خوف سے بھاگ گئے۔ امیر خسروؒ بھی اس لڑائی میں شاہزادے کے ساتھ موجود تھے اُنہیں ایک مغل کے نوکر نے قید کر لیا اور جھول اور توبرا اُس کے سر پر رکھوایا امیر خسروؒ نے اس مضمون کو نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

منکہ برسر نمے نہادم گل | توبرہ بر نہاد و گفتا جُل

مغل امیر خسرو کو قید کر کے ہرات و بلخ لے گئے جہاں سے دو برس بعد رہائی حاصل ہوئی اور وہ اُفتاں وخیزاں پٹیالی پہنچے۔ ماں اُس وقت زندہ موجود تھیں اُن کا بیٹے کے فراق میں بُرا حال تھا۔ بیٹے کی صورت دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں امیر خسروؒ لکھتے ہیں۔ ''زیرِ قدم مادرِ بہشتی شدم و ازاں خود حالی کہ چشمہا بر من افتاد جوئے شیر از اشتیاق رواں شد ؎

بہشت زیرِ قدم ہائے مادراست مدام | دو جُوئے شیر از و ہیں رواں نشانِ بہشت

چند روز پٹیالی میں قیام کر کے امیر خسروؒ دہلی پہنچے۔ اور سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے وہ دو پُر درد قصیدے جو شاہزادے کے مرثیے میں لکھے تھے اِس رقّت سے پڑھے کہ تمام دربار میں سناٹا چھا گیا اور ہر کس و ناکس دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سلطان غیاث الدین اس قدر رویا کہ بخار آ گیا اور ایسا بخار آیا کہ اسی صدمہ اور بخار سے تیسرے ہی دن انتقال کیا۔ مہینوں دہلی کے لوگ اِن مرثیوں کو رات دن پڑھتے اور اپنے عزیزوں کی یاد میں جو اس لڑائی میں شہید ہوئے تھے روتے رہے[1]

یہ پُر درد مرثیے دیوان غُرّۃ الکمال میں موجود ہیں اور منتخب التواریخ بدایونی میں بھی نقل کئے گئے ہیں۔ ایک ترکیب بند کے چند شعر یہ ہیں ؎

واقعہ ہست ایں یا بلا از آسماں آمد پدید | آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیادِ عالم داد سیلِ فتنہ را | رخنۂ کاسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگِ گُل زباد | برگ ریزی گوئی اندر گلستاں آمد پدید
بسکہ آبِ چشم خلقے شد رواں در چار سوے | پنج آبِ دیگر اندر ملتاں آمد پدید

---

[1] منتخب التواریخ۔ فرشتہ۔ خزانۂ عامرہ وغیرہ۔

خواستم ماز آتشِ دل برزباں آرم سخن　　صد زبانِ آتشینم درد ہاں آمد پدید

امیر حسن نے بھی اس حادثۂ جانکاہ کا ایک مرثیہ نثر میں لکھ کر ملتان سے دہلی بھیجا تھا جو کتاب منتخب التواریخ میں درج ہے۔

اس کے بعد امیر علی میر جامدار نے جو سلطان غیاث الدین بلبن کا مولیٰ زادہ اور اُمرائے عظیم الشان سے تھا اور قابلیت وعلمیت کے ساتھ بذل وکرم حسن اخلاق اور دیگر صفات حمیدہ سے موصوف اور بوجہ اپنی سخاوت کے عام وخاص میں حاتم خاں کے نام سے مشہور تھا امیر خسرو کو نہایت اعزاز واکرام سے اپنی ملازمت میں لے کر مصاحبت میں رکھا۔ امیر خسروؒ نے اپنے دیوان میں امیر موصوف کی بہت تعریف وتوصیف کی ہے اور اسپ نامہ اسی کے نام پر لکھا ہے جس کی دو تین بیتیں یہ ہیں۔

شاہ عہد اختیار دولت ودیں　　آفتاب شرف بہ خانۂ زیں
ہم علی نام ہم بہ شیر دلی　　شیر دُلدُل سوار ہمچو علی
عالمے چوں عناں بجنبانی　　بسرِ تازیانہ بستانی

سلطان معز الدین[1] کیقباد نے اپنے باپ بغرا خان ناصر الدین کی ملاقات کے بعد امیر علی جامدار کو اودھ کی صوبہ داری پر مقرر فرمایا امیر خسروؒ بھی امیر علی کے ہمراہ شاہی لشکر میں

---

[1] سلطان معز الدین کیقباد ناصر الدین بغرا خاں کا بیٹا اور غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا بعد وفات غیاث الدین بلبن کے امراء اور اعیان سلطنت نے ان کی وصیت کے خلاف بجائے شاہزادہ کیخسرو پسر محمد سلطان ولی عہد سلطنت کے اس کو اٹھارہ برس کی عمر میں تخت نشین کیا۔ اس نے تخت نشین ہو کر عیش وعشرت پر کمر باندھی اور خلاف عہد سلطان غیاث الدین بھانڈوں اور مسخروں اور ارباب نشاط کا جمگھٹ دربار میں ہونے لگا۔ جب امورات سلطنت سے بادشاہ نے لاپرواہی اختیار کی تو ملک نظام الدین وزیر کو اپنی بادشاہی کی سوجھی اور اس کے جوڑ توڑ میں مصروف ہوا۔ اوّل بادشاہ کو بہکا کر شاہزادہ کیخسرو کو قتل کروا ڈالا، اس کے بعد شاہی خاندان کے دوسرے شاہزادوں اور دیگر امرائے استیصال میں مصروف ہوا۔ جب کیقباد کے باپ بغرا خان کے دوسرے شاہزادوں اور دیگر امرائے استیصال میں مصروف ہوا۔ جب کیقباد کے باپ بغرا خان ناصر الدین نے جو بنگالے کا صوبہ دار تھا۔ دربار کا یہ حال سنا تو بیٹے کو نصیحت آمیز خطوط تحریر کئے مگر کیقباد نے غرور جوانی اور عیش وعشرت میں باپ کی ایک بھی نہ سنی۔ مجبور ہو کر نا (بقیہ صفحہ ۱۴۷ پر)

موجود تھے یہ بھی اُن کے ہمراہ اودھ گئے اور دو برس تک وہاں مقیم رہے۔ امیر خسروؒ کی والدہ اور گھر کے سب لوگ دہلی میں تھے۔ جب ان کو دہلی سے گئے ہوئے دو برس کا عرصہ گذر گیا۔ مادرِ مشفقہ نے شفقتِ مادری سے بیتاب ہو کر کئی خط ان کی طلبی میں روانہ کئے سچ تو یہ ہے کہ احسان وہ چھپا ہوا جادو ہے کہ اس کے اثر سے بچنا ناممکن ہے، امیر علی کی بے انتہا عنایت اور احسان نے امیر خسروؒ کے دل پر ایسا اثر پیدا کیا تھا کہ حرف رخصت زبان پر نہ لا سکتے تھے۔ جب ماں کے کئی خط آئے اور محبت مادری کی کشش مقناطیسی نے ان کے دل پر بے انتہا اثر پیدا کیا اُس وقت ایک دن رُکتے رُکتے امیر علی سے یہ حال بیان کیا۔ اس دریا دل نے دو کشتی زر و جواہر عطا فرما کر نہایت اعزاز و اکرام سے انہیں دہلی روانہ کیا امیر خسروؒ نے ایک مہینے میں اودھ سے دہلی کا راستہ طے کیا اور ماہ ذیقعدہ ۶۸۷ھ ۱۲۸۸ء میں دہلی پہونچ کر اپنی مادرِ مشفقہ کی قدمبوسی اور دیگر احباب کی ملاقات سے خرسندی حاصل کی۔

امیر خسروؒ کے آتے ہی تمام شہر دہلی میں دھوم مچ گئی۔ دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے شروع ہو گئے۔ دوسرے ہی دن دربار کیقبادی میں ان کے تشریف لانے کا مذکور ہوا۔ بادشاہ نے فوراً چوبدار کو دوڑایا انہوں نے حاضر ہو کر قصیدہ بادشاہ کی مدح میں سنایا۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۶ کا) صدرالدین بغراخاں لکھنوتی (صدر مقام بنگالہ) سے مع فوج کے دہلی روانہ ہوا۔ ادھر سے بادشاہ بھی فوج لے کر باپ سے لڑنے کو دہلی سے روانہ ہوا دریائے سرو کے کنارے دونوں لشکر اکٹھے ہوئے اُس وقت غیاث الدین بلبن کے عہد کے امراء نے درمیان میں پڑ کر باپ بیٹے میں صلح کرادی اور دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ اخیر ملاقات میں باپ نے بیٹے کو طرح طرح کی نصیحتیں کیں اور وہاں سے رخصت ہو کر لکھنوتی کو واپس گیا۔ بادشاہ دو چار دن باپ کی نصیحتوں کا پابند رہا لیکن خوب صورت معشوقوں اور پری وش مطربوں نے طرح طرح کے کرشموں سے بادشاہ کی توبہ کے ہزاروں ٹکڑے کر ڈالے اور وہ پھر اسی لہو و لعب میں مشغول ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۸۷ھ ۱۲۸۸ء یا ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء میں اس کو فالج کا عارضہ ہو گیا اس سبب سے بعض امراء نے اس کے بیٹے کیومرث کو شمس الدین کے نام سے تخت پر بٹھایا مگر امراء خلج نے مخالفت کر کے کیومرث اور کیقباد دونوں کا کام تمام کر دیا اور اسی کے ساتھ ترکوں کی سلطنت کا جو خاندان غور کے غلام ہونے کی وجہ سے خاندان غلاماں کے نام سے موسوم ہے خاتمہ ہو گیا اور امرائے خلجی نے ملک جلال الدین خلجی کو تخت نشین کیا۔

بادشاہ نے اس کے صلے میں خلعت اور دو ہزار دینار مرحمت فرمائے اور روزانہ مقرر کر دیا۔ امیر خسروؒ نے جو قصیدہ اس موقعہ پر سنایا تھا اُس میں اکیس شعر ہیں اور ہر شعر سے کمالِ شاعری اور بلند خیالی ظاہر ہوتی ہے۔ چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

منت ایزد را کہ شہ بر تخت سلطانی نشست | در دماغِ مملکت بادِ سلیمانی نشست
شہ معز الدین والد نیا کہ از دیوانِ غیب | نام ناو برنامۂ دولت بہ عنوانی نشست
کیقباد آں گوہرِ تاجِ کیاں کر زخمِ تیغ | تاج از ایراں بستد و بر تختِ تورانی نشست
ابر نیساں کز کرم آوازہ در عالم فگند | آں ہمہ آواز ہائے ابر نیسانی نشست
دید قصرِ شاہ را با برج جوزا ہم کمر | بندہ خسرو چوں عطارد در ثنا خوانی نشست
چشمِ تو بیدار دولت بادتا از عونِ بخت | جملہ بیدار ان بخندو تو بتوانی نشست

معز الدین کیقباد نے امیر خسروؒ سے فرمایا کہ اے ختم سخن پر دراں میرے اور پدر مہربان کی ملاقات کے واقعات کو اپنی معجز بیانی سے پیکرِ نظم کے قالب میں ڈھال کر کلمات سحر آمیز سے حیات جاوید کا لباس پہنا۔ امیر خسرو نے چھ مہینے کے عرصہ یعنی رمضان ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء میں اس قالبِ بے جان کو اپنے سحر شاعری سے نظم کی روح پھونک کر پری پیکر بنایا اور قران السعدین کے خوشنما بلکہ قابلِ مرحبا نام سے موسوم کیا۔

۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء یا ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء میں آفتاب اقبال کیقبادی غروب ہو کر دربار فیروزی (جلال الدین[1] فیروز شاہ خلجی) کا ستارہ طلوع ہوا۔ جلال الدین فیروز شاہ اس سے

[1] جلال الدین فیروز شاہ کا اصلی نام ملک فیروز اور شایستہ خاں خطاب تھا۔ ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء میں ستر برس کی عمر میں تخت نشین ہوا یہ بادشاہ حلیم و کریم اور طبع موزوں رکھتا تھا اور صفت قدر شناسی اور راستی اور عدل و انصاف سے موصوف تھا۔ اس نے اپنے تمام ایام سلطنت میں (سوائے وقوعہ سید مولیٰ) کبھی مور ضعیف کو بھی نہیں ستایا جن لوگوں نے اس کے عہد میں بغاوت کی اور اس کے سامنے گرفتار ہو کر آئے اُنہیں بھی باوجود امرائے سلطنت کی بے حد مخالفت کے کوئی ضرر نہیں پہنچایا اور اُن سے نہایت اخلاق و تواضع سے پیش آیا۔ بہت سے علماء فضلا اور دیگر صاحب کمال اس کے انعام و اکرام سے بہرہ یاب ہوتے تھے اس کے بھتیجے اور داماد علاؤ الدین نے جو کڑہ کا حاکم تھا اُس کے بغیر اجازت نہایت دور دراز راستہ طے کر کے دکن میں دیوگڈھ (دولت آباد) پر چھاپا مارا اور جب وہاں سے بہت سا قیمتی (بقیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

پہلے میر اجامداری کے معزز عہدہ پر مامور تھا اور اُسی وقت سے امیر خسروؒ کی مصاحبت کا فخر اسے حاصل تھا۔ جب اقبال نے یاوری کی اور میر جامداری سے بساط شاہی پر قدم رکھا امیر خسرو کو نوازشاتِ شاہی سے ممنون فرما کر اپنے تمام مقربوں کا سردار کیا اور شغل مصحف داری اور منصبِ امارت کا اختصاص بخشا اور بارہ سو تنکہ[1] ان کی تنخواہ مقرر فرمائی۔

امیر خسرو کو بادشاہ کے بیٹے اختیار الدین خانخاناں سے بہت محبت تھی اُس کی وفات سے اُنہیں بہت قلق ہوا اور انہوں نے اس کا یہ پُر درد مرثیہ لکھا ہے ؎

چہ روز است اینکہ من خورشید تاباں را نمے بینم — وگر شب شد چرا ماہِ درخشاں را نمی بینم
دو روزے ہست کاندر ابر ماندہ آفتابِ من — کہ اندر چشمہا جز ابر و باراں را نمی بینم
ہندوستاں خطائے گشت پیداد بہر روے — ہے بینم ہزاراں چین و خاقاں را نمی بینم
نگین خاتمِ شاہی بہ کانِ سنگ پنہاں شد — دلم چوں لعل خوں شد زاں سبب کاں را نمی بینم
شد اینک بر سر تخت و بزرگاں صف زدہ ہر سو — ہمہ ہستند لیکن خانخاناں را نمی بینم
چو دولت کور دیدم گفتمش خواہی بسر او فتاد — چہ خواہم کرو چوں محمود سلطاں را نمی بینم

(بقیہ صفحہ ۱۴۸ پر) مال لے کر واپس آیا تو بادشاہی کی ہوس پیدا ہوئی اور بادشاہ کو دھوکا دے کر کڑہ بلایا ملک احمد چپ نے جو بڑا عقلمند اور تجربہ کار اور خیر خواہ وزیر تھا۔ بادشاہ کو ہر چند سمجھایا مگر بادشاہ کچھ نہ سمجھا اور یہی کہتا رہا کہ علاؤ الدین میرا ہی نمک پروردہ ہے اور میں نے ہی اس کو اس مرتبہ پر پہنچایا ہے وہ میرے ساتھ کبھی برائی نہیں کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء کو علاؤ الدین نے اپنے والی نعمت اور چچا جلال الدین کو نہایت دوھکہ اور کمینہ پن سے قتل کرا دیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے جو شخص میں...... بادشاہ جلال الدین میں شریک تھے وہ تھوڑے ہی عرصے میں بلائے عظیم میں مبتلا ہو کر جہنم کو سدھارے ازانجملہ محمود سالم (قاتل جلال الدین) کو ایک سال کے بعد جذام ہو گیا اور خون فاسد سے اس کے بدن کا تمام گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اختیار الدین دیوانہ ہو گیا اور حالتِ نزع میں چلاتا تھا کہ سلطان جلال الدین تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے میرا سر کاٹ رہا ہے۔ اسی طرح اور لوگ بھی طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہوئے۔

[1] اس زمانہ میں تنکہ ایک تولہ سونا یا چاندی کا مسکوک ہوتا تھا اور ہر تنکہ چاندی کے پچاس پیسہ تانبے کے ہوتے تھے جن کو جیتل کا وزن ایک تولہ یا پونے دو تولہ کا ہوتا تھا۔

منقول ہے کہ سلطان جلال الدین نے اپنے عہد سلطنت میں کئی مرتبہ حضرت سلطان المشائخ سے خانقاہ معلیٰ میں حاضر ہو کر قدمبوسی حاصل کرنے کی اجازت چاہی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے امیر خسرو سے بیان کیا کہ حضرت تو حاضری کی نہیں دیتے اور مجھے حصول قدمبوسی کا از حد اشتیاق ہے میرا ارادہ ہے کہ بلا اجازت خدمت میں حاضر ہو کر قدمبوسی حاصل کروں۔ اس کے بعد ان کو منع کر دیا کہ اس راز کو حضرت سے نہ بیان کرنا۔ اب امیر خسروؒ سخت پریشان ہوئے کیونکہ اگر بادشاہ کا راز حضرت سے بیان کرتے ہیں تو جان کا خوف ہے اور اگر نہیں بیان کرتے ہیں تو حضرت کی ناراضگی کا خیال ہے آخر کار انہوں نے جان پر کھیل کر کے راز حضرت سلطان المشائخ سے بیان کر دیا۔ آپ اُسی وقت اجودھن (پاک پٹن) اپنے پیر حضرت فریدالدین شکر گنج قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ صبح کو بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا۔ قیافہ سے معلوم کیا کہ امیر خسرو نے راز افشا کر دیا اور اسی وجہ سے حضرت کنارہ کر گئے۔ انہیں بلا کر دریافت کیا۔ انہوں نے سچ سچ حال بیان کر دیا اور کہا کہ اے بادشاہ تیری ناراضگی میں صرف جان کا خوف ہے اور حضرت کی ناراضگی میں سلب ایمان کا خوف تھا اس وجہ سے میں نے جان پر ایمان کو ترجیح دے کر حضرت پر یہ حال ظاہر کر دیا۔ دانا بادشاہ نے یہ برجستہ جواب سن کر خاموشی اختیار کی۔

امیر خسروؒ نے جلال الدین خلجی کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں اس مقام پر صرف اُن کے مطلع پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مطلع قصیدہ اوّل

سپیدہ دم کہ فلک جام زر بہ گیہاں داد   نسیم غالیہ در دامنِ گلستاں داد

مطلع قصیدہ دوم

سپیدہ دم چو ہواگشت بوستاں فرمود   بساطِ خاک ز دیباؤ پرنیاں فرمود

مطلع قصیدہ سوم

شیریں دہان یار کہ راحت بجاں دہد   آبِ حیات ازاں لبِ شکر فشاں دہد

مطلع قصیدہ چہارم

چو زلفِ یار شکن بر شکن ہمے پیچد   درو ہزار دلِ مردوزن ہمے پیچد

وقوعہ سید مولی

سلطان جلال الدین کے عہد کے ایک عجیب وغریب واقعہ قتل سیّد مولیٰ کا ہے۔ اگر چہ ہماری کتاب کواس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ قصہ نہایت دلچسپ۔ حیرت انگیز اورافسوسناک ہے لہٰذا غالباً بے موقع نہ خیال کیا جائے گا۔

سید مولیٰ ایک صاحبِ کمال اور عابدوزاہد بزرگ تھے۔ جرجان ان کا اصلی وطن تھا۔ انہوں نے موتوں جرجان سے مغرب کی طرف مسافرت کی اور خداپرستاں حقیقت کیش سے صورت ومعنی کا فیض پاکراور خداشناسی کی آنکھیں روشن کرکے اپنے وطن کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس کے چندروز بعد قطب الاولیا حضرت مخدوم فریدالدین شکرگنجؒ کی زیارت کے شوق میں ہندوستان تشریف لائے اوراجودھن میں جواب پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے آپ سے ملاقات کی اور مدّت تک آپ کی صحبت میں رہ کر فیضِ معنوی حاصل کیا۔ بعدازاں آپ سے دہلی کی سیر کی اجازت حاصل کی۔ رخصت کے وقت حضرت قطب الاولیاؒ نے ان سے فرمایا کہ ایک نصیحت یادرکھنا کہ ملوک اور اُمراءاور مقربانِ شاہی کے ساتھ اختلاط نہ کرنا اوراُن کی آشنائی سے محترز رہنا کس واسطے کہ مصاحبت اوراختلاط اس جماعت کا ہم فقیروں کوسبب ہلاکت کا ہے۔ غرض سید مولیٰ اجودھن سے روانہ ہوکر سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں دہلی آئے اور وہاں ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کراکر فقرااور مساکین کی دعوت وضیافت میں مصروف ہوئے۔ جتنے درویش اور مسافران کی خانقاہ میں آتے تھے اُن میں سے کوئی محروم نہ جاتا تھا۔ اگر چہ آپ نماز پانچوں وقت کی ادا فرماتے تھے مگر جمعہ میں حاضر نہ ہوتے تھے اور جماعت کے اچھی طرح پابند نہ تھے۔ لیکن مجاہدہ اورریاضت بہت فرماتے تھے اور نفس کشی کا یہ عالم تھا کہ سائے ایک چادر کے اور کچھ نہ رکھتے تھے نہ کوئی عورت یا خادمہ آپ کے پاس رہتی تھی۔ کسی سے کچھ لیتے نہ تھے اوراس قدر خرچ کرتے تھے کہ لوگ محوحیرت ہوکر خیال کرتے تھے کہ کیمیا کے صاحبِ کمال ماہر ہیں۔ بادشاہ غیاث الدین بلبن کے انتقال کے بعد عہد کیقبادی میں کہ زمانہ غفلت اور بے خبری کا تھا۔ آپ کے ایثاروشار کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ بڑے بڑے امراء اور خواتین ذیشان دونوں وقت خانقاہ میں حاضر ہوکر ایسے طعامِ لذیذ نوش فرماتے تھے کہ سلاطین روز

گارکو بھی میسر نہ تھے اس کے علاوہ کسی کسی کو دو دو تین تین ہزار ٹنکہ سونے کے انعام میں بھی مل جاتے۔ ہزار من میدہ اور پانچ سو من گوشت اور دو سو من مصری اور دو سو من شکر اور کئی من گھی خانقاہ کے باورچی خانہ میں روزانہ صَرف ہوتا تھا۔ سید مولیٰ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کسی شخص کو کچھ عطا فرمانا چاہتے یا قیمت ان اشیاء کی جو روزانہ خریدی جاتی تھیں دینے کا ارادہ کرتے تو کہتے کہ فلاں بوریئے یا فلاں پتھر یا فلاں اینٹ کو اُٹھاؤ اُس کے نیچے اس قدر ٹنکہ نقرئی یا طلائی ہیں اُنہیں لے لو۔ جب وہ چیز اُٹھائی جاتی ارشاد کے بموجب اُس کے نیچے سے برآمد ہوتا تھا۔ اور سکّے ایسے نئے نکلتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی وقت ٹکسال سے بن کر آئے ہیں۔ جب خلجیوں کا زمانہ شروع ہوا اور ملک الامرا فخر الدین کوتوال نے جو عہد غیاث الدین بلبن کا پُرانا امیر اور بذل و کرم حسن اخلاق اور برگزیدہ اوصاف میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا وفات پائی اور اس کے متوسلین و خوانین اور بارہ ہزار حافظ قرآن کہ اس کے ملازم اور ہر روز ہزار مرتبہ قرآن شریف ختم کرتے تھے اور اسی قدر سپاہی اور دیگر ملازم بے روزگاری سے پریشان ہوئے۔ یہ سب بھی سید مولیٰ کی خانقاہ میں حاضر ہونے لگے۔ خانخاناں سلطان جلال الدین کا بڑا بیٹا بھی سید بزرگ کے فضائل اور کرامات دیکھ کر بہت معتقد ہو گیا اور اکثر اوقات خدمتِ عالی میں حاضر رہنے لگا اور دیگر امراء اور مقربان شاہی بھی شب و روز سید موصوف کی خانقاہ میں حاضر ہو کر نعمت ہائے گونا گوں کہ انہیں اپنے دسترخوان پر میسر نہ ہوتی تھی مُہیا پاتے اور اُن کے اشارے سے طاقوں اور اینٹوں اور پتھروں کے نیچے سے سونے اور چاندی کے ٹنکہ حاصل کر کے عیش و عشرت میں بسر کرتے تھے نوبت یہاں تک پہنچی کہ قاضی جلال الدین کاشانی نے جو مرد فتنہ انگیز اور مصاحبانِ شاہی سے تھا سیّد مولیٰ کو سلطنت کی ترغیب اور تحریص دینی شروع کی اور سمجھایا کہ قادر مطلق نے آپ کو اس قدر قدرت محض اس غرض سے عطا فرمائی ہے کہ سلطنت اسلامیہ کو ظالموں کے ہاتھ سے نکالئے اور شریعتِ رسول اللہ کی پیروی کر کے خلقتِ خدا کو عدل و انصاف کے مہد امن و امان میں رکھیے اگر آپ اس میں تساہل کریں گے تو فردائے قیامت کیا جواب دیں گے۔ سید مولیٰ نے لوازمِ بشریت سے جو ہر بشر کے ساتھ لاحق ہیں اور قاضی جلال الدین کی چرب زبانی سے دھوکا کھایا اور ہر ایک مرید کو خطاب اور منصب دینا شروع کیا اسی عرصے میں چند مریدوں نے کمر ہمت باندھ

کرارادہ کیا کہ بادشاہ کا کسی موقع پر کام تمام کر کے سید مولیٰ کو تخت پر بٹھادیں۔مگر یہ راز قبل از وقت افشا ہو گیا۔سلطان جلال الدین خلجی نے سید مولیٰ کو مع قاضی جلال الدین کاشانی اور دیگر معتقدین کے دربار میں طلب کیا۔اور حقیقتِ حال استفسار فرمائی۔سب بالاتفاق منکر ہوئے اور کہا کہ ہم اس امر سے مطلق آگاہ نہیں ہیں۔جب اِن کا انکار حد سے گذرا تو بادشاہ نے ان کی راست گوئی کے امتحان کے واسطے صحرائے بہادر پور میں ایک مقام پر آگ جلوا کر حکم دیا کہ یہ لوگ آگ میں سے گذریں تاکہ اِن کا جھوٹ اور سچ ظاہر ہو جس وقت سید مولیٰ نے بہ آوازِ بلند کلمہ شہادت پڑھا اور آگ میں داخل ہونا چاہا۔بادشاہ کو رحم آیا اور علماء سے فتویٰ طلب کیا کسی نے فتویٰ نہ دیا اور بالاتفاق عرض کیا کہ یہ فعل شریعت میں کسی طرح جائز نہیں ہے۔آگ بالطبع جلانے والی ہے راست گو اور دروغ گو کو یکساں جلاوے گی۔علماء کی اِس راست گوئی کے باعث بادشاہ اس رادے سے باز آیا اور اسی وقت قاضی جلال الدین کو تو دہلی سے بدایوں تبدیل کر دیا اور دیگر اشخاص کو جو متہم ہوئے تھے دارالسلطنت سے نکلوا دیا اور سید مولیٰ سے طرح طرح کے سوالات دریافت کرنا شروع کئے جن کے جواب بھی پائے جب کسی طرح کا الزام شرعی اُن پر ثابت نہیں ہوا تو بھی اُن کے وجود کو موجب خلل سلطنت تصور کر کے شیخ ابو بکر طوسی حیدری کو جو حیدری فقیروں کا سردار تھا کوشک کے قریب بُلایا اور کہا کہ اے درویشو انصاف کرو کہ اس مرد نے میرے حق میں کس قسم کا ظلم کیا ہے اور کس قسم کا خلل پہنچانا چاہا ہے یہ سُن کر بنجری نام کے ایک قلندر بیباک نے سید مولیٰ کے تنِ نازنین کو اُسترے سے مجروح کیا اور سوئیاں چبھوئیں۔سید مولیٰ چلاّئے اور کہا کہ مجھے جلد اپنے مبداء پر پہنچاؤ میں اپنے قتل ہونے سے آزردہ نہیں ہوں، بلکہ خوش ہوں لیکن یقین رکھنا کہ آزار طائفہ درویشاں شوم ہے میمنت نہیں رکھتا۔عنقریب اس کی مکافات ملے گی۔بادشاہ سید موصوف کے قتل میں متردد اور متفکر ہی تھا کہ اُس کے منجھلے بیٹے ارکلی خاں نے جو اپنے بڑے بھائی خانخاناں کی عداوت کی وجہ سے ان سید بزرگ سے بھی عداوت رکھتا تھا کوٹھے پر سے فیلبان کی طرف اشارہ کیا۔جس نے فوراً مست ہاتھی چھوڑ کر سید مولیٰ کو شہید کرادیا۔ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی کا بیان ہے کہ میں اُس روز دہلی میں تھا مجھے خوب یاد ہے کہ سید مولیٰ کے قتل کے بعد ایسی سیاہ آندھی اُٹھی کہ جہاں تاریک

ہوگیا ور تھوڑی دیر تک یہ نوبت رہی کہ کوئی کسی کو نہ دیکھ سکتا تھا اور اُسی سال یعنی ۶۹۰ھ ۱۲۹۱ء میں دہلی اور اُس کے قرب وجوار میں بارش کی کمی کی وجہ سے ایسا قحط پڑا کہ عوام الناس نے بھوکوں کے مارے جمنا میں گر گر کر جان دی اور اس واقعہ کے بعد ادبار دوا سپہ جلال الدین خلجی کی سلطنت پر تاخت لایا اور روز بروز قضیہ نامرضیہ پیش آنے لگے اور اُس کی شاہی میں رونق باقی نہ رہی۔ مشہور ہے کہ سیّد مولیٰ اس حادثہ کے دو برس پہلے سے یہ رباعی اکثر پڑھا کرتے تھے[1]

در مطبخ عشق جز نکورانہ کشند لاغر صفتان وزشت خوارانہ کشند
گر عاشق صادقی کشتن مگریز مردار بود ہرآنکہ اورانہ کشند

سات برس اور چھ مہینے کے بعد جلال الدین فیروز شاہ کی بہار سلطنت بھی خزاں کی نحوست سے تباہ و برباد ہوئی اور ۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء سے سلطان علاؤالدین[2] خلجی کا دور شروع ہوا۔ یہ بادشاہ سلطنت سے پہلے تو الف کے نام بے بھی نہ جانتا تھا لیکن تخت نشین ہو کر کچھ حروف شناس ہو گیا تھا مگر اس کو اپنی علمی لیاقت پر ایسا گھمنڈ تھا کہ کسی عالم کو اپنے روبرو کچھ نہ جانتا تھا کسی فاضل کا مقدور نہ تھا کہ اُس کے آگے زبان ہلا سکے۔ آغاز سلطنت میں پیغمبری کی سوجھی۔ جب یہ بات بن نہ پڑی تو سکندری کی لوگی، باوجود اس کے امیر خسروؒ کی بہت وقعت کرتا تھا۔ اُس نے اپنے عہد میں ایک ہزار تنکہ ان کی تنخواہ مقرر کی تھی۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فرشتہ۔ منتخب التواریخ وغیرہ۔

[2] علاؤالدین خلجی۔ اپنے چچا جلال الدین خلجی اور اُس کے بیٹوں اور بہت سے امیروں کو قتل و برباد کر کے تخت نشین ہوا۔ اوّل اوّل تالیف قلوب کے لئے خزانوں کے مُنہ کھلوا دیئے اور بے شمار زر و جواہر لٹا کر خاص و عام کو مالا مال کیا جب خوب تسلّط جم گیا اور کوئی دعویدار سلطنت کا باقی نہ رہا تو نہایت تشدّد سے جس قدر انعام اکرام میں خزانہ لوٹا تھا۔ سب واپس کر لیا۔ اس بادشاہ نے بیس برس اور کئی مہینے نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی اور باوجود اس کے کہ پڑھا لکھا نہ تھا مگر کمال فراست سے اپنے کل ایامِ سلطنت میں نہ کسی کو یکبارگی ایسا بڑھایا کہ وہ اپنے آپے میں نہ رہتا نہ کسی کی خدمات ذاتی کو فروگذاشت کیا۔ قانون داغ اور بہت سے نئے قانون اپنی طبیعت سے ایسے نکالے (بقیہ صفحہ ۱۵۵ پر)

امیر خسروؒ کی تصنیف وتالیف کا زیادہ حصہ اسی بادشاہ کے نام پر ہے۔ جس کی تصریح کسی دوسرے مقام پر کی جاوے گی۔ امیر خسروؒ کی حق گوئی پر ہزار آفریں ہے کہ جہاں انہوں نے اس کی تعریف وتوصیف میں بڑے بڑے عالیشان اور پُرزور قصیدے لکھے ہیں وہاں اس جبّار بادشاہ کو جس کے سامنے تمام عالموں کو محض اس خوف سے جاہل بننا پڑتا تھا کہ ان کی تحصیل علم بادشاہ کے تحصیل علم سے زیادہ نہ ظاہر ہو جاوے۔ بہت سی نصیحتیں بھی کی ہیں۔ ایک موقع پر بادشاہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

(بقیہ صفحہ ۱۵۴ کا) کہ جو آج تک اُس کی مدبرانہ لیاقت اور عالی دماغی کو ثابت کرتے ہیں۔ غلہ، کپڑا، گھوڑے غرضیکہ اعلیٰ چیز سے لے کر ادنیٰ چیز تک سب کا نرخ ایسا سستا مقرر کر دیا تھا کہ خاص و عام کو اس سے بہت بڑی آسائش ہوئی اور ایسا اچھا انتظام کیا تھا کہ کسی کو مقدور نہ تھا کہ شاہی مقرر شدہ نرخ سے کم و بیش خرید وفروخت کر سکے ان سب حالات اور انتظامات کی تفصیل تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی میں موجود ہے۔ دکن اور دیگر ممالک میں اس کو اسقدر فتوحات حاصل ہوئیں کہ عوام کو اُس کی کرامت کا گمان پیدا ہوا بعضے جادو کا خیال کرنے لگے اور بعضوں میں جبکہ بادشاہ بیمار ہوا اُس کے منظور نظر غلام ملک کافور کو جس نے دکن کی لڑائیوں میں بڑا نام پایا تھا اُس کے مزاج میں ایسا دخل پیدا ہوا کہ اُس کو سلطنت کے خواب پریشاں دکھائی دینے لگے اور اُس نے بادشاہ کا دل خضر خاں اور شادی خاں اُس کے دونوں بیٹوں سے ایسا پھیر دیا کہ اُس کو ان کی جانب سے شک پیدا ہو گیا اور دونوں بھائیوں کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور ملک کافور کی صلاح سے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو جو بہت خورد سال تھا ولی عہد کیا اور اس کے بعد دوسرے تیسرے ہی دن ٦ شوال ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء کو انتقال کیا۔ ملک کافور نے شہاب الدین کو تخت نشین کیا اور ایک امیر کو گوالیار کے قلعے میں بھیج کر خضر خان اور شادی خان کی آنکھیں نکلوا ڈالیں اور بادشاہ کے چھوٹے بیٹے مبارک خاں کو قید کر کے اُس کی آنکھیں نکلوانے کی فکر میں تھا کہ مبشر اور بشیر نامی دو سرداروں نے جو قصر ہزار ستون کے محافظ تھے اپنی ولی نعمت کے خاندان کی تباہی دیکھ کر اس مردود کا بھی کام تمام کر دیا۔ اور مبارک خان کو قید سے نکال کر تخت سلطنت پر بٹھایا۔ قطب الدین مبارک شاہ نے تخت نشین ہو کر اوّل اوّل تو اچھا انتظام کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں عیش وعشرت میں مبتلا ہو گیا اور ایک غلام حسن نامی پر ایسا فریفتہ ہوا کہ اُس کو خسرو خاں کا خطاب دے کر وزارت کا منصب عطا کیا ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء میں قطب الدین کو توال کو گولیار بھیج کر دعوے داران سلطنت یعنی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

چوں خدایت سریرِ شاہی داد | ملکت از ماہ تا بہ ماہی داد
کوش کاسودہ داری از شاہی | عالمے راز ماہ تاماہی
بر ستمکش زعدل کم نہ کنی | بر ستمگار جز ستم نہ کنی
خاربن را برافگنی زگذر | خار کن راکنی نہال زسر
چوں بہ پیلاں علف دہی حالی | زغم مور دل مکن خالی
عالم آسودہ کن بہ نعمت وجود | تاتوخوش باشی و خدا خوشنود
چوں بہ خاصاں دہی نوالہ وجام | کامِ شاں خوش کنی بہ نعمت وکام
یاد کن زاں گدائے بے توشہ | کہ شب افتد گرسنہ درگوشہ
کہ چوفرد اشمار کارکند | اوّل از مفلساں شمار کند
پیل چوں مور رانہ پائود | پرسش از پیلبان خواہد بود
تاتوانی بہ داد و دین گرائے | کہ بود ملک زیں دوپایہ بجائے
بندہ درخوں کند چودامن چست | دیت از پادشاہ بباید جست
گرچہ در سدِ آہنی معصوم | مشوایمن زناوکِ مظلوم
ورچہ کس نیست دشمنِ تن تو | غفلتِ توبس است دشمنِ تو

شوال ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء میں علاؤ الدین خلجی کا اقبالِ سکندری پردۂ ظلمات میں غروب ہوا۔ اور شہاب الدین عمر کی تین مہینے کی برائے نام سلطنت کے بعد ۸ محرم ۷۱۷ھ ۱۳۱۷ء کوقطب الدین مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔ امیر خسروؒ نے مثنوی نہ سپہر اسی بادشاہ کے

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) اپنی بھائیوں خضر خاں اور شادی خاں اور شہاب الدین خاں کو قتل کرادیا۔ رفتہ رفتہ خسرو خاں کا ایسا عروج ہوا کہ اس کو سلطنت کی ہوس پیدا ہوئی اور اُس نے سلطنت کے عہدوں پر اپنی قوم کے آدمی بھرنا شروع کئے۔ اراکین سلطنت نے بادشاہ کو کئی بار سمجھایا مگر اس غفلت شعار بادشاہ نے جو خسرو خاں پر فریفتہ تھا ایک نہ سنی بلکہ الٹا اُن اراکینِ سلطنت کے پیچھے پڑ گیا جنھوں نے خسرو خاں کی شکایتیں کی تھیں اس غفلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ شب پنجم ماہ ربیع الاول ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء کو خسرو خاں نے بادشاہ کو قصر ہزار ستون میں بلا کر قید کرلیا اور صبح کو اپنا خطاب ناصر الدین شاہ مقرر کرکے تخت نشین ہوا۔

نام پر لکھی ہے۔ جس کے صلے میں اس نے ہاتھی کے ہموزن[1] زر و جواہر اُن کو عطا فرمایا تھا۔ امیر خسروؒ اس مثنوی میں تحریر فرماتے ہیں۔

(سلطان قطب الدین کی زبان سے)

بتاریخ ہمچوں من اسکندرے　　کند ہر کہ آرائشِ دفترے
زگنجِ گراں مایۂ بے شمار　　دہم بار پیلش پے پیل پار
مرا خود وریں رہ پدر شد دلیل　　کہ میداد زر ہم ترازوے فیل
شناسد خروکش خرور ہمنوں　　کہ از پیلبار راست وزنش فزوں
چو میراث شد پیل زر دادنم　　نہ زیباست زیں سہل بر دادنم

اس کے بعد فرماتے ہیں

شہا گنج بخشا کرم گسترا　　معانی شناسا سخن پرورا
مرا عمر کز شصت بالا گذشت　　ہمہ پیشِ شاہانِ والا گذشت
زشاہاں کسے کاوّلم کرد یاد　　معزالدنا بود شہ کیقباد
ازاں پس زفیروزہ چرخِ بلند　　شدم پیشِ فیروز شہ ارجمند
ازاں پس کہ درشہ ستائی شدم　　توانگر زگنجِ علائی شدم
شدا کنوں کہ اقبال ہمدم مرا　　نوازندہ شد قطب عالم مرا
چنیں بخششے کز توجم یافتم　　در ایّامِ پیشینہ کم یافتم
کنوں لابداز سحرِ نج چومن　　بہ اندازۂ بخشش آمد سخن
جراید کزیں پیش پرداختم　　چوں ایں نامۂ خاص کم ساختم

سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے بعد چار پانچ مہینے تک خسرو خاں کی سلطنت رہی۔ اور اراکین سلطنت کو چار و ناچار اُس کی اطاعت کرنا پڑی لیکن امیر خسروؒ نے اس

---

[1] منقول ہے کہ ایک بادشاہ نے ہاتھی کا اس طرح وزن کرایا تھا کہ ہاتھی کو ایک کشتی میں بٹھایا۔ جس قدر کشتی ہاتھی کے وزن سے پانی میں ڈوبی اس مقام پر نشان بنادیا اس کے بعد کشتی میں اس قدر اینٹ پتھر بھرے کہ اسی نشان تک پانی آگیا۔ جب ان اینٹوں اور پتھروں کا وزن کرایا گیا تو تین ہزار من پختہ شاہجہانی ہوا۔ اسی وزن پر اس صلہ کو قیاس کرنا چاہئے۔

پرُ آشوب زمانے میں دربار سلطنت سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا۔ جب غازی الملک نے جو علاؤالدین خلجی کے عہد کا ایک نامی امیر اور دیپالپور کا حاکم تھا۔ دربار کا یہ حال سنا تو اس کے دل میں غیرت اسلامی نے جوش مارا اور اپنے آقا کے خون کا بدلا لینے پر کمر باندھی اور دہلی کی طرف کوچ کیا۔ اندرپت کے میدان میں خسرو خاں سے لڑائی ہوئی جس میں خسرو خاں کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر دوسرے دن غازی الملک کے سامنے لا کر قتل کیا گیا اور یکم شعبان ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء کو سب امیروں کے اتفاق سے غازی الملک غیاث الدین تغلق[1] کے خطب سے تخت نشین ہوا اُس نے امیر خسروؒ کو اپنی مصاحبت میں رکھا اور اس قدر قدر افزائی کی کہ اس سے پہلے کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ ان کی سب سے آخری تصنیف تغلق نامہ ہے جو اسی بادشاہ کے نام پر لکھی تھی۔

---

[1] غیاث الدین تغلق بادشاہ عاقل اور سلیم الطبع اور رحیم تھا۔ نماز کا سخت پابند اور ہمیشہ باجماعت ادا کرتا تھا۔ امورات سلطنت کو نہایت عدل و انصاف سے سرانجام دیتا تھا۔ خسرو خاں اور قطب الدین کے عہد میں جو خرابیاں سلطنت میں پیدا ہو گئی تھیں انہیں اس نے اپنے حسن انتظام سے بہت جلد دور کیا۔ ۷۲۴ھ ۱۳۲۳ء میں بنگالہ کے صوبہ دار کی شکایت میں کچھ عرضیاں اس کے دربار میں آئیں، ان کی تحقیقات کے واسطے بادشاہ خود لکھنوتی کو روانہ ہوا اور ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء میں ہاں سے واپس آیا۔ شاہزادہ الغ خاں (محمد تغلق) نے تغلق آباد سے تین کوس پر افغان پور میں ایک عالی شان چوبی محل تین دن میں تیار کرایا اور وہاں بادشاہ اور امراء کی ضیافت کا سامان مہیا کیا۔ بادشاہ جس وقت کھانے سے فارغ ہوا اور ہاتھ دھونے لگا۔ یکایک محل کی چھت گر پڑی اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مشہور ہے کہ اس بادشاہ کو کسی وجہ سے حضرت سلطان المشائخ سے خصومت ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے لکھنوتی سے واپس آتے وقت حضرت کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ میں دہلی آتا ہوں اب یا تو آپ ہی وہاں رہیں گے یا میں ہی رہوں گا آپ نے اس وقت ارشاد فرمایا کہ ہنوز دہلی دور است اُسی دن سے یہ قول بطور ایک ضرب المثل کے آج تک مشہور چلا آتا ہے۔ منقول ہے کہ جب بادشاہ دہلی کے قریب آپہنچا تو بعض مریدانِ جاں نثار نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ بادشاہ اب دہلی میں آیا ہی چاہتا ہے۔ حضرت چند روز کے واسطے مصلحتاً کسی دوسرے مقام پر تشریف لے چلیں آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھ کر یہ قطعہ پڑھا۔

قطعہ

قصد ظالم بہ سوے کشتن ماست   دل مظلوم ما بہ سوے خداست
او دریں فکر تا بما چہ کند   من دریں فکر تا خدا چہ کند

۷۲۴ھ ۱۳۲۴ء میں غیاث الدین تغلق بنگالہ جاتے وقت امیر خسرو کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ واپسی کے وقت کسی خاص کام کے واسطے ان کو لکھنوتی میں چھوڑ آیا تھا۔ جہاں سے وہ اُس کی وفات کے بعد محمد شاہ تغلق کے عہد میں واپس آئے جس کا حال دوسرے مقام پر تحریر کیا جاوے گا۔

امیر خسروؒ نے غیاث الدین بلبن کے زمانہ سے محمد شاہ تغلق کے عہد تک گیارہ[۱] بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات[۲] بادشاہوں کی ملازمت اور مصاحبت کی۔ خاندان غلاماں کی با اقبال کے طلوع و غروب کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مشہور مورّخ سر ایلیٹ کی رائے ہے کہ خسرو ایسے زمانہ میں ہوا ہے کہ جب ہندوستان میں اخلاق کا خون ہو رہا تھا۔ واقعی یہ رائے بہت صحیح ہے کیونکہ غور سے دیکھنے والوں کو ہندوستان ک صفحات تاریخ میں یہ دور بہت سیاہ تاریک نظر آتا ہے اور اسی عہد کے مسلسل کشت و خون اور سازشوں اور طوائف الملوکی نے اکثر یوروپین مورخوں سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو قصاب کی دوکان کے نام سے موسوم کرایا ہے۔ اس عہد کے مختصر حالات صرف اس غرض سے بیان کئے گئے ہیں کہ ناظرین کو امیر خسروؒ کے زمانہ کا مفصّل حال معلوم ہو جاوے۔ اور نظر عبرت سے دیکھنے والوں کو دنیا میں مکافاتِ عمل سے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا موقع ملے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

سرائے آفرینش سرسری نیست ۔۔۔ زمین و آسماں بے داوری نیست
دراندیش اے حکیم از کار ایام ۔۔۔ کہ پاداشِ عملہا شد سرانجام

---

[۱] (۱) غیاث الدین بلبن۔ (۲) معز الدین کیقباد (۳) کیومرث الملقب بہ شمس الدین (چندروزہ) (۴) جلال الدین فیروز شاہ خلجی۔ (۵) رکن الدین ابراہیم شاہ (چار ماہ)۔ (۶) علاؤ الدین خلجی۔ (۷) شہاب الدین عمر تین ماہ۔ (۸) قطب الدین مبارک شاہ۔ (۹) ناصر الدین خسرو خاں۔ (۱۰) غیاث الدین تغلق شاہ۔ (۱۱) محمد تغلق۔

[۲] غیاث الدین بلبن کے عہد میں شاہزادہ محمد سلطان۔ (۲) معز الدین کیقباد۔ (۳) جلال الدین فیروز شاہ۔ (۴) علاؤ الدین خلجی۔ (۵) قطب الدین مبارک شاہ۔ (۶) غیاث الدین تغلق۔ (۷) محمد تغلق چندروزہ۔

کیقباد نے اپنے چچازاد بھائی کیخسر وکو بے قصور قتل کرایا دوسرے سال اسے بھی یہی روز بد دیکھنا پڑا جلال الدین خلجی نے سید مولی کو شہید کرا کر اپنی نیک نام سلطنت پر بدنما دھبہ لگایا لیکن تھوڑے دن بھی اطمینان سے سلطنت نہ کرنے پایا کہ خود بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ علاؤ الدین نے اپنے چچا سے جو افسوسناک برتاؤ کیا اس کی سزا اس کی اولاد کو ملی[1] کافور اپنی نمک حرامی سے فوراً ہی دنیا سے کافور ہو گیا۔ قطب الدین نے خضر خاں اور شادی خاں وغیرہ کے قتل سے اپنے ہاتھوں کو رنگا اس کے شامت اعمال سے بہت جلد اُس کا خاتمہ بھی بدترین طریق سے ہوا۔ خسرو خاں کی نمک حرامی نے خسروی کی آرزو میں اپنی عزیز جان کو بھی کھویا۔ نیازی نے بلند پروازی سے دنیا کے مکافاتِ عمل کا کیا خوب خاکہ کھینچا ہے۔ مثنوی

صبح چو خورشید علم برفراشت — نقشِ دگر اخترِ عالم نگاشت
تافت چو برسطح زمین وزماں — فیضِ ساں گشت بہ بحر و بہ کاں
تاکہ زاطوار قضاوقدر — مورِ ضعیفے بہ یکے رہگذر
بود زناسازیِ نفسِ لئیم — از پئے یک دانۂ مقصود یافت
دانہ کش از رہ چو بروں پانہاد — چشمکِ مرغ بر واو فتاد
حملۂ بیداد بریں مور کرد — روز براں چوں شبِ دیجور کرد
کرد تقاضائے فرو بردنش — بُرد وچو منقار بہ خوں خوردنش
تاشدہ آں مور بہ حلقش فرد — مرغِ دگر حملہ در آمد برد
کرد ورا بال بہ چنگال بند — تا سرش از کزلکِ منقار کند
مرغکے ار کرد دل مور ریش — یافت ہماں لحظہ مکافاتِ خویش
تا بتوانی بہ کسے بد مکن — نیک زی ودشمنِ خود مکن
پند نیازی بشنوز نہار — تا نخوری خون زہد روزگار

[1] منقول ہے کہ جب علاؤ الدین کے خاندان کی تباہی ہوئی تو ایک مجذوب صاحب کمال سے کسی نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہوتا ہے انہوں نے جواب دیا کہ جو آگ علاؤ الدین نے اپنے ولی نعمت چچا کے خاندان میں لگائی تھی وہ اس کے خاندان کے آگے آئی ہے۔

سلطنت کے اس پے در پے انقلاب اور متواتر تغیرات نے سیکڑوں شریف خاندانوں اور اہلِ فضل وکمال کو تباہ وبرباد کر دیا کیونکہ ہر بادشاہ کی تباہی کے ساتھ ہی اُس کے امرا اور مصاحبین اور متعلقین پر بھی تباہی آنا ضروری بات تھی۔ امیر خسروؒ کی ہر دلعزیزی سلامت روی اور دانشمندی اور نیک نیتی وغیرہ کے اوصاف وخوبی کی اس سے زیادہ کیا سند پیش کی جا سکتی ہے کہ اس پُر آشوب زمانہ میں ہر بادشاہ کے عہد میں اُن کی قدر ومنزلت بڑھتی ہی گئی اور انہوں نے باوجود اس کے کہ جاہ وجلال کے ایسے اوج کمال پر پہنچے کہ جہاں تک پہنچنا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے لیکن نہایت دانشمندی سے کسی وقت میں اموراتِ سلطنت میں دخل نہیں دیا نہ سلطنت کی کسی مالی وملکی خدمت کا لینا پسند کیا۔ اُن کی اس دانشمندانہ حکمت عملی کی جس قدر تعریف وتوصیف کی جاوے کم ہے۔

☆☆

باب چہارم

وفات، مذہب اخلاق وعادات اور اولاد

وفات

امیر خسرو جیسا کہ باب سوم میں لکھا گیا ہے ۷۲۴ھ ۱۳۲۳ء میں سلطان غیاث الدین تغلق کے ہمراہ لکھنوتی تشریف لے گئے تھے ہنوز وہاں سے واپس نہ آنے پائے کہ ۱۷ یا ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء کو حضرت سلطان المشائخؒ نے وصال فرمایا جب لکھنوتی میں ان کو اس حادثۂ جانکاہ کا حال معلوم ہوا نہایت بے تاب ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے اور بہ تعجیل تمام روتے پیٹتے دہلی پہنچے اور سر کے تمام بال کٹوا کر اور منہ سیاہ کر کے مزار مقدس حضرت سلطان المشائخؒ پر حاضر ہوئے اور دروازہ خانقاہ پر پہنچ کر اوّل یہ شعر پڑھا ؎

ایں مکانیست کہ منزلگہ جاناں بودہ است — راہ آمد شد ایں سروِ خراماں بودہ است

اس کے بعد اندر جا کر نہایت رقت سے فرمایا کہ سبحان اللہ آفتاب زیر زمین نہاں ہو اور خسرو زندہ ہے۔ اس کے بعد کششِ عشق اور جذبۂ محبت کے جوش و خروش میں اپنا سر مزار مبارک پر دے مارا اور ہندی میں یہ شعر پڑھ کر بے ہوش ہو گئے ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

جب ہوش آیا کہا کہ اے مسلمانان من کدام کس باشم کہ برائے ایں چنیں بادشاہے بگریم فاما برائے خود گریم کہ بعد از سلطان المشائخؒ مرا چنداں بقائے نخواہد بود۔

اس کے بعد اپنا کل مال و اسباب نقد و جنس فقرا اور مساکین پر تقسیم کیا۔ اور اس کا ثواب حضرت سلطان المشائخ کی روح کو پہنچایا اور کُل امورات دنیوی سے دستکش ہو کر سیاہ کپڑے پہنے اور مزار شریف پر آ بیٹھے[1] اور غمِ مفارقتِ پیر بزرگوار میں شب و روز مثلِ ماہی بے آب تڑپتے تھے ؎

چشمہائے عاشقا نرا خواب نیست یک زماں آں چشمہا بے آب نیست
خواب را بادیدۂ عاشق چہ کار چشمِ اوچوں شمع باید اشکبار

اسی رنج و الم میں چھ مہینے کے بعد بدھ کے دن ۱۸ شوال[2] ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء کو انہوں نے بھی اس دار ناپائدار سے بجانب روضۂ قدس انتقال فرمایا اور پائین اپنے مرشدِ کامل کے یارانِ چبوترہ پر مدفون ہوئے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ رباعی

دریں سرائے فنا فکرِ سرسری ہیچ است غمِ گدائی وفکرِ توانگری ہیچ است
بچشمِ عقل اگر بنگری جہاں خوابیست بخواب شادی وغم ہر چہ بنگری ہیچ است

(نکتہ) امیر خسرو نے مثنوی خضر خاں میں جس مقام پر حضرت سلطان المشائخ کا ذکر کیا ہے وہاں یہ تمنا بھی ظاہر کی تھی ؎

کلاش را نیارم نام گیرم
زہے بخت ار تہِ پالش بمیرم

چونکہ اُن کی یہ تمنّٰی صمیم قلب سے تھی لہٰذا یہ بیت بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہوئی اور وہ اس سعادت سے مشرف ہوئے۔

امیر خسروؒ خود فرماتے ہے کہ حضرت سلطان المشائخؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تیری زندگی میری بقا پر موقوف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ امیدوار ہوں کہ حضور کے قدموں پر مروں۔

منقول ہے کہ حضرت سلطان المشائخؒ نے اکثر ارشاد فرمایا ہے کہ امیر خسروؒ میرے

---

[1] سفینۃ الاولیا۔ مونس الارواح۔ تذکرۃ الواصلین۔ جواہر فریدی۔ فرشتہ۔

[2] تاریخ فرشتہ میں تاریخ رحلت ۱۹ ذیقعدہ ۷۲۵ھ یوم پنجشنبہ اور بعض تذکروں میں ۱۳ شوال لکھی ہے۔ لیکن تحقیقات سے ۱۸ شوال ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بعد زندہ نہ رہے گا۔ جب رحلت کرے میرے پہلو میں دفن کرنا کیونکہ وہ میرا صاحبِ اسرار ہے اور مَیں بغیر اُس کے بہشت میں قدم نہ رکھوں گا اور اگر دو شخصوں کا ایک قبر میں دفن کرنا شریعت میں جائز ہوتا تو میں وصیّت کرتا کہ اسے میری قبر میں دفن کریں تا کہ ہم دونوں قبر میں بھی یک جا رہتے۔ سبحان اللہ کیا رتبہ ہے۔

منقول ہے کہ امیر خسروؒ جس وقت لکھنوتی سے دہلی واپس آ کر مزار مبارک پر حاضر ہوئے۔ جوش و خروش اور حالتِ بیتابی میں چاہا کہ مزار سے جا لپٹیں۔ ایک بزرگ اُس وقت وہاں تشریف رکھتے تھے انہوں نے اُن کو پکڑ لیا۔ کسی شخص نے اُن بزرگ سے بعد میں دریافت کیا کہ آپ نے ایسے عاشق کو مزار پر جانے سے کیوں روکا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس وقت امیر خسروؒ سے زیادہ حضرت سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ کو بیتابی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں مزار سے باہر نہ نکل آویں۔

جب امیر خسروؒ نے انتقال فرمایا اور لوگوں نے چاہا کہ وصیت کے مطابق ان کو حضرت سلطان المشائخ کے پہلو میں دفن کریں اُس وقت ایک خواجہ سرا کہ منصب وزارت رکھتا تھا مانع ہوا۔ اور کہا کہ حضرت کے مریدوں کو حضرتؒ اور امیر خسرو کے مزار میں شبہ واقع ہوگا۔ مجبور ہو کر اُن کو شیخ کے پائیں یاروں کے چبوترے پر دفن کیا گیا[۱]

مقبرہ

امیر خسروؒ کی وفات کے ایک سو بہتر برس بعد یعنی ۸۹۷ھ ۱۲۹۱ء میں مہدی خواجہ نے جو شہنشاہ بابر کے اُمرائے عظیم الشان سے تھا مزار کے گرد سنگ سرخ جالیدار مجر تعمیر کرا کر لوحِ مزار نصب کرائی جس پر یہ کتبہ کندہ ہے ؎

لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ

زمیں را ازیں لوح شد سر فرازی ‌‌ ‌ ‌ بہ دورانِ بابر شہنشاہِ غازی

تاریخ وفات[۲]

میر خسرو خسروِ ملکِ سخن ‌ ‌ ‌ آں محیطِ فضل دریائے کمال

۱۔ تاریخ فرشتہ

۲۔ اس تاریخ کو خواجہ حسن بصری کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

نثرِ اُو دلکش تراز ماءِ معین — نظمِ اُوصافی تراز آبِ زلال
بُلبلِ بستانسرائے بے قریں — طوطی شکّر مقالِ بے مثال
از پئے تاریخ سالِ فوتِ اُو — چوں نہادم سر بہ زانوے خیال
شد عدیم ۷۲۵ھ المثل یک تاریخ او — دیگرے شد طوطئ شکّر مقال

بیعت

زحرفِ وصل جانا سادہ باید لوح خاکِ من — طریق سادہ لوحی بس نشانِ عشق پاکِ من
مہدی خواجہ سید باجاہ وجلال — شد بانئے ایں اساس بیشہ ومنال
گفتم ہے جمیل مہدی خواجہ — تاریخ بنائے ایں چو کردند سوال

حررہ شہاب الدین العمائے الہروی

اس کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں امیر خسرو کے انتقال کے دو سو نوّے برس بعد محمد عماد حسن ابن سلطان علی سبزواری الملقب بہ طاہر بیگ نے جو امرائے عہد جہانگیری سے تھا ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء میں سنگ مرمر سے مقبرہ تعمیر کرا کر گنبد کے اندر اشعار اور عبارتِ ذیل منقوش کرائی۔

تاریخ

اے خسرو بے نظیر عالم — باروضۂ مرا نیاز است
تعمیر نمود طاہر آں را — فیض ازلی ہمیشہ باز است
تاریخ بنایش عقل گفتا — باروضہ ۱۰۱۴ھ بگو کہ جائے آز است

قایل ایں کلام و بانئے الیس مقام طاہر محمد عماد الدین حسن ابن سلطان علی سبزواری فی ۱۰۱۴ھ غفر ذنوبہ و ستر عیوبہ۔ الکاتب عبدالنبی ابن ایوب۔

ابیات

اے شربتِ عاشقی بجامت — وز دوست زماں زماں پیامت
شد سلک فرید از تو منظوم — زانست کہ شد لقب نظامت
جاوید نفاست بندہ خسرو — دیگر چوں شد بہ ہزار جاں غلامت

دیگر

مرانام نیک است وخواجہ عظیم   دو شین و دو لام و دو قاف و دو جیم
اگر نام یابی دریں حرفہا   بدانم کہ ہستی تو مرد فہیم

کاتب مذکورہ نبیرہ شیخ فرید شکر گنج۔

خیر الواصلین میں یہ تاریخ وفات کی تحریر ہے۔

خسروِ دہلوی بحکمِ خدا   بہ شب جمعہ زدارِ فنا
عمر ہفتاد و پنج سالش بود   کانزماں شد بدرگہِ معبود
ہجدہم بود از مہِ شوال   کہ گذشتہ ازیں جہانِ ملال
سالِ ترحیل از من بشنو   لفظِ فانی برآر از خسرو
۱۳۱ ۸۶۶

حضرت نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسروؒ کے مزارات کے درمیان میں اب جہاں آرا بیگم، شہزادہ جہاں اور محمد شاہ بادشاہ کے مجر بن گئے ہیں۔ زائرین کو پہلے امیر خسروؒ کے مزار کی زیارت کروائی جاتی ہے اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کی۔ ۷ شوال کو امیر خسرو کا نہایت دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے۔ جس میں ہزاروں آدمی باہر سے آکر شریک ہوتے ہیں۔

روضہ کے اطراف میں جو سنگ سرخ کی جالیوں کا احاطہ ہے اُس پر سیکڑوں برس سے سفیدی ہوتی ہے۔ جالیوں کے خوبصورت خانوں پر ایک ایک انچ سفیدی چڑھ گئی ہے۔ ایک دن خواجہ حسن نظامی صاحب خواہرزادہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کو جالی پر حروف کا سا اُبھار معلوم ہوا اُسے کھرچا تو تاریخ نکل آئی جو خواجہ موصوف نے میری استدعا پر مجھے لکھ کر بھیجدی۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہر جالی نئے نمونہ کی ہے اور عجیب وغریب گلکاری کی شان رکھتی ہے مگر افسوس کہ اُن کی خوب صورتی سفیدی میں پوشیدہ ہے۔ گورنمنٹ نے ان کی صفائی کا حکم دیا تھا مگر بعض پُرانے خیال کے لوگوں نے اس کو داخل جدت وسوء ادبی سمجھ کر مخالفت کی اس لئے صفائی نہ ہو سکی وہ تاریخ یہ ہے۔

شہِ ملکِ سخن خسرو سپہ سالارِ درویشاں   کہ نامش بست بر لوحِ جہاں چوں نقش در خارا
چناں در صورتِ خوبی سخن پرواز شف طبعش   کہ زیبے داد از انصورت بخوبی لوحِ معنی را

شُدہ غوّاص دریائے تفکّر در محیطِ فضل ‌‌ ‌ برون آورد درہائے معانی راازآں دریا
بہ تقدیرِالٰہی مرغِ روحش سدرہ مادیٰ شُد ‌ ‌ ندائے ارجعی چوں دررسید از عالمِ بالا
بہ سالِ پنج و پنج ہفتصد ازہجرت حضرت
زدارالملکِ دنیا کرد رحلق جانب عقبیٰ

عافیت بخیر باد

گذشتہ بودی وہشت ونہ صد سال ازہجرت ‌ ‌ بدورانِ ہمایوں بادشاہِ غازیئے دانا
شہنشاہے کہ بیشائد اگر گروبیاں دائم ‌ ‌ دُعائے دولتش گویندنزدِ ربِّ الاعلیٰ
رفیع القدرصاحب دولتے پاکے کہ درعالم ‌ ‌ بخودست ونباشد مثلِ اُوبے مثل وبے ہمتا
خدایا تاجہاں باشد بدولت باشد یادش ‌ ‌ خداوندِ جہاں یارومعین ناصرالاعداء

مذہب

حضرت امیر خسرؒو کا مذہب سنت و جماعت تھا۔ حنفی طریق اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ جس میں صوفی مشربی اور مرشد کامل کی توجہ نے حقائق و معارف کے دروازے کھول دیئے تھے وہ احکام اور فرائض شریعت کو کمال عقیدت اور نیازمندی سے بجالاتے تھے۔ باوجود مشل امارت اُن کی ریاضت اس قدر درجہ اعلیٰ پر پہنچی تھی کہ چالیس برس برابر صائم الدہر رہے۔[1] ہر شب کو ایک کلام مجید ختم کرتے تھے[2] اور نماز تہجد میں سات پارے پڑھا کرتے تھے[3]

عارف کامل مولانا جامیؒ نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ پانچ مرتبہ خواب میں حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اپنے پیر حضرت سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ اگر قیامت کے دن خداوند تعالیٰ مجھ سے فرماوے گا کہ دنیا سے میرے واسطے کیا لایا تو میں ترک اللہ کو پیش کروں گا۔[4] آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کسی چیز پر ناز کرے گا اور میں اس ترک اللہ کے سوز سینہ پر ناز کروں گا اور خدا مجھے اس ترک کے سوز سینہ کے سبب بخشے[5] اس موقعہ پر یہ شعر بھی آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ مونس الارواح۔ سفینۃ الاولیا۔ نفحات الانس۔ تاریخ فیروزشاہی وغیرہ

[2] تذکرۃ الکاملین۔ ‌ ‌ [3] سیر الاولیا۔ مونس الارواح وغیرہ

[4] سفینۃ الاولیا۔ مونس الارواح وغیرہ۔ ‌ ‌ [5] تاریخ فرشتہ۔ نفحات الانس

گرز بہرِ ترک تُرکم ارّہ برتارک نہند
تَر تارک گیرم وانانہ گرم تُرکِ تُرک

منقول ہے کہ سوزِ سینہ آتشِ عشقِ حقیقی سے اس قدر تھا کہ پیراہن مبارک آپ کا قلب کی جگہ سے ہمیشہ سوختہ رہا کرتا تھا۔ بلکہ یہ کیفیت تھی کہ جس وقت نیا کپڑا پہنتے اُسی وقت دل کی جگہ سے جل جاتا تھا۔[1]

اخلاق وعادات

امیر خسروؒ کی تصنیف وتالیف اور ان کے حالات سے جو مصنفوں اور تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں واضح ہوتا ہے کہ خوش اخلاقی، سخاوت وراستی، نیاز وخاکساری، خوش مزاجی دیار باشی میں وہ اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ خدا ترسی اور رحم وشفقت ان کی عام تھی۔ اُن کا مقولہ ہے کہ ہر کہ خود را بیند خداے را نہ بیند ہر کہ از خدا نترسد از دیا ید ترسید۔ مزاج میں تکلف بالکل نہ تھا۔ سب سے بے تکلف باتیں کرتے اور خلق ومحبت کے موتی پروتے تھے۔ کسی کی دل شکنی کرنا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ باوجود مصاحبت شاہی اور کمال جاہ وحشمت کے اپنے آپ کو کمترین مخلوق سے سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں۔

غرّہ نزدیکئے سلطاں مشو بلبلِ باغے نگسِ خواں مشو
ہست وے از خرمن ہستی خسے تاتوچہ باشی کہ کمی زوبسے

اُن میں تعصب نام کو نہ تھا ہر مذہب وملت کے لوگوں سے ایسے خلوص واخلاص سے ملتے تھے کہ کسی طرح کی دوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ امراء اور بادشاہوں کے یہاں سے قصائد مدح وغیرہ کے صلے میں جو بے شمار دولت ملتی تھی وہ سب خیرات کردیتے تھے۔ صرف اُسی کو اپنے صرف میں لاتے جو خود کسب ومحنت سے حاصل کرتے تھے۔ علاوہ دیگر شہادتوں کے خود اُن کے کلام ذیل سے پایا جاتا ہے کہ محض ابنائے جنس کی ہمدردی اور حاجت براری کی غرض سے وہ امراء اور بادشاہوں کی خدمت اور مصاحبت کی زحمت اُٹھاتے تھے۔

من کہ نہادم زسخن گنج پاک گنج زراندر نظرم چیست خاک
گردہدم تاجورِ سربلند دُر نتواں باز بہ دریا فگند

---

1. تذکرۃ الاولیاے ہند۔ سفینۃ الاولیا

ورنہ دہدزانِ خدم رائگاں رنہ نہ کردم چوتہی مائگاں
یک جوازیں فن چوبہ داماں نہم وہ کنم آنزاوبصدتن وہم
شیرم ورنج از پے یاراں برم نے چوسگ خانہ کہ تنہا خورم
ہرچہ کہ پنہاں گنی از محرماں سنگ ہماں باشد وگوہر ہماں
مارکہ گنجش بود اندرمغاک حاصل او چیست ازاں گنج پاک حاصلِ

ان کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالطبع بادشاہوں کی صحبت اور مداحی کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں۔

رباعی

از گفتنِ مدح دل بمیرد شعر ارچہ تر و فصیح باشد
گرددزنفس چراغ مردہ گر خود نفس مسیح باشد

بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں ۔

چوں من نشوی کہ ہرزمانے سازم بہ دروغ داستانے
دردل کندت ہنر فزائی پتہ نہ کنی ثناسرائی
کز مدح چودرطمع کشد پائے درصفِ سراں نباشدت جائے

ایک نصیحت آمیز خط میں بیٹے کو لکھتے ہیں۔

برنوازش بادشاہ نیز نازش نشاید زیراکہ چشمۂ خورشید چنانچہ آبروئے دہند آبروئے نیز تواند برد۔ ودریابداں آب کہ گوہر برمردم رساند۔ مردم رانیز بگوہر تواندرسانید شعر۔

الاان ذوالعقل لم یعتمد علی الماء والنّار والامر

(یعنی آگاہ ہو کہ صاحب عقل پانی اور آگ اور حاکم پر اعتماد نہیں کرتے) بادشاہ اگرچہ خنداں خنداں خزانہ گوہر کشاید بداں فتحباب دل نہ باید بست کہ دراں حال صفتِ ضحاک واردا گرچہ فریدوں دادگراست۔ بیت

ہست دنداں سپید کردن شیر ازپئے لعل کردنِ دنداں

اس کے بعد شاعری اور مدح کی برائیاں بیان کر کے لکھتے ہیں۔ چوں چنیں است صلۂ شعر راکہ گدائی است حرام بحرمت تمام برگدایانِ بے حرمت ایں کار بیاندگذاشت

وسلہ بہ مہر سکوت بہ وہاں زدوخطبہ القناعتہ مملکتہ رادرہفت اقلیم وجود بلند کرد۔قناعت بادشاہی است۔

زشاعری چومن آرایدایں چنیں آشام   زدم زشرم چوقاروں فرود زیر زمیں

سفینۃ الاولیامیں داراشکوہ تحریر کرتے ہیں کہ جس وقت شیخ سعدیؒ دہلی میں امیر خسروؒ سے ملنے تشریف لائے اُس وقت ان کے پاس صرف ایک درہم اپنی خاص محنت کی کمائی کا موجودتھاوہ انہوں نے شیخ کے سامنے پیش کیااور کہاکہ جوکچھ مال دنیوی میرے پاس ہے وہ یہ ہے جوکچھ ارشاد ہواس میں سے مہیا کروں۔شیخ نے ازراہِ ظرافت جواب دیاکہ اس کا تیل چراغ کے واسطے خریدلاؤ تاکہ تمام شب ہم تم ہم صحبت رہیں۔

حاضرجوابی اورخوش اخلاقی

حضرت سلطان المشائخ کے یہاں ایک سیّاح درویش مہمان تشریف لائے۔ رات کوکھانا کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔سیّاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئے تک ختم نہ ہوئے حضرت نے انگڑائیاں جمائیاں بھی لیں مگروہ سادہ لوح کسی طرح نہ سمجھے۔حضرت نے اخلاق کی وجہ سے مہمان کی دل شکنی گوارانہ کی اوربیٹھے رہے۔امیر خسروؒ بھی حاضر تھے مگرخاموش بیٹھے ہوئے تھے جب آدھی رات کی نوبت بجی اُس وقت حضرت نے ان سے فرمایاکہ خسروکیابجاہے اُنہوں نے جواب دیاکہ آدھی رات کی نوبت بجی ہے۔ حضرت نے ان سے کہاکہ اس میں کیاآوازآتی ہے۔فوراًجواب دیاکہ سمجھ میں توایسا آتا ہے۔نان کہ خوردی خانہ بردو۔نان کہ خوردی خانہ برو۔خانہ برو۔نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو۔خانہ بروخانہ برو۔

حرف حرف کی حرکت وسکون پرخیال کرو۔ایک ایک چوٹ کوکیاکیاپوراادا کر رہے ہیں اورنہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو۔کودیکھوکہ اس نے کیاکام کیاہے[1]۔

امیر خسروؒ کے محلّہ کے کنارے پرچموَ نام ایک بُڑھیاساقن کی دکان تھی شہر کے بیہودہ اوراوباش لوگ اُس کی دُکان پربھنگ چرس پیاکرتے تھے۔جب امیر خسروؒ اپنے گھر

[1] تذکرۂ آب حیات۔

آتے جاتے تو وہ بھی سلام کرتی اور کبھی کبھی حقہ بھر کر سامنے لے کھڑی ہوتی تھی ۔ چونکہ انہیں کسی کی دل شکنی گوارا نہ تھی لہٰذا یہ بھی اُس کی دلشکنی کے لحاظ سے دو ایک گھونٹ پی لیا کرتے تھے ایک دن اُس نے ان سے کہا کہ آپ ہزاروں غزلیں، گیت، راگ، راگنی بناتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں کوئی چیز اس لونڈی کے نام بھی بنا دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ بی چمو بہت اچھا۔ کئی دن کے بعد اس نے پھر کہا کہ بھٹیاری کے لئے خالق باری لکھ دی اگر لونڈی کے نام بھی کچھ لکھ دو گے تو کیا ہوگا آپ کے صدقہ میں ہمارا نام بھی دنیا میں رہ جاوے گا اُس کے بار بار کے کہنے سے کچھ خیال آ گیا۔ کہا کہ لو بی چمو سنو۔

اوروں کی چو پہری باجے چمو کی اٹھ پہری	بادشاہ کے یہاں اُس زمانہ میں چو پہری نوبت بجا کرتی تھی امیر خسروؒ کہتے ہیں کہ یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری	جنگلی گنواروں کا کام نہیں سفید پوش آتے ہیں پیالہ
صاف صاف کر آگے راکھے جسمیں ناہیں تو سل	بھنگ مصفے حاضر کرتی ہے۔ جس میں تُس نہ تنکا ہو
اوروں کے جہاں سینک سماوے چمو کے وہاں موسل	بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سے سینک کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ یہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے۔

امیر خسروؒ کی بدولت آج بی چمو کا نام بھی دنیا میں چلا جاتا ہے[1]

اولاد

میری قاصر نظر سے کسی تاریخ یا تذکرہ میں امیر خسروؒ کی اولاد کا حال نہیں گذرا۔ انہیں کی مختلف تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ غیاث الدین احمد، عین الدین احمد، یمین الدین مبارک تین بیٹے تھے اور ان تینوں سے بڑی ایک بیٹی تھی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی کے پیدا ہونے کے بعد انہیں بیٹے کی بڑی آرزو تھی، بیٹی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

کاش ماہِ تو ہم بچہ بودے   در رحم طفلِ ہشت مہ بودے
لیک چوں دادۂ خدائے رواست   با خداوادگاں ستیزہ خطاست

۱؎ تذکرہ آب حیات

من پذیرفتم آنچہ یزداں داد — کانچہ اوداد باز نتواں داد
شکر گویم بہرچہ ازدراوست — کاں دہد بندہ راکہ درخوراوست
ہرچہ اوداد بس پسندیدست — ہم در اوّل صلاح او دیدست
پدرم ہم زما درست آخر — مادرم نیز دخترست آخر
گرنہ پرِ دُرصدف نقاب شدے — قطرۂ آب باز آب شدے
دانہ بے کشت کے ببار آید — آسماں بے زمیں چہ کارآید
بے پدر ممکن ست شد معلوم — چوں مسیحا زمریم معصوم
لیک بے مادرِ خجستہ وجود — ولدے رانگفتہ کس مولود

امیر خسروکو اپنی اولاد سے بہت محبت تھی اوراُن کی تعلیم وتربیت پر بہ دل وجان سے مصروف تھے۔انہوں نے اپنی کل تصنیف وتالیف میں بیٹوں اور بیٹی کو قابلِ قدر نصیحتیں کرکے اُن کی آئندہ زندگی کے واسطے ایک مکمل دینی اوردنیوی دستورالعمل بنادیا تھا۔

مولانا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں تحریر فرماتے ہیں کہ سلطان فروز شاہ کے مصاحبوں میں سے تھا (ملک احمد)۔اگرچہ اس کا کوئی دیوان مشہور نہیں ہے۔مگر اُس نے جومتقدمین کے کلام میں دخل دیاہے وہ اکثر لوگوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔چنانچہ ظہیر فاریابی کی اس بیت میں تصرف کیا ہے ؎

کلاہ گوشۂ حکم تواز طریق نفاذ — ربودہ از سرِ گردوں کلاہِ جبّاری

ملک احمد نے کہا کہ اس طرح ہونا چاہئے تھا ؎

زہے طبانچۂ قہر تواز طریق نفاذ — فگندہ ازسر گردوں کلاہِ جباری

دیگر ظہیر

ایں سہل سہل بودکہ گوگرد سرخ خواست — گرنانِ خواجہ خواستی آنراچہ کردۂ

ملک احمد

ایں سہل سہل بودکہ آبِ حیات خواست — گرنانِ خواجہ خواستی آنراچہ کردۂ

ایک اس بیت میں بھی تصرف کیا ہے۔

گرمشک خواند خاکِ درت رافلک مرنج — نرخِ گہر بطعنِ خریدار نشکند

ملک احمد

گر لعل خواند سنگِ درت مشتری مرنج　　　　نرخ گہر بطعن خریدار نشکند

ان کے علاوہ بعض اور شعر بھی نظر سے گذرے ہیں مگر یاد نہیں رہے اور چونکہ ملک احمد امیر خسروؒ کے یادگار تھے اس سبب سے اُن کے اس تصرفات کو بادشاہ اور امیر اور فضلائے عہد بہت پسند کرتے اور غنیمت جانتے تھے صاحب منتخب التواریخ یا کسی دوسرے مؤرخ کی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ملک احمد امیر خسروؒ کے کس بیٹے کا خطاب تھا۔

سیر الاولیا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسروؒ کی غزل جس کا مقطع یہ ہے حضرت سلطان المشائخ کے روبرو اس خوش الحانی سے گائی تھی کہ آپ کو نہایت ذوق اور وجد پیدا ہوا تھا۔

خسرو تو کیستی کہ درآئی دریں شمار
کیں عشق تیغ برسرِ مردانِ دیں زدہ است

☆☆

باب پنجم

ایجاد واختراع

صانعِ قدرت نے امیر خسروؒ کے دل ودماغ میں عقل ودانائی کا وہ بیش بہا نورانی جواہر موجزن کیا تھا کہ یہ صاحبِ کمال نہ صرف ایک بلند خیال شاعر اور انشا پرداز ہی تھا بلکہ جامع علوم ظاہری وباطنی اور منبع کمالات صوری ومعنوی تھا۔ جس فن کو دیکھئے اُسی میں اسے کمال حاصل تھا۔ تاریخی میدان میں وہ ایک صاحب نظر مورخ اور فقہ کے عالیشان دربار میں ایک دانشمند فقیہ اور تصوف کے رنگ میں ثانی شبلیؒ وبایزید اور فن موسیقی میں کامل الفن اور شہرۂ آفاق تھا۔

ضیاءالدین برنی تاریخ فیروز شاہی کا یہ لکھنا کہ ایسا صاحب کمال جس کو اس قدر فنون میں کمال حاصل ہو نہ پیدا ہوا ہے اور نہ امید ہے کہ قیامت تک پیدا ہو کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا۔

آپ کی طبع رسا کو فن موسیقی میں ایسا دخل حاصل تھا کہ بڑے بڑے صاحب کمال موسیقی داں اور گویّے آپ کی شاگردی کو فخر سمجھتے تھے نایک گوپال جو اپنے وقت میں اس فن کا اُستاد اور یکتائے زمانہ تھا دکن سے صرف آپ کی شہرت وکمال کا حال سن کر دہلی آیا اور مدتوں آپ کی صحبت میں رہ کر کمال حاصل کیا اسی طرح جس ساونت بھی جو فن موسیقی کے کاملین میں شمار ہوتا ہے۔ آپ ہی کا صحبت یافتہ تھا[1]

آپ کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت وایجاد کا رکھتی تھی فن موسیقی میں کئی

---

[1] مطلع العلوم

چیزیں آپ کی ایجاد کردہ ہیں۔ دُھرپت کی جگہ قول وقلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے اور گیت بنائے ہیں قبولیت عام واقعی خداداد چیز ہے اس صاحبِ کمال کے کلام کو خدا نے ایسی قبولیت عام کی دولت عطا فرمائی ہے کہ باوجود اس کے کہ زمانہ چھ سو برس آگے بڑھ آیا، زبان کچھ سے کچھ ہوگئی مگر اُن کے بنائے ہوئے گیت اُسی طرح آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر جاری ہیں ورنہ لوگوں نے ہزاروں گیت بنائے اور گانے والوں نے گائے۔ آج ہوئے کل بھول گئے۔ دہلی اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں برسات کے موسم میں عام عورتیں جھولے ڈالتی ہیں اور مل مل کر جھولتی اور گیت گا کر اپنا جی خوش کرتی ہیں ان میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو۔

گیت

جو پیا آون کہہ گئے۔ آجھوں نہ آئے سوامی ہو۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے۔ آون آون کہہ گئے۔ آئے نہ بارہ ماس۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ وغیرہ۔

یہ گیت بھی آپ ہی کا ایجاد کیا ہوا ہے اور برَوا راگ میں لَے بھی انہیں کی رکھی ہوئی ہے۔ بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لئے تو ایسے گیت تھے چونکہ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پیا اور سوامی کی یاد میں اس طرح گانا مناسب نہ تھا۔ لیکن دل میں اُمنگ تو وہ بھی رکھتی تھیں۔ انہیں بھی فصل کی بہار منانی تھی۔ ان کے لئے اور گیت بنائے تھے جس میں سے ایک یہ ہے۔

اماں میرے باوا کو بھیجو............کہ ساون آیا — یعنی مجھے آکر لے جاوے
بٹی تیرا باوا تو بڈھا ری............کہ ساون آیا — یعنی وہ کیونکر آسکتا ہے
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی............کہ ساون آیا
بٹی تیرا بھائی تو بالا ری............کہ ساون آیا — یعنی بچہ اکیلا اتنی دور کیونکر آوے
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی............کہ ساون آیا
بٹی تیرا ماموں تو بانکا ری............کہ ساون آیا — بھلا وہ میری کب سنے گا [1]

بہار راگ اور بسنت کے میلے نے بھی امیر خسروؒ کی طبیعت سے ستار رنگ پکڑا ہے اور ستار کی ایجاد کا فخر بھی آپ ہی کو حاصل ہے جو بین کو مختصر کر کے ایجاد کیا ہے۔ [2]

---

[1] آب حیات۔ [2] مطلع العلوم۔ آب حیات وغیرہ

مسلمانوں میں بسنت

جس طرح ایران وتوران اور خراسان وغیرہ میں بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ میلہ بسنت اور اُس میں طرح طرح کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں اس موسم میں فصل بہار کے قدرتی جوبن سے اہلِ ہند کے دلوں میں ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے اور اس موقع پر بسنت کا تیوہار جو بسنت پنچمی کے نام سے مشہور اور موسم بہار کی ابتدا میں جب ماگھ کے مہینے میں دس دن باقی رہ جاتے ہیں منایا جاتا ہے۔ بسنت ہی سے ہولی کے مستانہ تیوہار کے رنگ اُڑنے، پچکاریاں چھٹنے، گلال کے قمقمے چلنے لوگوں کے جھوم جھوم کر مستانہ چال سے گانے بجانے کی ابتدا شروع ہو جاتی ہے۔ اُس دن راجہ، مہاراجہ بسنتی پوشاک زیب بدن کر کے دربار کو سجا کے خوشیاں مناتے ہیں۔ عوام الناس جنگلوں میں جا کر سرسوں کے بسنتی پھول اور سبزے کی قدرتی آرائش کا نہایت ذوق وشوق سے نظارہ کرتے ہیں۔ مالنیں سرسوں کے پھول اور گیہوں وغیرہ کی بالیں ہر گھر میں پہنچاتی ہیں۔ مختلف شہروں قصبوں میں میلے ہوتے ہیں جن میں زن ومرد بسنتی کپڑے پہن کر شریک ہوتے ہیں۔ غرضکہ بسنت پنچمی کے دن جدھر دیکھو بسنتی سماں ہی نظر آتا ہے۔

جب ایسی دو قومیں جن کی طرز معاشرت رسم ورواج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں باہم ملتی ہیں تو ہر وقت کے ایک جگہ رہنے سہنے، ملاقات ومحبت سے ایک کے رنگ وروپ کا سایہ دوسرے پر پڑنا ضروری بات ہے۔ چنانچہ ہندو مسلمانوں کے مدتوں کے میل جول۔ نشست وبرخاست سے ایک دوسرے کی گفتگو۔ لباس، خوراک مختلف رسومات وغیرہ پر بھی بہت بڑا اثر پڑا۔ جس کا اندازہ عام طور سے محسوس ہوتا ہے۔

یہ امر تو تاریخ سے ثابت ہے کہ مسلمانوں میں بسنت کے میلے نے ہندوستان کے بلبل ہزار داستان امیر خسروؒ کی زندہ دل اور جدت پسند طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ لیکن تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کی ابتدا کس طرح سے شروع ہوئی۔ اس کی نسبت جناب حسن نظامی صاحب خواہر زادہ حضرت سلطان المشائخ نے غالباً زبانی خاندانی روایت کی بنیاد پر پیسہ اخبار لاہور مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۴ء میں ایک مضمون تحریر فرمایا۔ ہے۔ جسے خفیف کی بیشی کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ساتویں صدی کے اختتام پر حضرت سلطان المشائخ کے حقیقی بھانجے مولانا تقی الدین نوح نے جو چھوٹے بھائی خواجہ رفیع الدین ہاروں کے تھے۔ عین عنفوان جوانی میں بعارضۂ دق اس دار ناپائدار سے انتقال فرمایا۔ حضرت سلطان المشائخ کو اپنے اس لائق ہونہار اور سعید و صالح بھانجے سے بہت الفت تھی۔ صاحب سیر الاولیا کا بیان ہے کہ حالت بیماری میں آپ نے مولانا کو اپنے روبرو طلب فرما کر بہت سے درویش اور مشائخین کے روبرو خلافت عطا فرمائی اور حسب ذیل وصیت کی۔

''باید کہ ہر چہ برتو رسد نگاہ نہ داری وآں را انجرچ رسانی اگر برتو چیزے نباشد ہیچ دل خود را نگراں نداری کہ خدا ترا خواہش داد وہیچ کسے را بد نخواہی واز خدا ہم یکے را بد نخواہی وجفا را بہ عطا بدل کنی ودیہ واد را رنستانی کہ درویش قرار داد واو را رخوار نباشد۔ اگر تو چنیں۔ باشی بادشاہاں بر در تو آیند۔

حضرت سلطان المشائخ کو اس صاحبزادے کے انتقال سے ایسا صدمہ ہوا کہ عالمِ سکوت کا طاری ہو گیا یہاں تک کہ اس صدمہ کی وجہ سے چھ ماہ تک آپ نے تبسم نہیں فرمایا۔ حضرت کے یاران اور مریدانِ جاں نثار کے علاوہ تمام دہلی میں ان صاحبزادے کے انتقال سے عالم ماتم اور کہرام تھا خصوصاً حضرت امیر خسروؒ کو علاوہ اپنے رنج وصدمے کے حضرت سلطان المشائخ کے اس صدمہ اور سکوت کی وجہ سے کسی وقت قرار نہ تھا۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتے تھے کہ کوئی سامان حضرت کی شگفتگی اور غم غلط ہونے کا پیدا کیا جاوے۔ ایک دن وہ مع اپنے چند دوستوں کے جنگل کی سیر کرتے پھرتے تھے۔ بہار کے خوش نما موسم کا آغاز تھا۔ ہرے ہرے کھیتوں میں سرسوں کے زرد پھول بہار دکھا رہے تھے۔ سامنے پہاڑی پر کالکا جی کا مندر تھا بسنت پنچمی کا دن تھا مندر پر میلہ لگا ہوا تھا اور مورت پر سرسوں کے پھولوں کا مینہ برس رہا تھا اور اکثر لوگ عجیب خودرفتگی سے ترانے الاپ رہے تھے۔ جب امیر خسروؒ نے یہ دیکھا اس خوش نما سین کا اُن کے دل پر بہت بڑا اثر پڑا۔ اُسی وقت فارسی اور ہندی کے چند شعر موزوں کیئے۔ جنگل سے سرسوں کے پھول توڑے اور پگڑی کو ذرا کج کر کے اس طرز سے باندھا کہ مستانہ شان معلوم ہوتی تھی۔ اسی ہئیت سے ان اشعار کو پڑھتے ہوئے حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت سلطانؒ المشائخ اُس

وقت حسبِ دستور مرحوم خواہرزادے کے مزار پر تشریف لائے تھے اور قریب ہی ایک برج میں رونق افروز تھے۔ آپ امیر خسروؒ کی مستانہ ادا دیکھ کر اور فارسی اور ہندی کے اشعار اس رنگ میں سن کر بہت محظوظ ہوئے اور کامل چھ مہینے کے بعد تبسم فرمایا۔ اُس دن سے آج تک بسنت پنچمی کے دن جب ہندو کالکا جی کے مندر پر جاتے ہیں تو دہلی اور قرب و جوار کے خاص اور ممتاز صوفی چند قوالوں کو لے کر سرسوں کے پھول ہاتھ میں لئے اشعار پڑھواتے ہوئے اوّل اس مقام پر جہاں حضرت سلطان المشائخ اس دن تشریف رکھتے تھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے خواہرزادہ مولانا تقی الدین نوح کے مزار پر ہوتے ہوئے حضرت کے روضۂ اقدس پر آتے ہیں کسی قدیمی کتاب میں وہ اشعار درج نہیں ہیں صرف ایک شعر فارسی اور چند ٹھمریاں ہندی کی قوالوں کی زبان پر باقی رہ گئی ہیں۔ وہ شعر یہ ہے۔

اشک ریز آمد است ابر بہار　　　ساقیا گل بریز و بادہ بیار

قوال ہندی کی ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر اسی شعر کو بار بار دہراتے ہیں۔ ہندی میں عرب یار توری بسنت منائی۔ بہت موثر ہے۔

اصل واقعہ تو یہ ہے لیکن دہلی میں پندرہ دن مختلف درگاہوں پر بسنت کے اسلامی میلے نہایت دھوم دھام اور ناچ رنگ کے جلسوں سے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں روپے صرف ہوجاتے ہیں۔ آگرے میں بھی شہر کے تمام پیشہ ور مسلمان سیلیں لے لے کر جنگلوں میں بسنت مناتے اور حلوا پوری اُڑاتے ہیں اور گھروں میں عورتیں بھی بسنتی کپڑے پہن کر کڑاہیاں چڑھا کر پکوان کرتی ہیں اور مل مل کر بسنت کے گیت گاتی ہیں۔ اور شمالی ہند کے اکثر شہروں اور قصبوں کے مسلمانوں میں کم و بیش بسنت کی رسمیں جاری ہیں۔

منقول ہے کہ ایک دن ایک کوچہ سے امیر خسروؒ کا گذر ہوا دُھنیا ایک دُکان پر روئی دُھنک رہا تھا کسی نے کہا کہ جس دُھنئے کو دیکھو ایک ہی انداز پر روئی دُھنتا ہے۔ سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں کوئی بولا قدرتی اُستاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے آپ نے فرمایا کہ سکھایا بھی ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو جانے نہیں دیا۔ کوئی بولا لفظوں میں کیونکر لا سکیں۔ فرمایا۔ در پے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ رفت رفت۔ جاں ہم رفت۔ ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ آہم رفت۔ آں ہم رفت۔ آنہم آنہم۔

آنہم آنہم رفت رفتن۔ رفتن رفتن دِہ۔ دِہ۔ دِہ۔ رفتن دِہ۔ رف۔ رف رفتن دہ۔ رفتن دہ[1]

منقول ہے کہ جب حضرت سلطان المشائخ کی یہ خواہش ہوتی کہ قوالی سُنیں تو امیر خسروؒ اور میر حسنؒ حضرت کے جانب راست بیٹھتے اور مُبشّر غلام زرخرید آپ کے جانب چپ بیٹھتا تھا، مجلس میں درویشانِ صاحب کمال اور صوفیانِ اہلِ وجد و حال کثرت سے جمع ہوتے تھے اوّل امیر خسروؒ صوفیانہ طریقے سے غزلیں اور بیتیں پڑھتے اور جس بیت پر حضرت سلطان المشائخ اپنا سر ہلاتے اُس کو امیر حسنؒ اور مبشّر مکرر سہ کرر زبان پر لاتے اور ایسا سماں باندھتے تھے کہ حضرت وجد میں آجاتے تھے۔[2]

صاحب سیر الاولیا تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن جبکہ غیاث پور میں میرے والد ماجد کے مکان پر امیر خسروؒ نے حضرت سلطان المشائخ اور بزرگانِ شہر کی دعوت فرمائی تھی سماع شروع ہوا۔ اوّل بہلول قوّال نے امیر حسنؒ کی غزل گائی۔

یہ بھی صاحب سیر الاولیا سے منقول ہے کہ ایک دن امیر خسروؒ کو قوالی میں ذوق پیدا ہوا اور وہ ہاتھ اُٹھا کر رقص کرنے لگے۔ اُس وقت حضرت سلطان المشائخ نے ان کو اپنے پاس بلا کر ارشاد فرمایا کہ تم دنیا سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارے واسطے جائز نہیں ہے کہ ہاتھ اٹھا کر رقص کرو شیخ سعدیؒ کیا خوب فرماتے ہیں۔

رقص وقتے مسلمت باشد کاستیں گزدو عالم افشانی

ایک مرتبہ ایک گویّے اور حضرت امیر خسروؒ سے موسیقی اور شاعری کے متعلق بحث ہو پڑی دربار شاہی کا گویّا جو اُصول ادب سے پورا واقف اور مختلف علوم کا ماہر تھا کہنے لگا کہ موسیقی کو علم حکمت میں شمار کیا گیا ہے۔ اور موسیقی دلوں پر خاص اثر ڈالنے کا ذریعہ ہے۔ امیر خسروؒ نے جواب دیا کہ میں علم موسیقی اور شاعری دونوں سے واقف ہوں۔ موسیقی سے اگرچہ دلوں پر خاص اثر پڑتا ہے لیکن شعر خاص حکمت ہے اور موسیقی کو شعر کی ضرورت ہے۔ مگر شعر کو موسیقی کی ضرورت نہیں اس کے لطائف بلاواسطہ موسیقی دل پر اثر کرتے ہیں۔ یہ دلچسپ مکالمہ یہ ہے۔

---

[1] تذکرہ آب حیات۔ [2] تذکرۃ الواصلین۔ تاریخ فرشتہ

حسن اخلاق از خرد منداں تواں کردن طلب
خربود آں کوادب جُستن بسوے خربود
بے خرد راعیب نتواں کرد در ترک ادب
عیب نبود مور برتخت سلیماں گربود
مطربے مے گفت خسروؒ راکہ اے گنجِ سخن
علمِ موسیقی زجنسِ نظم نیکو تربود
زانکہ ایں علمے ست کز وقت نیاید برقلم
واں نہ دشوار ست کاندر کاغذ دفتربود
پاسخش گفتم کہ من درھردومعنی کاملم
ہردوراسنجیدہ بروز نے کہ آں بہتربود
فرق من گویم میانِ ہردومعقول ودرست
تادہد انصاف آں کزہر دودانشوربود
نظم راعلمے تصور کن بنفسِ خود تمام
گونہ محتاجِ سماع وصوت غنیاگربود
گرکسے بے زیروبم نظم فروخواندرواست
نے بمعنی ہیچ نقصان نے بہ لفظ اندربود
درکندمطرب بسے ہاں ہاں دھوں ہوں درسرود
چوں سخن نبود ہمہ معنیٔ او ابتر بود
نائے زن رابیں کہ صوتے وارد وگفتارنے
لاجرم در قول محتاجِ کسے دیگر بود
پس دریں صورت ضرورت صاحب صوت وسماع
از برائے شعر محتاجِ سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسی دان و نغمہ زیورش
نیست عیبے گر عروسِ خوب بے زیور بود

من کسے را آدمی دانم کہ داند ایں قدر
ورنہ داند پر سد از من ورنہ پرسد خر بود

ایک قلمی پرانی کتاب میں امیر خسروؒ کا ایک رقعہ بھی علم موسیقی کی نسبت نظر سے گذرا ہے۔ جس کی نقل درج کی جاتی ہے۔ جس مقام سے پڑھا نہیں گیا وہاں لکیر کھینچ دی گئی ہے۔

رقعہ بعلم وموسیقی بہ یار تحقیق

بشنو اے یار حقیقی علم موسیقی عجب علم ایست۔ طوطئ قفس ناطقہ بے علائق جسمانی در شکرستان ذوق محظوظ گشتہ وعندلیب ارواح از زمرہ روح افزا روح الارواح پر شوق محو شدہ در قالب در آمد۔ وقانون نغمہ عیش دار غنونِ عشرت وطنبور طرب ساز کردہ بایں ترانہ تن زد۔ بیت

تن چو در آید بہ نوائے سرود　　آہنگ　　ہوائے　　تو بود

سبحان اللہ عجیب وغریب ترانہ است کہ مردانِ صاحبِ حال در عشق ابرو ماہ ہلال از پردہ مدار بر آمدہ۔ سوائے غزل و آہنگ چنگ در سماع آمدند بغیر نشاءِ آب انگور —— عرب و عجم سرمست شدہ از کوچک و بزرگ دست افشاں و پاے کوباں تن تن گویانند۔ بیت

تن تن بگوے اے دل تا تن زتن بدانی　　تا نقش ہر تنے را از ہر تنے بخوانی

مدعا کہ ہیچ شمہ مارا ازیں ساز پر گداز رہائی نیست۔ بیت

چہ رہ بود ایں کہ زد در پردہ مطرب　　کہ مے رقصند باہم مست وہشیار

تانہ عشاق در حقیقت ومجاز وسوز یوز اصفہان وعراق پر فراق چہ رسد اولی وے انسب آنست کہ ہوشمند دانش پیوند شکر خند نہادی رنگ تبریز انگیز وصدائے در آور بگو سر راہ کم نکند پیوستہ سلک سلوک سلمک ولوسلک کہ نوا سوز انداز سما تا سمک از دست ندہد ومقامات اصل شتافتہ ہموارہ آں یگانہ در دوگانہ شب دراز سہ گانہ موالید عشرت جہان افروز وچہار ارکان حیرت نشان بہ ادائے بے ریائی پنجگانہ خلاصہ اوقات را مصروف دارد۔ یقین داں کہ دریں حال قوالان مغلوب ومسکوب وراست کاران برگزیدہ محبوب۔ ع

از ہمہ غم رستی اگر رارستی

ملا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ میں بواقعات ۱۰۴۷ھ ایک واقعہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ قبل امیر خسروؒ کے ہندوستان کے قدیم گویوں کا مدار تصانیفی پر جسے گیت

اور چندوا ور دہروا ور استت کہتے ہیں، تھا لیکن چونکہ یہ نغمات کرناٹکی زبان میں تھے جسے اِس طرف کے آدمی نہیں سمجھتے تھے اس وجہ سے سامعین کو کچھ لطف نہیں آتا تھا امیر خسروؒ نے حسبِ ذیل چار نئے رات ایجاد کئے۔

اوّل قول بقانون گیت جو بزبان عربی یا فارسی نظم یا نثر پر مشتمل تھا۔ اور جس کی بنیاد ایک یا دو تین یا چار تال پر رکھی تھی۔

دوم فارسی۔ اس میں اشعار فارسی کو ساتھ ترانہ کے اوپر ایک تال کے فراہم کیا تھا۔

سوم ترانہ۔ کہ بے اشعار کے بنیاد اُس کی اوپر ایک تال کے رکھی تھی۔

چہارم تصانیفی۔ ہندی زبان میں مثل خیال وغیرہ کے ایجاد کئے ہیں۔

ہماری زبان اُردو اور امیر خسروؒ

اُردو بولنے والے بہت سے لوگ اِس امر سے واقف ہیں کہ ہماری زبان اُردو کی ماں برج بھاشا ہے جو ہندوستان میں اہل اسلام کے آنے سے پہلے شمالی ہند کے عوام کی زبان تھی اس کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں آئے وہ عام طور سے وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے جس میں عربی ترکی الفاظ کثرت سے موجود تھے چونکہ ہر وقت ایک جگہ کے رہنے سہنے۔ باہمی مقدمہ معاملہ۔ لین دین میں ایک دوسرے کے الفاظ کے بغیر بولے چارہ نہ تھا اس ارتباط اور اختلاط سے قدرتاً ایک تیسری زبان پیدا ہونا شروع ہوئی۔

یہ امر غالباً دلچسپی سے دیکھا جاوے گا کہ اقلیم تصنیف و تالیف میں سب سے پہلے امیر خسروؒ کی اختراع پسند طبیعت نے ایک نیا طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا یعنی برج بھاشا کی زمین میں فارسی کا بیج بویا اور اُس سے وہ ہونہار بچہ عالم ظہور میں آیا جس نے پیدا ہو کر ہندی اور ہوش سنبھال کر ریختہ اور جوانی کے عالم پر پہنچ کر اُردو نام اختیار کیا۔ خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کے ورد زباں ہے اسی طلسم خانہ انشاء پردازی کی بنیاد ہے۔ یہ اُس وقت کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں، مکرنیاں، انمل، دوسخنے وغیرہ امیر خسروؒ کی یادگار سے اس وقت تک باقی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جیسی اس زمانے میں یہ چیزیں مقبول خلائق تھیں ویسی ہی آج بھی ہیں نمونہ کے طور پر اُن میں سے

کچھ درج کی جاتی ہیں[1]

آنکھوں کے علاج میں ایک مجرب نسخہ دوہروں کی بحر میں لکھتے ہیں۔

لودھ، پھٹکری، مردہ سنگ　　ہلدی، زیرہ، ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار　　اُورد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے　　ترت پیر نینوں کی ہرے

پہیلیاں

بنولی کی پہیلی

تر ورسے ایک تریا اُتری اُس نے بہت رجھایا　　باپ کا اس کے نام پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیار ابوجھ پہیلی موری　　امیر خسرو یوں کہیں اپنا نام بنولی

آئینہ کی پہیلی

فارسی بولے آئینہ ترکی سوچے پائے نا　　ہندی بولی آرسی آئے منہ دیکھو جو اسے بتائے

ناخن کی پہیلی

بیسوں کا سر کاٹ لیا۔ نا مارا نا خون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے　　دیکھ سفیدی، موت انگارا گونگے سے بھر جائے
بانس کا مندر وا کا باشا۔ باشے کا وہ کھاجا　　سنگ ملے تو سر پر راکھیں وا کو راور اجا
سی سی کر کے نام بتایا تا میں بیٹھا ایک　　اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سُن لے مرے لال　　عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

مکرنیاں

مکرنیوں کا موجود بھی امیر خسروؒ کو کہا جاتا ہے۔

مکرنی (۱) سگری رین موہے سنگ جاگا　　بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا　　اے سکھی ساجن۔ نا سکھی دیا

---

[1] تذکرہ آب حیات۔

مکرنی (۲) سرب سلونا سب گن نیکا	وابن سب جگ لاگے پھیکا
واکے سر پر ہووے کون	اے سکھی ساجن۔ نا سکھی لون
مکرنی (۳) وہ آوے تب شادی ہووے	اُس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگیں واکے بول	اے سکھی ساجن۔نا سکھی ڈھول

ڈھکوسلا

ڈھکوسلا بھی آپ ہی کی ایجاد سے ہے۔

ڈھکوسلا۔ بھادوں کی پکّی پپلی۔ چو چو پڑی کپاس۔ بی مہترانی دال پکاؤ گی۔ یا ننگا ہی سو رہوں۔

دو سخنے

ہندی۔	گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا	..........گلا نہ تھا
	جوتہ کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا	..........تلا نہ تھا
ہندی فارسی۔	سوداگر را چہ مے باید۔ بوچے کو کیا چاہئے	..........دکان
	تشنہ را چہ مے باید۔ ملاپ کو کیا چاہئے	..........چاہ
	شکار بچہ مے باید کرد۔ قوت مغز کو کیا چاہئے	..........بادام

ایجادات متعلق انشا پردازی

اس بلند خیال اور عالی دماغ باغبان نے گلستان انشاء پردازی میں جو نئے پیوند لگائے ہیں ان کا اگر مفصّل حال بیان کیا جائے تو اُس کے واسطے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ جن صاحبوں کو گلستان انشاء پردازی کی سیر کا شوق ہو وہ ان کی کتاب اعجازِ خسروی کو ملاحظہ فرمالیں، اور دیکھیں کہ اس صاحبِ کمال نے کیا کمال دکھایا ہے۔ اس مقام پر نمونہ کے طور پر چند معمے مترجم درج کیے جاتے ہیں۔ طریق خاص امیر خسرو کا وضع کردہ ہے اور اس کا قاعدہ یہ ہے کہ معمہ میں لفظ فارسی کا لاکر عربی میں اور عربی کا لاکر فارسی میں ترجمہ کر کے معمّے کو حل کیا جاتا ہے امیر خسرؒو کا دعویٰ تھا کہ وہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی چاروں زبان کے ہر نام کا خواہ وہ مفرد ہو یا مرکّب معمہ بنا سکتے ہیں۔

ابوبکر۔رباعی

شب خواجہ ابوبکر بدیدم در راہ　　گفتم کہ شوم زسر نامش آگاہ
مارا چو ز درہاے عرب بیروں در　　برعکس سوار شد زتیزی ناگاہ

نمونے کے طور پر اس معمے کا حل بھی درج کیا جاتا ہے۔

درہاے کا ترجمہ عربی میں ابواب ہے اور ما کا ترجمہ آب۔ابواب میں سے آب کو نکال لیا تو ابو باقی رہا۔سوار شد کا ترجمہ رکب ہوا۔اس کو لوٹا تو بکر ہوا اور دونوں کو ملایا تو ابوبکر ہو گیا۔

حسین

اے خواجہ حسین مکرم نیکو نام　　در نام خود از بندہ شنو رمز تمام
نیمے ز فرد تیغ یمانی بشکن　　وز بالا باز گونہ کن نیم نیام

فاطمہ

امشب کہ مرا بود بہ بازار گذر　　مے جستم از فاطمۂ خویش خبر
لفظ اندازی برفت بالائے قمر　　ماہے بسرش بود بیفتاد زسر

خدیجہ

آنم کہ مرا وصفِ ثنا حاجت نیست　　نامت چو خدیجہ است ثنا حاجت نیست
رخسارۂ من از سرِ کوشش دیدی　　کوشش نیک است رہنما حاجت نیست

ابراہیم

ابراہیما نام تو چوں بر خواندم　　بنوشتم و مشک از سر کلک افشاندم
یک سوزنِ دُم شکستہ دیدم ناگاہ　　اندر تہِ آں نگر کہ حیراں ماندم

زیبا

روے زیبا چو ماہ در مقنع بین　　در ذکر رخش غلغلہ در مجمع بین
اوماہ رفیع نام اوارفع بیں　　بالاش آبی واز فرودش مع بیں

گنگا

گنگا کہ روے از لطف وصفا شد روشن　　نامش برخواں کہ آبت آید بہ دہن
از دانہ سنبلہ ذنب بیروں بُر　　وانگاہ بگیر ثور و پالیش بشکن

منقول ہے کہ جب مولانا جمالی کنبوہ دہلویؒ صاحب سیر العارفین ایامِ سیاحت میں شہر ہرات میں پہونچے۔ درازی سفر سے پریشان حال تھے۔ قلندرانہ صورت ہو رہی تھی۔ سوائے ایک تہ بند کے بدن پر دوسرا لباس نہ تھا۔ اسی حالت میں مولانا جامی علیہ الرحمۃ کو تلاش کرتے ہوئے اُن کے پاس پہونچے اور سلام علیک کر کے بے دھڑک اُن کے برابر جا بیٹھے۔ مولوی جامیؒ کو ایک اجنبی قلندر کی یہ حرکت پسند نہ آئی برافروختہ ہو کر بولے کہ "میاں خر و تو چند فرق است۔" مولانا نے بالشت بیچ میں رکھ دی۔ یہ برجستہ جواب سن کر مولوی جامیؒ سمجھے کہ یہ بھی کوئی چیز ہے۔ تحمل سے بولے "کیستی" جواب ملا "از خاکسترانِ ہند" اِن کا کلام وہاں پہونچ چکا تھا، مولوی جامی نے پوچھا "از سخنانِ جمالی چیزے یادداری" مولانا نے یہ شعر سُنائے۔

کز کے بوریاؤ پوستکے ۔۔۔ دلکے پُر زدردِ دوس ستکے
لُنگلے زیرو لُنگلے بالا ۔۔۔ نے غمِ دُزد ونے غمِ کالا
ایں قدر بس بود جمالی رات ۔۔۔ عاشقِ رندِ لاؤبالی را

جامیؒ نے فرمایا "طبع شعر داری" مولانا نے فی البدیہ حسب ذیل یہ مطلع پڑھا۔

مارا ز خاکِ کویت پیراہنے ست برتن ۔۔۔ آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بہ دامن

یہ پڑھ کر آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بدن برہنہ تھا۔ گرد جمی ہوئی تھی سینہ پر آنسو گر کر گرد چاک چاک ہو گئی۔ جامی سمجھ گئے کہ یہ ہی جمالیؒ ہیں۔ بیساختہ اُٹھ کر گلے ملے۔ تعظیم و تکریم کی اور نہایت گرم جوشی سے علمی باتیں چھڑ گئیں۔ مولوی جامیؒ نے فرمایا کہ امیر خسروؒ کا بھی کوئی معمّا یاد ہے۔ جواب دیا کہ امیر کے معمّے دو قسم کے ہیں۔ ایک قولی دوسرے فعلی۔ کس قسم کا معمّا سناؤں۔ مولوی جامیؒ بولے کہ آج تک قولی معمّے سُنے تھے۔ فعلی معمّے کیسے ہوتے ہیں۔ مولانا اوّل سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر خمیدہ ہو گئے۔ اس کے بعد ریش (ڈاڑھی) کو ہاتھ سے جھاڑا۔ اور کہا کہ حضرت امیر خسروؒ کا یہ فعلی معمّا ہے۔ مولوی جامیؒ خود عالی دماغ اور نازک خیال تھے فوراً سمجھ گئے کہ یہ معمّا ادریس کے نام کا ہے۔ کیونکہ سیدھے کھڑے ہونے سے الف اور خمیدگی سے دال اور ریش جھاڑنے سے شین کے نقطے اُڑانے سے مراد ہے ان سب کو ملایا تو ادریس ہو گیا۔ مولانا نے کہا بہت صحیح ہے۔

☆☆

باب ششم

علمیت۔تصانیف اوراس پر رائے

انسان جب مرتا ہے تو اُس کا نام بھی مٹ جاتا ہے مگر صاحبانِ تصنیف وتالیف کی زندگی بھی عجیب اوران کی موت بھی عجیب ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ زندہ رہتے اور زندہ کہلاتے ہیں۔اور زندوں کی طرح بولتے چالتے ہیں۔چشمۂ آبِ حیات جسے ہم سنتے آئے ہیں وہ صرف ایک فرضی اورخیال چشمہ ہے اس کو نہ کسی نے دیکھا اور نہ اُس کا پانی پیا۔دراصل آبِ حیات تصنیف وتالیف اور نیک زندگی کا نام ہے کہ جس کی وجہ سے انسان کو بقائے دوام کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔حضرت امیر خسروؒ کے حالات زندگی کی نہایت دل آویز تصویراُن کی نیک نام زندگی اور تصنیف وتالیف اوران کا بےنظیر کلام ہے کہ جس کی وجہ سے اس صاحبِ کمال کو بقائے دوام کا مرتبہ حاصل ہے۔زمانہ نے ان کی تصنیف وتالیف اور مبارک کلام کو قبولیت عام کی سند عطا فرما کر فصاحت کے کتب خانہ میں جگہ دی ہے۔ہندوستانیوں کے کلام میں جو قبولیت اور شہرت اس منتخب روزگار کے کلام کو حاصل ہوئی ہے وہ بہت کم کسی کے کلام کو نصیب ہوئی اور حقیقت تو یہ ہے کہ سرزمینِ ہند سے اس فرزانۂ روزگار نے اٹھ کر ایرانی اربابِ فضل وکمال پر روشن کردیا کہ فصاحت وبلاغت صرف اُنہیں کا حصّہ نہیں ہے اوراپنے اس دعوے کی تائید میں بڑے بڑے فضلا اور اہلِ کمال سے محضر لکھوالیا۔مشرقی شعراء کے سرتاج اور اخلاقی فلاسفروں کے شہنشاہ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے نہ صرف اُن کے کلام کو پسند کیا بلکہ شاہزادہ محمد سلطان کو یہ بھی لکھا کہ خسروؒ دہلوی اس فن میں کامل ہے اس کو مغتنمات سے سمجھ کر عزیز رکھو[1]۔عارف کامل مولانا جامیؒ کا قول ہے کہ

---

[1] تذکرۃ الکاملین

امیر خسرؒو نے ہر میدان میں قدم مارا ہے۔ قصیدے کہے۔ غزلیات کا دیوان لکھا۔ مثنویاں لکھیں۔ اور سب کو کمال کے درجے تک پہنچا دیا۔

امیر خسرؒو عربی، فارسی، ترکی، ہندی[1] چار زبانوں کے فاضل اور نظم ونثر دونوں میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ آپ کی کثرتِ تصنیف وتالیف کا حال اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ صرف آپ کی اُن کتابوں کی تعداد جو سلک نظم میں منسلک کیں ننانوے ۹۹ اور آپ کے اشعار کی تعداد علاوہ کلام ہندی کے چار اور پانچ لاکھ کے درمیان میں بتائی جاتی ہے۔ حاجی لطف علی خاں آذر صاحبِ تذکرہ آتشکدہ کا بیان ہے کہ اس تعداد میں سے ایک لاکھ اشعار خود میری نظر سے گذرے ہیں۔ ضیاء الدین برنی صاحبِ تاریخ فیروز شاہی تحریر کرتے ہیں کہ ان کی تصنیف وتالیف اس قدر ہے کہ نظم ونثر میں گویا انہوں نے ایک کتب خانہ تصنیف کر دیا ہے۔

قاعدہ ہے کہ علمی قدردانی اور کتابوں کی حفاظت امن وامان کے زمانہ میں ہُوا کرتی ہے۔ امیر خسرؒو نے زمانہ اچھا نہ پایا خود ان کے عہد اور ان کی وفات سے شہنشاہ اکبر کی پُرامن سلطنت تک (یعنی ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء سے ۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء تک) دو سوڈھائی سو برس برابر طوائف الملوکی کا بازار گرم رہا۔ اگرچہ ہندوستانیوں کی یورپ والوں کی طرح کبھی اس طرف توجہ نہیں ہوئی کہ نامور شعراء اور مصنفوں اور دیگر ارباب کمال کی یادگاریں قائم کر کے ان کی تصنیف وتالیف اور کمالات کی یادگاروں کو حوادثِ روزگار سے محفوظ رکھنے کا انتظام کرتے مگر اس طوائف الملوکی اور روز مرّہ کے ملکی تغیرات نے اور بھی کسی کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اور سیکڑوں ہزاروں نادرونایاب کتابیں کس مپرسی کی حالت میں ہمیشہ کیلئے صفحۂ دنیا سے نیست ونابود ہو گئیں اس کے بعد اکبر وجہانگیر اور شاہجہاں اور عالمگیر کی پُرامن سلطنت میں ان کی علمی قدردانی سے جو ذخیرہ جمع ہوا اُس میں سے کچھ تو ۱۸۵۷ء کے خوفناک غدر میں ضائع ہو گیا اور جو کچھ باقی بچا تو وہ ہم جاہلوں کی لاپرواہی کی وجہ سے ہماری صحبت سے

---

[1] حضرت امیر خسرؒو بھاشا کے علاوہ سنسکرت سے بھی واقف تھے مثنوی نہ سپہر میں اپنے سنسکرت سیکھنے کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں۔ من قدرے بر سر ایں کار شدم۔ در دل شاں محرم اسرار شدم۔ ہر چہ باندازۂ خود در مزخرد۔ جستم ازاں قوم دنبود از دِررد ک۔

بیزار ہو کر قدردانِ علم و فضل یعنی اہل یورپ کے کتب خانوں کو ہجرت کر گیا اور ان کی زیب و زینت کا باعث ہوا[۱] یہی وجہ ہے کہ آج ان ننانوے کتابوں یا ایک کتب خانہ میں سے صرف چند کتابوں کے نام جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ہمیں معلوم ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

(۱) مثنوی قران السعدین (۲) مثنوی مطلع الانوار (۳) مثنوی شیریں خسرو (۴) مثنوی لیلیٰ مجنوں (۵) مثنوی آئینہ سکندری یا سکندر نامہ (۶) مثنوی ہشت بہشت (۷) مثنوی خضر نامہ یا خضر خان و دول رانی (۸) مثنوی نہ سپہر (۹) مثنوی تغلق نامہ (۱۰) خزائن الفتوح یا تاریخ علائی (۱۱) انشائے خسرو یا خیالات خسرو (۱۲) رسائل الاعجاز یا اعجاز خسروی (۱۳) افضل الفوائد (۱۴) راحت المحبین (۱۵) خالق باری (۱۶) جواہر البحر (۱۷) مقالہ (۱۸) قصہ چہار درویش (۱۹) دیوان تحفۃ الصغر

(۲۰) دیوان وسط الحیات (۲۱) دیوان غرۃ الکمال (۲۲) دیوان بقیہ نقیہ۔

دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے علاوہ چند نسخے اُن کی تصنیف سے علم موسیقی وغیرہ میں بھی ہیں۔

منقول ہے کہ جب امیر خسروؒ کوئی کتاب ختم فرماتے تھے تو اوّل اس کو حضرت سلطان المشائخؒ کی خدمت بابرکت میں پیش کرتے تھے۔ آپ اس کو اپنے دستِ مبارک

---

[۱] یورپ میں اس وقت دو لاکھ سے زیادہ مشرقی قدیم کتابیں مختلف کتب خانوں میں نہایت احتیاط اور آراستگی سے رکھی ہیں سب سے زیادہ نایاب مجموعہ پیرس و فرانس میں ہے۔ فلارنس، روم، ویانا، سینٹ پیٹرز برگ وغیرہ میں زیادہ تر مشرقی مجموعہ فراہم ہے۔ آکسفورڈ لائبریری میں پروفیسر ساچا کی مرتب کی ہوئی فہرست کے موافق ۱۸۸۹ء تک فارسی کی دو ہزار اڑتیس قلمی کتابیں داخل تھیں جس میں ستائیس کتابیں امیر خسروؒ کی تصنیف سے تھیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۸۹۶ء تک تین ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں مشرقی زبانوں کی موجود تھیں۔ برٹش میوزیم لندن میں مختلف اقسام کی ساٹھ ہزار قلمی کتابیں جمع ہو چکی ہیں جن میں دس ہزار طلائی ہیں۔ انڈیا آفس لندن میں بے شمار مشرقی کتابیں جمع ہیں ان میں سیکڑوں کتابیں ایسی ہیں جو خود مصنفوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا اُن پر مصنفوں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔ ان کے علاوہ یورپ میں خانگی اشخاص کے ہاتھوں میں بھی ہزاروں نایاب مشرقی کتابیں موجود ہیں۔

(ماخوذ از ایشیائی شاعری)

میں لے کر فاتحہ پڑھتے اور بعد فاتحہ پڑھنے کے امیر خسروؒ کے ہاتھ میں دیدیتے اور بعض مرتبہ کتاب کھول کر چند سطریں بھی پڑھ لیتے تھے۔ یہ بھی مشہور چلا آتا ہے کہ امیر خسروؒ نے ایک کتاب گلستاں کے جواب میں بھی لکھی تھی جب اس کو حضرت سلطان المشائخؒ کی خدمت میں بغرض فاتحہ لے گئے۔ آپ نے فرمایا کہ کل لانا اور اپنی چادر امیر خسروؒ کو دی کہ آج اس کو اوڑھ کر سو رہنا۔ امیر خسروؒ حسب ارشاد چادر اوڑھ کر سوئے۔ خواب میں دیکھا کہ دربار میں حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں اور ایک شخص حضرت کے روبرو کھڑا ہوا کسی کتاب میں سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ امیر خسروؒ نے جب غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ وہ یہ قصیدہ پڑھ رہا ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ　　　کشف الدجیٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ　　　صلوا علیہ والہٖ

اس کے بعد امیر خسروؒ نے دیکھا کہ دربار کے ایک کونے پر حضرت سلطان المشائخؒ دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں۔ جب صبح ہوئی امیر خسروؒ نے حضرت سلطان المشائخؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب کا حال بیان کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری کتاب اس صاحبِ کمال (شیخ سعدیؒ) کی گلستاں کے مقابلہ میں کبھی مقبول نہیں ہوسکتی۔ امیر خسروؒ نے اسی وقت جمنا پر جا کر وہ کتاب جمنا میں ڈبودی۔

امیر خسروؒ کی فصاحت و بلاغت کی جو عظمت اور عقیدت ہندوستانیوں کے دل میں ہے وہ ذیل کے لطیفہ سے بخوبی واضح ہوتی ہے۔

لطیفہ۔ ایک دن مرزا غالب مرحوم کے ایک شاگرد رشید نے اُن سے آکر کہا کہ حضرت آج میں امیر خسروؒ کی قبر پر گیا تھا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اُس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھُل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا ہوں۔ مرزا صاحب نے ازراہ ظرافت جواب دیا کہ ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھالیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

امیر خسروؒ کی تصنیف و تالیف مندرجہ بالا کا مختصر فوٹو یہ ہے۔

مثنوی قران السعدین

یہ مثنوی خسرو نے سلطان معزالدین کیقباد کی فرمائش پر اُس کے اور اس کے باپ ناصرالدین بغرا خاں کی ملاقات کے حالات میں لکھی ہے اور آج جو کتابیں ان کی تصنیف وتالیف سے موجود ہیں اُن میں سب سے پہلی تصنیف ہے۔ پروفیسر کاویل نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جنرل ۱۸۶۰ء میں اس کتاب کی چند تمثیلیں تحریر فرما کر اس کی نسبت حسب ذیل رائے تحریر فرمائی ہے۔

یہ نظم جیسا کہ امیر خسروؒ کی کل تصنیفات کا حال ہے مبالغہ اور استعارات سے آراستہ ہے لیکن تاریخی واقعات عموماً سچائی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت کم نظمیں کسی زبان میں اصلی ترتیب اور واقعات کی خوبیوں کا نباہ کر سکتی ہیں اور جب ہم (تاریخ) فرشتہ کی تحریر کا مقابلہ شاعرانہ حالت میں دیکھتے ہیں (یعنی تاریخی واقعات کو نظم میں پاتے ہیں) تو ہم کو اُن کے اصلی مضمون کی مشابہت سے تعجب ہوتا ہے۔ جگہ جگہ واقعات کے اخیر میں غزلیں درج ہیں۔ جن سے شاعر کے دلی جذبات کا اس زمانے کے حالات سے مطابق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ جس زمانے کا حال اُس واقعہ میں بیان کیا گیا ہے اور اُس کی مثال بالکل اُن گیتوں کے مطابق ہے جو ٹینسن کی کتاب پرنسیس کے حصّوں کے درمیان میں لکھے گئے ہیں۔ غزلیں مختلف بحروں میں ہیں اور کہیں کہیں دوران کتاب میں آ کر جدّت کا ایک جذبات امید وبیم کی جو ناظرین کے دلوں میں واقعات قصہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ سرسری تشریح بھی ہو جاتی ہے اور چونکہ شاعر خود برابر معرکے میں موجود رہا تھا اس وجہ سے وہ واقعات میں پورا دخل رکھتا ہے اور اس طرح سے اس کتاب میں رزم اور بزم کی غزلیات نہایت پرلطف طور سے ملی ہوئی ہیں اور واقعات کے ہر حصہ کے نظری اور ذہنی دونوں پہلو دکھلائے گئے ہیں۔

اِس مثنوی کو امیر خسروؒ نے رمضان ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء میں تین مہینے کے عرصے میں خلعت نظم پہنایا ہے اس میں تین ہزار نو سو انچاس بیتیں ہیں۔ یہ چھپ گئی ہے اور عام طور سے دستیاب ہوتی ہے۔ بخوف طوالت کسی واقعہ۔ یا غزل کی پوری نقل درج کرنے سے معذور رہ کر بطور نمونہ مختلف مقامات کی چند بیتیں درج کی جاتی ہیں۔

دہلی کی تعریف میں

حضرتِ دہلی کنفِ دین و داد — جنّتِ عدن ست کہ آباد باد
ہست چوذاتِ ارم اندر صفات — حرسہا اللّٰہ عن الحادثات
ملک زدروازۂ او فتح یاب — سیزدہ دروازہ وصد فتح باب
نام بلندش رہِ بالا گرفت — تا بہ ختن شدرہِ لعما گرفت
گرشنو وقصۂ ایں بوستاں — مکّہ شود طائفِ ہندوستاں

کیقباد کے نسب کی نسبت تحریر فرماتے ہیں

نور جد از جبہ اوقافتہ — فرّ جداز فرجد خود یافتہ
شمس جہانگیر جدا بافرش — اظہر من شمس جدِ دیگرش
ناصرِ حق شاہ فرشتہ سرشت — خوے خوشش نسخۂ باغِ بہشت
جدسوم شاہ غیاثِ اُمم — حاکمِ فرماں زعرب تاعجم
ہرسہ جدش کعبۂ ارکانِ جود — کردہ دو عالم سہ جدش راجود

نصائح بزبان ناصرالدین بغراخاں

کاے پسر پسر راز ملک وجوانی مناز — ناز بدوکن کہ شداوبے نیاز
گرچہ سیاست زتو شد دستیاب — دستِ ضعیفاں بسیاست متاب
خشم بہر جرم میاور بہ کس — زآتشِ سوزندہ نگہدار خس
چوں بگناہ معترف اید کسے — عفوتکو تر زسیاست بسے
چشم رعایت زرعیّت مگیر — تابودت ملک عمارت پذیر
شاخ درختے کہ بود سایہ دار — سایہ نشیں رابود از دے مدار
چوں تو شدی سایۂ یزدانِ پاک — سایہ فشاں باش بریں مشت خاک
عدل بود مایۂ امن اماں — پیش کن ایں مایہ زمیں تازماں
دولتِ جاوید نبرداست کس — نام نکودولتِ جاوید بس
ہرنفس از عمر غنیمت شمر — یادکن از ملک ورانِ دگر
کاول شاں چرخ بہ بالا کشید — واخرشاں خاک بہ خاراکشید

قصۂ ضحاک ہمیدوں بخواں | نامۂ جمشید وفریدوں بخواں
نیک وبداز دفتر ایشاں بجوے | نیک بخاطر کن دبدر ابشوے
پیشہ نکوئی کن و از بدتبرس | از بدِ کس نے زبدِ خود تبرس
خود زمکافات وجزاہز ماں | ہرچہ کُنی تیز بیابی ہماں
ترس خداوند جہاں کن بہ دل | تاز خداوند نمانی تجل
کارچناں کن کہ بہنگام کار | ازدرِ یزداں نشوی شرمسار

متفرق نصائح منجانب امیر خسروؒ

ترک طمع گیر وخودشرم دار | تانشوی چوں مخجلاں شرمسار
گرسنہ نانے کہ دریں تنگاے | ناں زملک میطلبی نہ از خداے
گرسنہ نانے کہ دریں تنگناے | ناں زملک میطلبی نہ از خداے
تشنہ بمیر آب زدوناں مخواہ | مملک این است خداوند باش
دل بقناعت نہ وخورسند باش | خوں خورواز خوانچہ شاں ناں مخواہ
خورکن وآشام بخوناب خویش | ازپئے نانے چہ بری آب خویش

☆☆

باب ہفتم

مطلع الانوار۔ شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ آئینہ سکندری۔ ہشت بہشت یا پنج گنج خسرو

شیخ نظامی گنجوی نے جو اُستاد الآفاق اور سرتاج مثنوی گویاں ہیں۔ پانچ مثنویاں اس خوبی اور فصاحت و بلاغت سے لکھی ہیں کہ اصحابِ فصاحت اور اربابِ بلاغت نے اُن کو خدائے سخن کے نام سے موصوف کیا ہے۔ یہ مثنویاں جو خمسہ نظامی کے نام سے مشہور ہیں حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مخزن الاسرار (۲) خسرو شیریں (۳) لیلیٰ مجنوں۔ ہفت پیکر (۵) سکندر نامہ۔

ان کی ترتیب کی نسبت مولانا نظامی سکندر نامہ میں فرماتے ہیں۔

بسے گنجہائے کہن ساختم — درو نکتہائے نو انداختم
سوِ مخزن آوردم اوّل پسیچ — کہ سستی نکردم دریں کار ہیچ
مخزن اسرار
وزو چرب شیریں ترانگیختم — بشیریں و خسرو در آمیختم
شیریں خسرو
وزانجا سرِ پردہ بیروں زدم — درِ عشق لیلیٰ و مجنوں زدم
چو از عشق مجنوں بپرا داختم — سوِ ہفت پیکر فرس تاختم
کنوں بر بساطِ سخن گستری — زنم کوس اقبال اسکندری
سکندر نامہ

یہ خمسہ مولانا نظامی کا ۵۹۷ھ ۱۲۰۰ء میں تکمیل کو پہنچا اور ایسا مقبولِ خلایق ہوا کہ عام طور سے مشہور ہو گیا کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا اور اس زمانے سے سو برس تک اسی شد و مد کے ساتھ مشہور چلا آیا مگر کسی فاضل شاعر کی ہمت نہ پڑی کہ اس کے جواب میں

قلم اُٹھاتا۔ سب سے پہلے امیر خسروؒ نے اپنے عہد میں اس کے جواب میں قلم اُٹھایا اور دو تین برس کے عرصے میں ۱۰ ۷ ھ/۱۳۱۰ء میں اس کے جواب میں اپنا پنج گنج ختم کرکے اس کو سلطان علاؤالدین خلجی کے نام سے موسوم کیا[1] مطلع الانوار میں اس کی نسبت فرماتے ہیں۔

کشت چو نقدِ ہمہ قلب آزمائے
سایہ بریدم زہمہ چوں ہمائے

دبدبۂ خسرویم شد بلند
غلغلہ در گور نظامی فگند
گنجوی

آں روشے بوز اندازہ دور
در آمدہ بہ و مساغم زنور

نور کہ از خواجہ نظامم رسید
سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہ
کام ازاں روبہ نظامم رسید

گرچہ بروجستم سخن مہربست
نظامی
سکۂ من مُہرزرش راشکست

خاتم اورا چو کشادم نگیں
داد نگینش بمن انگشتریں

خاتمش ارملک بساطاں سپرد
خاتمِ دولت بہ سیلماں سپرد

آگہر آرم کنوں ازکانِ عیب
کاب شود عقد ثریا بہ جیب

گرچہ بہ ملکِ سخن ارپنج گنج
نوبت آں گنجہ نشیں گشت پنج
(مولانا نظامی)

نوبتِ خسرو کہ بسیچن نواست
پنجہ زن نوبتِ آں خسرواست

سازم ازاں ساں بسرائے سپنج
پنج کلیداز پئے آں پنج گنج
پنج گنج خسرو۔ خمسہ نظامی

کانچہ بہر گنج بود ناپدید
فتح شود ہم بزبانِ کلید

آں نمط آرم کہ ہمہ ناقداں
فرق ندانند ازیں تابداں

ملک کہن راچو گرفتم بہ تیغ
گوہرِ خود نیز فشاندم چو میغ

---

[1] امیر خسروؒ کے بعد بھی خمسہ مولانا نظامیؒ کے جواب میں بہت سے شعراء نے طبع آزمائیاں کی ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔ (۱) خواجو کرمانی (۲) ملا ہاتفی عبداللہ جامی (مولانا نورالدین جامیؒ کے بھانجے تھے) (۳) صاحب دولتی، ملک الشعرا ابوالفیض فیضی۔ لیکن خمسہ نظامی کے جواب میں جو کامیابی امیر خسروؒ کے پنج گنج اور فیضی کی ایک مثنوی نل دمن کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے جواب کو نصیب نہیں ہوئی۔

امیر خسروؒ نے خمسہ نظامی کے جواب میں اپنے پنج گنج کو اِس طرح پر ترتیب دیا ہے۔

مخزن اسرار کے جواب میں	مطلع الانوار
خسرو شیریں کے جواب میں	خسرو شیریں
لیلیٰ مجنوں کے جواب میں	لیلیٰ مجنوں
ہفت پیکر کے جواب میں	ہشت بہشت
سکندر نامہ کے جواب میں	آئینۂ اسکندری

ہشت بہشت میں فرماتے ہیں

وادی اوّل بہ گنبدِ دوّار — روشنائی زمطلع الانوار
کردی آنگاہ بانشاط تمام — شہدِ شیریں و خسرو اندر جام
باز در عالمِ خردمندی — شورِ لیلیٰ و مجنوں افگندی
پس وہاں پرُ دُرِ دُری کردی — شرح رازِ سکندری کردی
دیں زماں کز جواہرِ انجم — ے نگاری صحیفۂ پنجم

دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں کہ امیر خسروؒ کے خمسہ (پنج گنج) میں اُنتیس ہزار اور خمسہ مولانا نظامیؒ میں اٹھائیس ہزار بیتیں ہیں۔ خمسۂ امیر خسروؒ میں اختصار ہے جو فصاحت و بلاغت میں مطلوب و مرغوب ہے۔ اور امیر زادۂ سلطان سعید بایسنغر[1] اُس کو خمسۂ مولانا نظامیؒ پر ترجیح دیتے تھے لیکن خاقان[2] الغ بیگ اس بات کو قبول نہیں کرتے

---

[1] مرزا بایسنغر مرزا شاہرخ ابن امیر تیمور کا بیٹا تھا۔ یہ شاہزادہ نہایت شریف پرور اور قابل تھا۔ خود چھ زبانوں میں لکھ پڑھ سکتا تھا۔ فارسی اور ترکی زبان میں اشعار موزوں کرتا تھا۔ علماء کی قدردانی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اُس کی سرکار میں ہمیشہ چالیس نقل نویس پرانی نادر و نایاب کتابوں کے نقل کرنے کے واسطے ملازم رہتے تھے ۸۰۲ھ ۱۳۹۹ء میں پیدا ہوا اور ۳۵ برس کی عمر میں ۸۳۷ھ ۱۴۳۳ء بمقام ہرات فوت ہوا۔

[2] مرزا الغ بیگ۔ یہ شاہزادہ بھی مرزا شاہرخ ابن امیر تیمور کا بیٹا تھا۔ علم اور اہلِ علم کی قدردانی اور علم نجوم میں بہت مشہور تھا۔ چالیس برس تک اس نے اپنے باپ کی زندگی میں سمرقند میں حکومت کی اور باپ کی وفات کے بعد ۸۵۱ھ ۱۴۴۷ء میں اُس کا جانشین ہوا۔ تخت نشین ہو کر بھی ہمیشہ کتب بینی میں مشغول رہتا تھا۔ رمضان ۸۵۳ھ مطابق ۲۷/اکتوبر ۱۴۴۹ء میں اس کے مخالف بیٹے مرزا عبداللطیف نے اس کو قید کر کے قتل کر ڈالا۔

تھے اور دونوں بادشاہوں میں اس معاملہ میں تعصب پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد فاضل مذکور نے اپنی رائے خمسہ امیر خسروؒ کی نسبت یہ لکھی ہے القصہ معانی خاص وناز کیہاے خسرو دوسخنان پر شور عاشقانہ اوآتش در نہاد آدمی میزند ودر توحید ایں دوبیت امیر خسرو است۔

قطرۂ آبے نہ خورد ماکیاں　　تانہ کند روے سوئے آسماں

ودر معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مے فرماید

برآں آئینۂ دل واجب است آہ　　کہ برمعراج اوشک راد بد راہ

ودر ناز کیہاے خمسۂ او اگر فکر کنند نکہتا نیست کہ وصف نتواں کرد از انجملہ است

خرے راکہ تیمار خربندہ کشت　　سہ جو در شکم بہ کہ سی من بہ پشت

وازیں نوع ظرائف فرواں است

مطلع الانوار

حضرت امیر خسروؒ کے علوم وحکمت کے پنج گنج کا پہلا گنج مطلع الانوار ہے۔ اس شناور دریاے حقیقت اور غواص بحر طریقت نے اس اخلاق وتصوف کے خزانے میں شریعت وطریقت اور حقیقت کے نادر ونایاب نورانی گوہر اس خوشنمائی سے سجائے ہیں کہ اگر اس کو مطلع انوار الٰہی کہیں تو خوش نما ہے یا معجزۂ خسروی کہا جاوے تو بجا ہے۔ اس طلسم خانۂ حقیقت کو جو اس صاحب کمال کے کمالات کا سچا فوٹو ہے اس جادونگار نے صرف چودہ دن کی قلیل مدّت میں اپنے سحر سامری سے سجا کر اپنی بے نظیر قادر الکلام اور کمالات معنوی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں بیس مقالہ اور تین ہزار تین سودس بیتیں ہیں ۔ ۶۹۸ھ ۱۲۹۸ء کی تصنیف ہے یہ چھپ گئی ہے۔ اور عام طور سے دستیاب ہوتی ہے۔ اختتام پر آپ فرماتے ہیں۔

شکر خدا را کہ بفضلِ خداے　　گشت مزیّن چو بہشت ایں سراے

بیست خزینہ است درو پُر زگنج　　بیست خزینہ زصد وبست و پنج

در ہمہ بیت آوری اندر شمار　　سی صد وده برشمر و سہ ہزار

از اثرِ اخترِ گردوں خرام　　شد بہ ہفتے ایں مہ کامل تمام

سال کہ از چرخِ کہن گشت بود　　از پس ششصد نود وہشت بود

چرخ کہ خورشید جنابش نوشت مطلع انوار خطابش نوشت

ناظرین۔ اس گلستانِ حقیقت سے یہ خوش نما گلدستہ مرتب کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ گر قبول افتدز ہے عزو شرف۔

آنکہ بہ زندانِ جہالت گم است | ہست گدا اگر چہ زرش صد خم است
مرد کہ از علم توانگر بود | کے نظرش بر گہرد زر بود
عالم اگر چاشت ندارد زشام | جاہل اگر خسروِ روم است وشام
گرنہ بانصاف شوئی پردہ دوز | حیف بود درحقِ جاہل ہنوز
اہل نہ گردد بہ عمنامہ سفیہ | خرد شود از جلِ دیبافقیہ
از ہنرِ خویش کشا سینہ را | پایہ مکن نسبت دیرینہ را
آبِ گرہاے کہن راجوے | دُر چو کہن گشت بود زردروے
زندہ بہ مُردہ مشواے ناتمام | زندہ توکُن مردۂ خود رابنام
زندہ کُنِ مُردہ مسیحا فراست | وانکہ دم از مُردہ برآرد خراست
از پدرِ مُردہ ملاف اے جواں | گرنہ سگی چوں خوشی از استخواں
فائدۂ علم ہمیں است خاص | کت دہداز چاہ تکبر اخلاص
چوں زنداز ہرزہ مذکرِ تفسیر | بوالعجبی باشد ہنگامہ گیر
آنکہ نداند رقمے بہر نام | بہ مفقیے کہ بود ناتمام
علم چناں خواں کہ زبس زندگی | خواب توباشد شرفِ بندگی
چوں چوئی از شاہدے حیلہ جوے | علم مگوخواب پریشانش گوے
چندتواں ساغرِ پنہاں زدن | بس نفس از رخصتِ قرآں زدن
زشت بود زہر بہ نوریبہ در | بادہ وقرآں بہ یکے سینہ در
حافظ قرآں چو خورد بادہ ہے | کفر بود شستن قراں بہ مے
خامہ مزن سوختن عامہ را | آلتِ تز دیر مکن خامہ را

خطاب بسوے قاضیاں ومفتیاں

علم بے کار نیابد برے | گرچہ بصد حیلہ برآرد سرے

بے عمل

ہرچہ بہ ہنگام نہ گوید کسے — خامشی از گفت نکوتر بسے

(سخن بہ موقعہ)

قول سہ کس نیست بداہر استوار — شاعر و قرعہ زن و اختر شمار

(رمال) (منجم)

مرد بود ک سخن وتازہ روے — قہقہہ در خندۂ گلہا مجوے

کس نکند از سخنِ نرم بیم — وز سخنِ سخت تبرسد سلیم

تیز مکن تیغ زباں در دہاں — تا نبہ وحلق ترا در زماں

رہ نبرد سوے خموشاں کسے — زخم خورد مرد سخن گو بسے

ہرچہ لبت را بہ سخن رہ دروست — جائزۂ قس سمع اللہ دروست

چوں شنوندہ است خدا مو بموے — ہرچہ نیرزد بشنو آں مگوے

گوش منہ بر لبِ غیبت گراں — تا تو ہم انباز نباشی درآں

راہ مدہ ہیچ نسے را بہ گوش — در دہی از پنبہ دہانش بپوش

نے ہمہ گفتار از اساں خوش است — ہرچہ پسندیدہ بود آں خوشت

ہرچہ بدہر آدمی است وپری — نیست مگر بہر پرستش گری

جامۂ اسلام براصحاب ریو — پر فرشتہ است مگس ران دیو

(اہل مکر و نفاق)

ایں نہ لباس است کہ تلبیس ماست — دیں نہ خیال ست کہ ابلیس ماست

(جامہ اسلام)

راکع و ساجد شدہ تن چوں ہلال — پوپہ زناں مشرق ومغرب خیال

ہوش بمیخانہ درو در خداے — واے بریں طاعت آلودہ واے

نقشِ الٰہی ست بہ لوحِ جبیں — بر درِ مخلوق منہ بر زمیں

واے کہ تاچند چوافسردگاں — سجدہ کنی بر درِ ایں مردگاں

(اہل دنیا و ہوا و ہوس)

اے کہ گذاری بہ جنازہ نماز — سجدہ ۔ دانی کہ ندارد جواز

زشت نمازے ہ ریاشانِ اوست — مزملۂ دیو در ارکانِ اوست

اے ہمہ در جمعہ وعیدت نماز — کے بود آبت زدرِ بے نیاز

نیست نماز آنکہ کنی بے خشوع — وزدی ارکاں بہ سجود و رکوع

سجدہ نباشد کہ بروے زمیں / بر صفتِ مرغ شوی دانہ چیں
تو بہ چنیں چیدن دانہ زخاک / چوں پری اندر صفت مرغان خاک

کنایہ از ملائکہ

کن بتمامت ہمہ ارکاں درست / تات شود خانۂ ایماں درست
ساختہ کن بارے زارکاں سرای / بوکہ دہد شمع حضورت خدای
اے شدہ بازیچۂ دستِ ہوای / کردہ روای برہ ناروای
جہد وبال ایں چہ پریشانی است / ترک خدا ایں چہ مسلمانی است
ہیچ کس از بندہ خود آزاد نیست / ہیچ ولے راز خدایا نیست
ہر کہ ز پرہیز پذیر و نصیب / از پئے دارو نرود بر طبیب
لوث چو پر شد بہلاکت کشید / آب چو بگرفت بخاکت کشد
چیست شراب آب شر آمیختہ / نقل کبابے نمکش ریختہ
خوردنِ مے ہر بدِ راست سر / وانکہ بدش میخوار و آں خود تبر
حلق و تواضع کہ زمستاں بود / شعبدۂ بادہ پرستاں بود
شرب و زنا تیرہ کند راے را / شاہد و مے سست کند پاے را
مرد نہ آں شد کہ شہوت نہ رست / مرد کسے واں کہ زشہوت برست
تا دلت از ترس نہ لرزد چو بید / مغفرت امید مدار از امید
خوف و رجا ہر دو بہ ایماں درند / تورد دخاں ہر دو بہ قرآں درند
علم گرت نیست ذخیرہ زپس / فاتحہ ات از سرِ اخلاص بس
ہست بسے صوفیِ پشمینہ پوش / کش نرسد بانگِ موذن بگوش
چوں زمیش دور بہ سلطاں شود / تند بہ محراب خراماں شود
صوفی مے خوارہ کہ گوید حال / گر ہمہ کشف است مداں جز خیال
دعوے فقیر و عملِ زر مدام / فقر کدام است و تجارت کدام
رند مقامر کہ بود پاک باز / بہ زعبادت گرِ باحرص و آز

قمار باز

عاشقِ زر عاشقِ درگاہ نیست / زانکہ دوئی در خور ایں راہ نیست

نانے اگرہست مُیسّر زِجَو — از پئے لوزینۂ دوناں مدو
ضامنِ روزی تو روزیٔ رساں — دیدۂ کور تو بسوے جہاں
گر شمری دوست کسے را شمار — کو بود اندر غم وشادیت یار
دوست کہ در شادی وغم نیست دوست — زو چہ شوی شاد کہ خدغم ہم اوست
یار چو درکار نباشد غم است — کار کہ بے یار برآید کم است
یار غرض جوے فراواں بود — آنکہ کشد بارِ تو یارآں بود
گرز تو چشمِ پدرت دید خار — از پسرِ خویش ہماں چشم دار
ہرچہ توانگر بہ توانا فگند — واں کہ گہر باز بہ دریا فگند

خسرو شیریں

پنج گنج کے دوسرے گنج خسرو شیریں کا اب نام ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ مثنوی عام طور سے دستیاب نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کسی بڑے کتب خانہ میں اس کا کوئی قلمی نسخہ موجود ہو۔ میں نے بہت تلاش کیا مگر مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ تذکرہ آتشکدہ سے اس کی چند بیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

سرنامہ بنامِ آں خداوند — کہ دلہارا بہ دلہاداده پیوند
زہے نقاش صورت ہاے زیبا — کہ مشتِ خاک ازو شدروے زیبا
کرشمہ داد چشمِ نیکواں را — شکارِ شیر فرمود آہواں را
چناں بنگاشت گیسوے گرہ گیر — کہ نتواں داشت دلہارا بہ زنجیر
رخے اندک بہ سبزی میل کردہ — بہارے از کفِ خضر آب خوردہ
بہ گندم گوں دلیلِ آدمی زاد — نخست ایں فتنہ آدم کردبنیاد
عرق کزروے آں طنّاز میریخت — کرشمہ مے چکید آنا رمیریخت
نمکدانی بہ تنگی چوں دلِ مور — نمک چنداں کہ در عالم فتد شور

ملّا عبدالقادر بدایونی فیضی کی مثنوی نل ومن کی تعریف میں لکھتے ہیں: کہ حق تو یہ ہے کہ ایسی مثنوی اس تین سو برس میں امیر خسروؒ کی مثنوی خسرو شیریں کے بعد ہندوستان میں شاید ہی کسی نے لکھی ہو۔

لیلیٰ مجنوں

۶۹۸ھ ۱۲۹۸ء میں امیر خسرو نے کشورِ عشاق کے شہنشاہ مجنوں اور معشوقان جہاں کی سرتاج لیلیٰ کے مشہور و معروف عشقیہ قصہ کو نہایت نزاکت و لطافت اور بلند پروازی سے نظم کرکے اپنے پنج گنج کا تیسرا گنج آراستہ کیا۔ اس میں دو ہزار چھ سو ساٹھ بیتیں ہیں۔ اور ہر بیان سے شیریں کلامی ٹپکتی ہے۔ بخوف طوالت اس کے کسی بیان کو پوری نقل درج کرنے سے معذور رہ کر مختلف مقامات کی چند بیتیں درج کی جاتی ہیں۔ یہ مثنوی چھپ گئی ہے اور عام طور سے دستیاب ہوتی ہے۔

مناجات باری تعالیٰ

اے عذر پذیر عذر خواہاں — عفوِ تو شفیع پُرِ گناہاں
خسرو کہ کمین بندۂ تست — در ہرچہ فتد فگندۂ تست
آں راکہ توافگنی بہ ہر زیست — برداشتنش بہ بازوِ کیست
ہرچند تنِ گناہ پرورد — در حضرتِ قرب نیست در خورد
با ایں ہمہ گر پذیری ایں خاک — نقصاں چہ رسد بہ عالمِ پاک
از یادِ خودم کن آنچناں شاد — کز ہستیٔ خود نیایدم یاد

وصف لیلیٰ

بود از صفِ آں بتاں چوں ماہ — ماہے کہ زد آفتاب را راہ
لیلیٰ نامے کہ مہ غلامش — خالش نقطے زنقش نامش
مشعل کش آفتاب و انجم — دیوانہ کن پری و مردم
تاراج گرِ متاعِ جانہا — بنیاد شگاف خان و مانہا
سلطانِ شکر لبانِ آفاق — شکر شکنِ شکیب عشاق
گردن زنِ عافیت فروشاں — تشویش دہِ لاج کوشاں
سرتاقدمش کرشمہ وناز — ہم سرکش حسن وہم سرانداز
نازی وہ ہزار فتنۂ دہر — چشمے و ہزار کشتہ در شہر
چشمش زکرشمہ مست ومدہوش — آہو برۂ بخواب خرگوش

خنداں چو سمن بہ تازہ روئی — شیریں چو شکر بہ تلخ گوئی
از وسوسہ چشم دیو بستہ — تسبیح فرشتگاں گسستہ
نے بت کہ چراغ بت پرستاں — طاؤس بہشت و کبک بستاں
معجون لبش بہ در فشانی — پروردہ بہ آب زندگانی
ہمخوابۂ لالہ گیسوانش — ہمشیرۂ انگبیں دہانش
خورشید غلام زادۂ او — مہ داغ جبیں نہادۂ او
اندر صفِ آں بتانِ شیریں — چوں زہرہ بہ ثور و مہ پرویں

وفاتِ مجنوں

مجنوں زمیانِ انجمن جست — وافتاد بہ خمسۂ لحد پست
بگرفت عروس را در آغوش — رو داشت بروے دوش بادوش
دو اخترِ سعد رابہ پاکی — افتاد دو فتراں بہ برج خاکی
خویشانِ صنم زسرِّ آں کار — جستند بغیرت اندرآں غار
ناساز کنند چشم خوں ریز — برگشتہ زنند خنجرِ تیز
چوں دست بہ پنجہ درزدندش — بے چاک غضب بسر زدندش
اواز سرپنجہ بے خبر بود — پنجش بہ شکنجۂ دگر بود
باہم شدہ بود پوست باپوست — پرواز نمودہ دوست بادوست
گردند نخست آزمونش — ام جاں رمقے نداد خونش
بازو کہ حمائلِ صنم گشت — از ہم نکشاد بسکہ صنم گشت
افتاد بہ مغز شاں غبارے — گویا زجدا کنند یارے
پیرے دو سہ از بزرگ واراں — گفتند بہ چشم سیل باراں
کایں کار نہ شہوت وہوا ایست — سرّے زخزانۂ خدا ایست
ورنہ بہ سوش کسے نہ جوید — کز جانِ عزیز دست شوید
خوش وقت کسے کہ از دل پاک — درراہِ وفا چنیں حلال است
وصل ارچہ بہ اہلِ دل وبال است — وصلے کہ بود چنیں حلال است

نفسے کہ نباشدت ہوارام ۔۔۔ رامش نہ کجا شود و دودام
گر عاشقی ایں مقام دارد ۔۔۔ تقویٰ بہ جہاں چہ نام دارد
تا ہر دو نہ در مغناک بودند ۔۔۔ ز آلائشِ نفس پاک بودند
و امروز کہ شہر بند خاکند ۔۔۔ پیداست کہ خد چہ گور پاکند

آئینۂ سکندری یا سکندر نامہ

پنج گنج کے چوتھے گنج یعنی آئینۂ اسکندری یا سکندر نامہ کا اب پتہ نہیں چلتا باوجود تلاش بسیار کسی تاریخ یا تذکرہ سے اس کا نمونہ بھی نہیں ملا۔

ہشت بہشت

پنج گنج کا پانچواں اور آخری گنج ہشت بہشت ہے۔ اس میں اخلاقی پند و نصیحت کے بیش بہا اور نادر و نایاب جواہرات کو بہرام گور شاہ ایران کے حسنِ معاشرت۔ عیش عشرت، عشق و محبت کے دلچسپ افسانوں کے پیرائے میں نہایت سادہ اور سلیس زبان میں اس نزاکت و لطافت سے آراستہ کیا ہے کہ انسان دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے ظاہر بیں اُس کے ظاہری عجیب و غریب افسانوں کو پڑھ پڑھ کر وجد کرتے ہیں اور علمائے دقیقہ شناس ادراک معانی سے عقل و کیاست فہم و فراست کا سبق حاصل کرتے ہیں۔ امیر خسروؒ خود فرماتے ہیں۔

کوشش کیں خط چناں نگارے چست ۔۔۔ کہ فزوں آید از چہار نخست
کاولیں نکتہ گرچہ چست بود ۔۔۔ آخریں بہتر از نخست بود
گویم افسانہاے طبع فزاے ۔۔۔ از لبِ بعتِ فسانہ سراے
ہر فسانہ صراحئے ز شراب ۔۔۔ دور مستی و بلکہ داوِ خواب
ہر یکے را بہشت نام کنم ۔۔۔ حور و کوثر درو تمام کنم
ہفت باشد بہشت و کوثر ہفت ۔۔۔ ہشتم آں کاندرو بود ہر ہفت
پس نوشتم بہ کلک مشک سرشت ۔۔۔ نام ایں ہشت خانہ ہشت بہشت
تا کسے کاندرو گذر یابد ۔۔۔ بے قیامت بہشت در یابد
خود براں دل کہ خازنِ ہنر است ۔۔۔ ہر بہشتے قیامتِ دگر است
گر بود ناقداں خزانۂ راز ۔۔۔ داند اندیشۂ مرا پرواز

ورز دانش نباشدش پیوند ہم بافسانہ شود خرسند

یہ مثنوی چھپ گئی ہے اور عام طور سے ملتی ہے۔ اس میں تین ہزار تین سو پچاس بیتیں ہیں اور ۱۰ے ھ ۱۳۰۱ء کی تصنیف ہے اس کے افسانے اس قدر طول طویل ہیں کہ ایک کی بھی پوری نقل درج نہیں کی جا سکتی ہے۔ مختلف مقامات کی چند بیتیں درج کی جاتی ہیں۔ امیر خسروؒ نے ہر داستان کے اخیر ہر ایک رنگ کی تعریف کی ہے۔

رنگ مشکیں کی نسبت فرماتے ہیں

رنگ مشکیں شعار عباسی ست زیور آرائے چرخ شماسی ست
ظلمت شب کہ مشک فام بود بہر آسائشے تمام بود
خونِ تر درمیانِ نافۂ خشک تانہ گردو سیہ نباشد مشک
خط وخالے کہ دلبستاں دارد مشک رنگ ست زیب ازاں دارد

صفت رنگ زعفرانی

زعفرانی عجب تریں رنگ ست گونۂ عاشقانِ بے سنگ ست
زرکہ اکسیر کامرانی یافت زینت از رنگِ زعفرانی یافت
بنگر آں زرکہ زعفرانی نیست درعیار آنچناں کہ دانی نیست
آفتابے کہ آسماں دارد عزت از رنگِ زعفراں دارد
ورمز عفر فزائشِ طرب ست خندۂ زعفراں ازاں سبب ست

صفت رنگ سبز

سبز ریحانی است رنگے نغز دادہ بندیدہ راطراوت نغز
سبزہ در باغ رنگِ ریحاں مافت دیدہ از سبزہ روشنی زاں یافت
شاخِ ریحاں طراز نسرین ست باغ راز یوراز ریاحین ست
گلعذارے کہ خار خار دل ست خط ریحانیش بہارِ دل ست

صفت رنگ گلنار

رنگِ گلنار دل کشائے بود چوں مئے لعل جاں فزائے بود
زیب باغ ست گونِ گلناری چوں شفق برسپہرِ زنگاری

ہرکہ شد بخت ودولتے یارش　　رخ بہ سرخی بود چوگلنارش
ہست گلنار ہمچونا کلیم　　گل ناراست باغ ابراہیم

صفت رنگ بنفشہ

ہست رنگِ بنفشہ نادروش　　دیدہ رانغز وسینہ رادلکش
ترک زیبا کہ روبود چوبھش　　در حریر و بنفشہ کن نگہش
باغ کونقش کم زدیبا نیست　　بے خیالِ بنفشہ زیبا نیست
خندۂ برق باشرار درفش　　بیں کہ چوں خوش بودزابر بنفش

صفت رنگ صندلی

رنگِ صندل لطیف ترباشد　　اثرش رفعِ درد سر باشد
زاب صندل بتاں کہ رخ شویند　　زاں طراوت بہ رنگ روجویند
رنگِ خوباں خوشست صندل فام　　خوش بود سروِ صندلی اندام
چوں زلب ریخت سروصندل سود　　شربت صندلی گوارش بود

صفت رنگ کافوری

پاک رنگ ست رنگ کافوری　　نامہ ہار ابیاض مغفوری
چوں شود مشک آدمی کافور　　موے اورا خدائے خواند نور
زور روشن کہ سربسر نوراست　　ہمہ نورش برنگِ کافوراست

صفت دلارام معشوقۂ بہرام

خاصہ تر زاں ہمہ کنیزے بود　　آفتابے بہ زیر چرخ کبود
اصلش ازچین ورُخ چوصورتِ چیں　　گیسوش چوں سواد چیں مشکیں
بسکہ کردے بہردلے آرام　　بہ دل آرامیش برآمدہ نام
قامتے در خوشی چو عمر دراز　　ہوس انگریز ترزعشق مجاز
برچو نارنج نوبہ شاخ درخت　　سخت رستہ زصحبتِ دل سخت
روے گلرنگ داد گل رارنگ　　دہنش تنگ باشکرہم تنگ
سرورآوردہ ابروانش بکار　　چوں مقامربہ کعبتین قمار

ہر طرف کابرو بہ خم کردہ | آرزو بیش و ہوش کم کردہ
چوں بہ دنبال چشم کردہ نگاہ | بردہ صدرہ روندہ را از راہ
طرّہ راسر زدہ بہ خونخواری | چشمہاے وژم زبیماری
(اندوہگین)
نرگسش دورباش وغمزہ خدنگ | لعل درآتش وعشوہ بہ جنگ
نیم دزدیدہ خندہ زیرلبش | کردہ تعلیم دزدی عجبس
سخن تلخ درلبش چونبات | مرگ را داد چاشنی زحیات
لعلِ او کردہ برشکر میری | شہد را داد چاشنی گیری
خالِ اوکوہزار پردہ درید | عالمے را بہ گنجدے بخرید
گیسوِ پیچ پیچ از سرِ ناز | داد بردستِ فتنہ رشتہ دراز
تنے از نازکی درونہ فریب | پاے تاسر ہمہ لطافت وزیب
رگ نمودہ بروں زلطفِ بدن | ہمچو رشتہ درونِ درّ عدن
خونش درپوست در تنک سلبی | ہمچو مے در زجاجۂ حلبی
(لباس)
درتماشاش روز وشب بہرام | ہمچو جمشید درنظارۂ جام

خضر نامہ یا مثنوی خضر خاں ودول رانی

خضر خاں سلطان علاؤالدین خلجی کا بڑا بیٹا اور دیول دیوی یا دول رانی اس کی معشوقہ راجہ گجرات کی بیٹی تھی۔ خضر خاں امیر خسروؒ کا پیر بھائی بھی تھا۔ اس نے ان سے اپنے عشق کے قصہ کو نظم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ اسی فرمائش پر آپ نے اس عشقیہ مثنوی میں دونوں کے عشق ومحبت کا حال لکھا ہے۔ جس کا لُب لباب یہ ہے کہ جس وقت دیول دیبی گجرات سے اپنی ماں کملا دیبی کے پاس آئی۔ اُس وقت اُس کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ بادشاہ خضر خاں سے اس کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ کملا دیبی نے بھی جو بادشاہ کے حرم میں تھی اسے منظور کرلیا تھا۔ کیونکہ وہ خضر خاں کو اس وجہ سے بہت چاہتی تھی کہ وہ اُس کے بھائی کے ہم شکل تھا۔ نوعمری کے ایام میں یہ دونوں نوعمر آپس میں ملتے جلتے اور پیار واخلاص کے ساتھ کھیلتے کودتے رہے۔ خضر خاں کی ماں اس شادی کا ہونا اس وجہ سے نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے

بھائی الپ خاں کی لڑکی سے کرنا چاہتی تھی۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ خضر خاں کی محبت دیول دیبی سے عشق کے درجے تک پہنچ گئی ہے تو اُس نے بادشاہ سے کہہ کر دونوں کو جدا کر دیا۔ اس حالت جدائی میں بھی ان کے درمیان برابر پیغام وسلام جاری رہے۔ لیکن باوجود خضر خاں کی بے انتہا مخالفت اور رونے پیٹنے کے اُس کی شادی الپ خاں کی لڑکی سے جبراً کر دی گئی اس کے بعد جب عشق سے روز بروز اُس کا حال خراب ہونا شروع ہوا تو بادشاہ نے اُس کا نکاح دیول دیبی سے بھی کرا دیا۔ اس کے بعد بادشاہ خضر خاں سے ناراض ہو گیا اور اُس نے اُس کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ خاوند کی سب مصیبتوں میں دیول دیبی اُس کے ساتھ رہی۔ اور جب ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء میں خضر خاں قطب الدین مبارک شاہ کے حکم سے گوالیار میں قتل ہوا تو دیول دیبی کے دونوں ہاتھ اپنے عاشق زار کے گلے میں پڑے ہوئے زخمی ہوئے اور وہیں قتل ہو کر خاوند کے ساتھ دفن ہوئی۔

ان دونوں کی عاشقی کا ایسا شہرہ ہوا کہ ہندی۔ فارسی شاعروں کا ایک شاعرانہ افسانہ بن گیا۔ بہت سے قصے اس کے ہندی۔ فارسی زبانوں میں موجود ہیں اور صدہا برس تک لوگوں نے اس کے گیت بنا کر گائے۔ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ دیول دیبی اپنے عاشق کے قتل کے بعد زندہ رہی اور اُس کی دو شادیاں اور ہوئیں۔ ایک خاوند کے قاتل قطب الدین مبارک شاہ کے ساتھ اور دوسری غاصب سلطنت خسرو خاں کے ساتھ۔ لیکن چونکہ اس روایت کی تصدیق اِس مثنوی اور اُس عہد کی مستند تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی سے نہیں ہوتی لہٰذا پہلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ مثنوی چھپی نہیں نہ عام طور سے دستیاب ہوتی ہے۔ راقم الحروف نے جے پور کے کتب خانہ میں اس کا قلمی نسخہ دیکھا ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء کی تصنیف ہے۔ اس کی ان بیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ماہ اور چند دنوں میں لکھی گئی ہے۔

بحمد اللہ کہ از عونِ الٰہی — بہ پایاں آمد ایں منشور شاہی
بقدرِ چار ماہ و چند روزے — فروزاں شد چنیں روشن فرازے

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خضر خاں کے قتل کا واقعہ بعد میں الحاق کیا گیا ہے کیونکہ وہ ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء کا واقعہ ہے۔ اس کی نسبت حضرت امیر خسروؒ مثنوی میں تحریر فرماتے ہیں۔

مع القصہ نہانی دان ایں راز — زگنجِ راز زنیاں درکند باز

کہ چوں سلطاں مبارک شاہ بے مہر | زتلخی گشت برخویشاں ترش چہر
صلاح ملک درخونریزشاں دید | سزاداری بہ تیغ تیز شاں دید
براں شد تا کند از کیں سگالی | زانہا زاں ملک اقلیم خالی
نہاں سوئے خضر خاں کس فرستادہ | نموداری بہ عذر از دل بروں داد
کہ اے شمع زمجلس دور ماندہ | تنیت بیتاب ورُخ بے نور ماندہ
توے دانی کہ از من نیست ایں کار | ستمکش ماندو یک سو شد ستمگار
دول رانی کہ در پیشت کنیز یست | کنیز از مہ بود ہم سہل چیز یست
شنیدم کانچناں گشت ارجمندت | کہ شد پابوس او سروِ بلندت
نہ بس زیبا بود کز چشم کوتاہ | پرستارِ پرستاری شود شاہ
تمنائے دلِ ماے کند خواست | کہ زاں زانو نشیں بر بایدت خاست
چو زینجا رفت بازایں جا فرستش | بپائیں گاہِ تخت ما فرستش
چو سودائے دلت گم گشت چیزے | دہیمت باز تا باشد کنیزے
چو شہ پیغم گوے بُرد پیغام | خضر خاں را نماند اندر دل آرام
نخست از دیدہ لب را جوش خوں داد | پس آلودہ بخوں پاسخ فرستاد
کہ شہ را ملک رانی چوں وفا کرد | دول رانی بمن باید رہا کرد
دریں دولت ہم از من دور خواہی | مرا بے دولت و بے نور خواہی
چو با من ہمسرت ایں یار جانی | سرِ من دور کن زاں پس تو دانی

اس کے بعد خضر خاں کی شہادت کا حال لکھ کر فرماتے ہیں۔

دول رانی کہ بافر خندگی بود | خضر خاں راز لالِ زندگی بود
چو خضرِ چرخ با او در کمیں گشت | ہمہ آبِ حیاتش تیغ کیں گشت
چو دیدم اندریں شیشہ بہ تمیز | لبے ہست آبِ حیواں خضر گش نیز
برآمد جانِ عاشق جاں فشاناں | دلے میگشت گرداگرد جاناں
گلے کز وے چکیدہ قطرہ خونے | فشاندے خون صد رونے برونے
بجائے آب ازآں گل خواں کشیدند | نگہ کن تا گلابش چوں کشیدند

مثنوی نُہ سپہر

یہ بے نظیر مثنوی ماہ جمادی الثانی ۷۱۸ھ ۱۳۱۸ء میں حضرت امیر خسرو نے نو بحروں میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے نام پر لکھی تھی اسی مناسبت سے یہ نہ سپہر قطبی کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اس کے بیش بہا صلے کا حال باب سوم میں تحریر ہو چکا ہے۔ یہ مثنوی چھپی نہیں اور بہت کم یاب ہے۔ مخدومی مولوی محمد شعیب ٹونکی کی عنایت سے ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا جو ماہ ذیقعدہ ۹۸۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے ملاحظہ سے ظاہر ہے کہ کُل مثنوی میں چار ہزار پانچ سو بیتیں ہیں۔ غزلیات، وصف بہار و موسم نوروز وغیرہ مختلف نظموں کے علاوہ قطب الدین مبارک شاہ کے دیوگیر دولت آباد اور تلنگانہ وغیرہ کی فتوحات کے تاریخی حالات نہایت دلچسپ اور زوردار نظم میں مندرج ہیں۔ ایک مستقل باب ہندوستان اور ہندوستانیوں کے فضائل میں قلمبند کیا ہے جو تیرہ ورقوں (ہر ایک ورق میں ۳۴۔ ۳۴ بیتیں ہیں) پر ختم ہوا ہے، یہ بے انتہا دلچسپ ہے۔ اس سے امیر خسروؒ کی حب الوطنی اور ہندوؤں کے علوم و فنون سے پوری واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مختصر انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

حمد

خدا را نم بر سرِ نامہ یاد — کہ بر بندہ درہاے معنے کشاد

مُناجاتا

خدایا چو دانائے رازم توئی — بہ ہر نیک و بد چارہ سازم توئی
بداں گونہ کن چارۂ کارِ من — کہ رحمت برُد از درت بارِ من
درے باز کن بر من از گنجِ راز — کہ کردم زگنجِ کساں بے نیاز
نگویم کہ کن بر درِ خویش خاص — ہمیں گویمت کز خودم کن خلاص
خداے گدایان وشاہاں توئی — پناہِ ہمہ بے پناہاں توئی
پناہے مدہ جز براہِ خودم — دگر سو مراں از نیازِ خودم
چو خاکم کنی ناکسارم مکن — درآں خاک چوں خاک خوارم مکن

خدایا چو خسروؒ دریں بوستاں — کہن طوطیؑ شد زہندوستاں

زہر گفت و گویش پرہیز دار   بوحید و نعتش زباں تیز دار

ہندوستان کے فضائل جو ان عنوانوں سے بیان کئے ہیں۔

(۱) اثباتِ ملکِ ہند کہ جحت بہ جنت است
جحت ہمہ بہ قاعدۂ ملک استوار

(۲) ترجیح ملک ہند بعقل از ہوائے   چوں خربزہ دندانش درون تمم ست

(۳) ترجیح اہل ہند براہل عجم ہمہ   در زیر کی ودانش ودلہائے ہوشیار

(۴) اثبات گفت ہند بجحت کہ راجح است   بر پارسی وترکی از الفاظ خوشگوار

(۵) اثبات آنکہ جانورے ایں دیاراست   حسے قریب عقل کہ انساں کنی شمار

(۶) اثبات آنکہ ہم بزبانند مُردہ را   ہم زندہ جاں وہند چو پروانہ پیش نار

ہندوؤں کی فضیلت علمی پر دس دلیلیں قائم کی ہیں جن میں بعض یہ ہیں۔

(۱) یہاں تمام دنیا سے زیادہ علم نے وسعت حاصل کی۔

(۲) ہندوستان کے آدمی دنیا کی تمام زبانیں حاصل کر سکتے ہیں لیکن کسی اور ملک کا آدمی ہندی زبان نہیں بول سکتا۔

(۳) ہندوستاں میں دنیا کے ہر حصہ کے لوگ علم کی تحصیل کے واسطے آئے لیکن کوئی ہندو تحصیل علم کے واسطے ہند سے باہر نہیں گیا۔ ابو معشر ہندوستان میں تحصیل علم کے واسطے آیا اور دس برس تک بنارس میں پڑھتا رہا۔

(۴) علم حساب میں صفر ہندوستان کی ایجاد ہے جسے آسا برہمن نے ایجاد کیا تھا۔

(۵) کلیلہ دمنہ جس کا ترجمہ فارسی، تُرکی، عربی، دری میں ہوا اور ہندوستان کی تصنیف ہے۔

(۶) شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے۔

(۷) موسیقی کی جو ترقی ہندوستان میں ہوئی کہیں نہیں ہوئی۔...... دلیل میں فرماتے ہیں ؎

جحت وہ آنکہ جو خسرو بہ سخن   سحر گرے نیست بہ چرخ کہن

ہندوؤں کے مذہب کو اسلام کے علاوہ اور تمام مذاہب سے مقابلہ کر کے

ترجیح دی ہے۔

برہمن از ہستی اورانده نفس | از ...... کش بدوئ رفته بس
عیسویاں زوجہ ولد بستہ بُرد | ہندوازیں جنس نہ پیوستہ بُرد
قوم مجسّم رقم جم زده | برہمناں نے دم ازیں قسم زده
اختریاں ہفت خدا بُرده گماں | گفته یکے ہندووثابت ہماں
قوم مُشبہ سوے تشبیہ شده | ہندو از ینہاش بہ تنزیہ شده
خلق دگر نور وظلم خوانده بہ دل | ہندو از ینہا ہمہ پیوند گسل
وانچہ کہ معبود برہمن بہ فرق | معترف اوکہ نہ مثلث زحق

ہندوستان کے جانوروں کی تعریف میں طوطی کا حال اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

طوطی ازیں جاست یکے جانورے | ہمچو دگر جانوراں نے بشرے
بیں سخنش برصفتِ آدمیاں | ہرچہ شنیدست بگوید بہ بیاں
فاتحہ واخلاص ودعا دردہنش | بامن وتوہمچوں من وتو سخنش

ویدوں کا حال لکھتے ہیں۔

چارکتابست بدیں بدشاں | کاصل عمل شُد بقبول دروشاں
بیدشُدش نام زدیواں سمری | کوندہدبید صفت ہیچ بری
ہرچہ دگر قصہ وافسانہ شاں | یاکتب ونامہ ویرانہ شاں
آنچہ تعلق بہ عبارت گری | داردو آئین سخن گستری
حرفے وے آنجابوداز برہمناں | وزادب آموختہ دانستہ چناں

یہ مثنوی خصوصاً ہندوستان کاباب بہت ہی دلچسپ ہے بخوف طوالت زیادہ انتخاب نہیں کیا گیا۔

مثنوی تغلق نامہ

یہ امیر خسروؒ کی سب سے آخری تصنیف تھی جوسلطان غیاث الدین تغلق کے نام پر لکھی گئی تھی۔ یہ مثنوی اکبراور جہانگیر ہی کے عہد میں نایاب تھی ۱۰۱۹ھ ۱۶۱۰ء میں جہانگیر نے اس کو دیکھ کر بہت پسند کیا لیکن اس کا جونسخہ شاہی کتب خانے میں تھا اس کا ایک

مبحث مفقود تھا۔ جب تلاش کرنے پر کوئی دوسرا نسخہ دستیاب نہ ہوا تو جہانگیر نے شعرائے دربار کو حکم دیا کہ اسی طرز پر طبع آزمائی کر کے مبحث مفقود کو پورا کریں۔ سب نے طبع آزمائیاں کیں۔ لیکن بادشاہ کو حیاتی کاشی کی نظم پسند آئی اور اسے داخل تغلق نامہ کیا اور اس کے صلہ میں قدرداں بادشاہ نے کوز رسرخ وسفید سے ترازو میں تلوا کر اُس کے ہموزن چھ تھیلیاں جن میں چھ ہزار اشرفیاں اور روپے تھے مرحمت فرمائیں۔ سعدائی گیلانی نے اس کی یہ تاریخ لکھی ہے۔

چوں حیاتی را بہ زر سنجید شاہنشاہ عصر	بادشاہِ عدل گسترشاہ گردوں اقتدار
شاہ نورالدین جہانگیرابن اکبر بادشاہ	آفتاب ہفت کشور سایۂ پروردگار
بہر تاریخش بروے کفۂ میزان چرخ	شاعر سنجیدۂ شاہی رقم زر روزگار

خزائن الفتوح یا تاریخ علائی

اس تاریخ میں حضرت امیر خسروؒ نے سلطان علاء الدین خلجی کے اوائل سلطنت اور فتوحات کے حالات نہایت فصاحت و بلاغت سے تحریر کیے ہیں۔ صاحب منتخب التواریخ ملک مانک اور مغلوں کی لڑائی کے حالات میں لکھتے ہیں کہ اس لڑائی کے قصے کو امیر خسروؒ نے خزائن الفتوح میں ایسی فصاحت و بلاغت سے لکھا ہے کہ آدمی کا کام نہیں معلوم ہوتا اور اگر غور کیا جاوے تو اُن کا تمام کلام ایسا ہی فصیح ہے۔

سر ایلیٹ اپنی تاریخ میں اس تاریخ کی نسبت حسب ذیل تحریر کرتے ہیں۔

یہ تاریخ جو ان دونوں ناموں سے مشہور ہے حضرت امیر خسروؒ کی تالیف سے ہے۔ اس میں سلطان علاؤ الدین خلجی کے جس کو مؤلف نے اثر محمد شاہ کے نام سے بھی موسوم کیا ہے اوائل سلطنت یعنی ۶۹۵ھ ۱۲۹۹ء سے ۷۱۰ھ ۱۳۱۰ء تک کے حالات نہایت دلچسپ پیرائے میں درج ہیں۔ گمان غالب ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا عام مورخوں نے تاریخ علاء الدین خلجی کے نام سے اپنی تاریخوں میں حوالہ دیا ہے اگر واقعی یہ خیال صحیح ہے تو اس کا غور سے مطالعہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ بہت سے دلچسپ واقعات مورّخوں سے نظر انداز ہو گئے ہیں۔ یہ مختصر کتاب اُن مضامین کے متعلق جن کا اس میں بیان ہے بہت زیادہ معلومات سے بھری ہوئی ہے خاص کر اُس زمانے کی لڑائی کے قواعد اس خوبی سے اس کتاب میں بیان کیے

گئے ہیں کہ کسی دوسری کتاب میں اس سے زیادہ عمدگی سے نہیں پائے جاتے اس کا طرز بیان نہایت دقیق ہے کیونکہ اُس میں اکثر جگہ نہایت نازک خیالی سے ایسے استعارات استعمال کئے گئے ہیں جیسے کہ بقیہ نقیہ اور اعجاز خسروی کے دیباچہ میں ہیں یا جیسے کہ قصائد بدر چاچ اور کلیات مرزا قتیل اور ایسی ہی دوسری تصانیف میں پائے جاتے ہیں کہ جن میں عام مضامین کو بھی نازک خیالی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس تاریخ کے ہر ایک حصہ میں وہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کا تعلق کسی خاص مضمون سے ہے۔ ایسی جگہ بعض بعض تشبیہیں نہایت عاقلانہ اور دلچسپ استعمال کی گئی ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اس قسم کی تصنیفات میں اکثر مبالغہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور ذرا ذرا سی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے تاہم اس سے ہم کو اکثر ایسے سچے واقعات معلوم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہم ان باتوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور ایک طرح سے یہ معمے اور تشبیہیں ہم کو واقعات کے معلوم کرنے میں بہت مدد دیتی ہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اعداد کے ذریعے سے کسی واقعہ کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا اور معمہ وغیرہ سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ کب ہوا تھا۔ اس کتاب میں اکثر ہندی الفاظ مثلاً کاٹھ گڈھ۔ پردھان۔ مارامار وغیرہ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے اہلِ اسلام کے خلاف امیر خسرو کو ہندی زبان میں بھی کافی مہارت تھی۔ اس تاریخ میں باقاعدہ تاریخ وار واقعات درج نہیں ہیں بلکہ خاص زمانے میں ملک کے کسی حصے میں جو واقعات ہوئے ان کو بلا امتیاز درج کر دیا گیا ہے لیکن امیر خسروؒ نے جو کچھ لکھا ہے مستند مانا جاتا ہے کیونکہ اوّل تو یہ کُل واقعات اُن کے زمانے کے ہیں دوسرے ان میں سے اکثر میں وہ بذاتِ خود شریک تھے۔ ضیاء الدین برنی مورّخ اپنی تاریخ کے بیانات کی تصدیق اکثر اسی کتاب سے کراتا ہے۔

یہ تاریخ بھی اب کمیاب ہے اور چھپی نہیں اس کا ایک قلمی نسخہ جے پور کے کتب خانہ میں موجود ہے جس کے مطالعہ کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہوا ہے۔ اس نسخہ کے عنوان پر یہ بیت تحریر ہے۔

ایں نامہ کہ نقد فتح دار د در جیب   شد نام خزائن الفتوحش از غیب

ایک لڑائی کا حال اس بیت سے شروع کیا گیا ہے۔

ایں فتح خزالفتوح است   ہر گوہر ازو چراغ روح است

اور خاتمہ پر یہ عبارت درج ہے۔

ختم سخن برایں کلمہ ے کنم کہ لاالہ الاالله محمد رسول الله ودعاے ختم این است کہ توفیتنی مسلما والحقنی با لصلحین المه صلی علیٰ محمد عبدک رسولک النبی الامی وعلیٰ الہ واصحابه اجمعین.

انشائے خسرو یا خیالات خسرو

یہ سلیس فارسی میں رقعات اور مراسلات کا مجموعہ ہے۔ اس کے اکثر رقعات اخلاقی پند و نصائح سے پُر ہیں۔ خاتمہ پر یہ عبارت تحریر ہے۔

خاتمہ دفتر اوّل۔ قلم برداشتن دعبارت آراستن دفقر ہائے رنگین ودل نشین پیراستن ونسخہ مربع ومربوط نگاشتن کار منشیان است وایں ہیچمدان گو استعداد آن ندارد — مرسالہ چندکہ ہمچناں ارجمند وبہ دوستانِ دردمند از غایت شوق ونہایت ذوق قریب الفہم نگاشتہ و بالفاظ مُغلق نپرداختہ وبرائے یاراں یادگارے گذاشتہ فرو

گر بدے گوہرے وارے سخن   آں فردو آمدے بجائے سخن

امید کہ منظور نظر کیمیا اثر صاحب نظراں گردد مصرعہ ہرس کہ بہ کیمیا رسد زر گردد

اس کتاب کے قلمی نسخے کو بھی راقم الحروف نے جے پور کے کتب خانے میں دیکھا تھا۔ بطور نمونہ ایک مختصرہ رقعہ کی نقل درج کی جاتی ہے۔

عرضداشت بہ پیر دستگیر

عرضداشت کمترین مریدان جاں نثار زمین خدمت بلب ادب بوسیدہ ساعت بساعت درلوازم بندگی کوشیدہ بعد از تقدیم شرائط عقیدت ومراسم ارادت ذرہ دار از روے عجز وانکسار بموقف عرض قبلہ حاجات وکعبہ مُرادات میرساند کہ از ورود مکرمت نامہ فیض آمود سرافتخار و مباہات بگردون دوّار رسید از والامطالعہ آں بعنایت ابدی وسعادت سرمدی موصول گرہ ید۔ ومرشد کامل سلامت ایں ذرہ بے مقدار پیوستہ ازعنایات آں آفتاب عالمتاب کہ از ذرہ تا خورشید شامل اس امیدوارے باشدے وبجز درگاہ آسمان جاہ پیر دستگیر پناہے نہ دارد۔ ع چہ غم دیوار امت را کہ باشد چونتو پشتیباں شعاع آفتاب جہاں تاب فیض برمفارق جمیع

مریداں وطالباں تابندہ باد۔

رسائل الاعجاز یا اعجاز خسروی

اس خوش سخن اور شمع افروز انجمن کی تصنیف سے اعجاز خسروی ایسی کتاب ہے کہ جس کا ہر لفظ معدن فصاحت اور ہر فقرہ مخزنِ بلاغت ہے۔ اس کی عبارت آرائی۔ بہار افشانی گل ریزی۔ مترادف فقروں کے جوڑ توڑ اور مقفے فقروں کی سجاوٹ اور دیگر صنائع بدائع انشاپردازی کے اظہار کمالات سے بڑے بڑے منشی۔ فاضل اور ادیب حیران ہیں۔ اس صاحبِ کمال باغبان نے فن انشاپردازی کے گلستان میں طرح طرح کے اختراع و ایجاد اور لطائف وظرائف کے قلم لگا کر ان کو عربی علم وادب کے پانی اور ہندی الفاظ سے ایسا سرسبز و شاداب کیا ہے کہ قیامت تک اپنی بہار دکھاتے رہیں گے۔ بعض مضامین بلاغت کے ایسے اعلیٰ درجے رفعت پر قائم ہوئے ہیں کہ بڑے بڑے فضلا اور انشاپردازوں کے ذہن رسا وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ عربی کے جو اشعار وفقرات فارسی کے ساتھ آگئے ہیں وہ اُس کی قادر الکلامی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔ اور زبان کی حیثیت سے کسی طرح فصحائے عرب کے کلام سے کم نہیں ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کتاب ہندوستان کے کمال فارسی کی ایک ایسی زندہ یادگار دنیا میں موجود ہے کہ مقابلہ میں آج تک ہندوستانی تو کیا ایرانیوں کا بھی قلم نہیں اٹھا اور جس طرح شیخ سعدیؒ کی گلستاں، مولانا روم کی مثنوی، امام غزالیؒ کی احیاء العلوم، فردوسی کے شاہنامہ، نظامی کے سکندر نامہ اور فیضی کی تفسیر سواطع الالہام اور ایام جہالت کے امراء القیس وغیرہ فصحائے عرب کے سبعہ معلقہ[1] کا جواب نہ ہو سکا اسی طرح اس کتاب کا بھی جواب آج تک نہ ہوسکا نہ امید ہے کہ آئندہ ہو۔

یہ کتاب پانچ رسالوں پر مشتمل ہے جو سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی گئی تھی لیکن قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں ۷۱۹ھ ۱۳۱۹ء میں تکمیل کو پہنچی۔ اس میں

---

[1] سبعہ عربی میں سات کو کہتے ہیں اور معلق کے معنی لٹکے ہوئے کے ہیں قبل اسلام ایام جہالت میں فصحائے عرب کا قاعدہ تھا کہ قصیدہ کہہ کر خانہ کعبہ پر اس غرض سے لٹکا آتے تھے کہ دیکھیں کون اس کا جواب کہتا ہے۔ منجملہ اُن قصیدوں کے یہ سات قصیدے ایسے فصیح وبلیغ واقع ہوئے کہ کوئی اُن کا جواب نہ دے سکا۔ یہ آج تک عربی علم ادب کی منتہی کتابوں کے ساتھ درس میں ہیں۔

قریب بارہ سو صفحے بڑی تقطیع کے ہیں اور مطبع نول کشور لکھنؤ میں طبع ہو کر عام طور سے ملتی ہے امیر خسروؒ اس کی نسبت فرماتے ہیں۔ رباعی

زہے منظر کہ چوں بامِ بہشت است ۔۔۔ کہ از خسرو و مے خالی مبادا
قضا در ہفت سقفش دید و برخواند ۔۔۔ بنینا فوقکم سبعاً شدادا

اس ضخیم کتاب سے اگر چیدہ چیدہ مضامین بھی نقل کئے جائیں تو اُس کے واسطے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

افضل الفوائد راحت المحبین

ان دونوں کتابوں میں امیر خسروؒ نے ملفوضات اپنے پیر حضرت سلطان المشائخ کے بقید تاریخ و ترتیب مجلس جمع فرمائے ہیں۔ راحت المحبین کی مجلس اوّل میں لکھتے ہیں۔

مجلس اوّل روز دوشنبہ بستم ماہ رجب المرجب ۶۸۹ھ گفتگو در براۂ آفرینش مہتر آدم علیہ السلام واقعہ ہوئی بندۂ گنہ گار امیدوار رحمت پروردگار خسرو لاچین کو یکے از بندگان وحلقہ بگوشان حضرت سلطان المشائخ ہے یاوری بخت سے دولت قدمبوسی حاصل ہوئی عزیز ان اہلِ صفہ حاضرِ خدمت تھے۔ بندہ واسطے عرض کرنے کے دست بستہ کھڑا ہوا تھا آپ نے مجھے کھڑا ہوا دیکھ کر از راہ مکرمت فرمایا کہ بیٹھ جاؤ اور جو کچھ کہنا ہو وہ عرض کرو۔ میں نے دوبارہ قدم بوسی کی آپ نے ازراہِ نوازش مجھے اُٹھایا اور بار دیگر ارشاد فرمایا کہ تم کو اجازت ہے جو عرض کرنا ہو عرض کرو۔ میں نے التماس کیا کہ اِس نحیف نے قبل ازیں جس قدر انفاس نفیسہ زبان مبارک سے سنے تھے اُن کو قلمبند کیا ہے کہ ایک کتاب مرتب ہو گئی ہے۔ بندہ نے اُس کا نام افضل الفوائد رکھا ہے کتاب مذکور شرف ملاحظہ سے مشرف ہو چکی ہے۔ اب میں طالب اجازت ہوں کہ جو ترغیب زبان مبارک حضرت مخدوم سے سنوں اُسے سلک تحریر میں لاؤں۔ مگر میرا یہ مدعا ہے کہ حضور آیندہ ذکر حضرات انبیاء عظام علیہم السلام فرمایا کریں۔ کمال ذرہ نوازی ہوگی عرضداشت ختم ہوتے ہی آپ نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ بہت خوب میں نے تمہارے آنے سے پیشتر ہی یہ حکایت آغاز کی ہے الخ راحت المحبین کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے اور افضل الفوائد بھی چھپ گئی ہے۔

خالق باری

عربی، فارسی، ہندی کے لغات میں مختلف بحروں میں ہے، یہ پہلے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی آج کل جو عام طور سے رائج ہے، یہ اصل کتاب کا بہت مختصر سا انتخاب ہے۔ مشہور ہے کہ امیر خسروؒ نے اس کو کسی بھٹیاری کی فرمائش پر اُس کے لڑکے کے واسطے لکھا تھا۔ جب برج بھاشا نے اپنے وسعت اخلاق سے عربی، فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو ایک نئی زبان پیدا ہونی شروع ہوئی لیکن وہ مدت تک دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی خیالات اُس میں نہ آتے تھے۔ سب سے اوّل اسی خالق باری میں فارسی بحروں نے اپنی جھلک دکھائی ہے۔ فارسی اُردو پڑھے ہوئے لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے خالق باری اور کریما کے دو چار دس پانچ شعر یاد نہ ہوں اس وجہ سے اس کے نمونہ دکھانے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ سبحان اللہ کیا زبانیں تھیں کہ جو اُن سے نکل گیا ایک عالم کو بھایا اور زمانے کے دل پر نقش کالحجر ہو گیا۔ خالق باری جس طرح کہ چھ سات سو برس پہلے بچوں کا وظیفہ تھی اُسی طرح آج بھی جہاں جہاں پرانی تعلیم کا چرچا باقی ہے عام طور سے بچوں کے ورد زباں ہے۔

مقالہ۔ جواہر البحر

یہ دونوں کتابیں میری قاصر نگاہ سے نہیں گذریں۔ نہ کسی فارسی کی تاریخ یا تذکرے میں ان کا کچھ حال نظر سے گذرا۔ مسٹر ٹامس ولیم بیل صاحب اپنی کتاب اورینٹل بایوگریفکل ڈکشنری میں امیر خسروؒ کی تصنیفات کے ذیل میں ان کتابوں کے نام بھی تحریر فرماتے ہیں اور مقالے کی نسبت حسب ذیل لکھتے ہیں۔

مقالہ۔ اس میں خلفائے راشدین کے حالات درج ہیں اور مذہب صوفیہ کی نسبت بھی ایک رسالہ شامل ہے۔ ۱۳۲۴ء کی تصنیف ہے۔

قصہ چہار درویش

ایک مرتبہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ بیمار ہوئے۔ امیر خسروؒ تیمارداری میں ہر وقت حاضر رہتے۔ اور اپنے پیر کے دل بہلانے کے واسطے اس قصے کو تصنیف کر کے سنایا کرتے تھے۔ غسل صحت کے بعد حضرت سلطان المشائخ نے دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو

سُنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔

اس دلچسپ قصے کا ترجمہ اول ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے کر کے نوطرز مرصع کے نام سے موسوم کیا۔ ۱۲۱۵ھ ۲۔۱۸۰۱ء میں میر امن دہلوی نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے حکم سے اس کا دوبارہ ترجمہ کیا جو "باغ و بہار" کے نام سے موسوم ہوا اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اُس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور اب تک انگریزوں کے اُردو درس میں داخل ہے۔

دیوان تحفۃ[۱] الصغر۔ وسط[۲] الحیات۔ غرۃ[۳] الکمال۔ بقیہ[۴] نقیہ

نظم کی مختصر تاریخ امیر خسرو کے عہد تک جملہ اربابِ فضل و کمال اس امر میں متفق ہیں کہ نظم نثر پر فوقیت رکھتی ہے۔ نظم موزوں ہے۔ نثر ناموزوں اور ناموزوں میں جو فرق ہے۔ وہ عقلمندوں پر ظاہر ہے۔ اصحابِ فضل و کمال نے آیاتِ کلام مجید میں بیساختہ کلمات موزوں پا کر صدور کلام موزوں کو متکلم قدیم تعالیٰ شانہ سے منسوب کیا ہے اور تعریف شعر کو عرشِ معلیٰ پر پہنچا کر شعرا کو تلامیذ الرحمٰن کا خطبا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جملہ علوم و کمال اکتسابی ہیں اور بلا اُستاد اور تعلیم و تحصیل کے حاصل نہیں ہوتے مگر طبع مرزوں محض وہبی ہے کہ محتاج تعلیم و اکتساب کی نہیں ہے اکثر حروف آشنا بلکہ جاہلِ محض کہ جو عروض و قافیہ اوزان و تقطیع افاعیل و بحور شعر سے محض بے بہرہ ہوتے ہیں ایسے مضامین عالی موزوں کرتے ہیں کہ جنھیں سن سن کر تعجب ہوتا ہے۔ مثنوی میں حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔ ؎

شعرمے گویم بہ از آبِ حیات   من ندانم فاعلاتن فاعلات

سرخوش صاحبِ کلمات الشعرا کیا خوش فرماتے ہیں کہ گواہ صدق اس دعوے کا مصرع بر بسم[۱] اللہ الرحمٰن الرحیم ہے کہ دیباچہ طراز اور عنوان آرائے قرآن مجید ہے۔ اسی اصول پر

---

۱ بسم اللہ پر بہت سے شاعروں نے مصرعے لگائے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہے۔

مولانا نظامی	ہست کلیدِ درِ گنج حکیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
امیر خسرو	خطبۂ قدس است بملکِ قدیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
عرفی	موج نخست است ز بحرِ کریم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(بقیہ صفحہ ۲۲۰ پر)

سخن بلند چو افتد بوجِ مقرون است　　　اتا قہ بر مصحف کلام موزون است

اس بیت کے مصرع اوّل میں چونکہ لفظ سخن آیا تھا جو عام طور سے نظم ونثر دونوں کے واسطے مستعمل ہے اس وجہ سے میر آزاد بلگرامی نے اس بیت کی اس طرح اصلاح فرمائی ہے۔

خوش ست نثر و لے شانِ نظم افزونست　　　اتاقہ سر مصحف کلامِ موزون ست

اس امر میں اختلاف ہے کہ دنیا میں شعر گوئی کا موجد کون ہے۔ ابن اثیر اور بہت سے دیگر مورخ اس ایجاد کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہابیل کے مرثیہ میں سُریانی زبان میں شعر موزوں کیے ہیں۔ جن کا عربی میں ترجمہ یہ ہے۔

تغیرات البلاد و من علیها　　　ووجه الارض مغبر قبیح

تغیر کل ذی طعم ولون　　　وقل بشاشه الوجه الصبیح

قتل قابیل هابیلاً اخاه　　　نوا اسفی علی الوجه الملیح

اسی اصول پر مرزا صائب لکھتے ہیں ؎

آنکہ اوّل شعر گفت آدم صفی اللہ بود　　　طبع موزوں حجت فرزندے آدم بود

حضرت امیر خسروؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

ماہمہ در اصل شاعر زادہ ایم　　　دل بایں محنت نہ از خود دادہ ایم

لیکن وہ مؤرخ جو شعر گوئی کو کفر سمجھتے ہیں اس امر سے منکر ہیں اُن کا بیان ہے کہ پیغمبر معصوم اور شعر گوئی سے مبرا ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ مرثیہ نثر میں کہا تھا۔ جب یہ نثر سُریانی زبان سے عربی زبان میں ترجمہ ہوئی تو خود بخود موزوں ہو گئی۔ قاسم بن سلام بغدادی موجد شعر عربی کا یعرب بن قحطان کو جو حضرت نوحؑ کی

(بقیہ صفحہ ۲۱۹ کا)　طاہر وحید　　　ہست نہالے زریاضِ قدیم　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میر آزاد بلگرامی　　　تیغ سیہ تاب رسول کریم　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ناطق　　　جملہ جہاں حادث وذاتش قدیم　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اولاد میں سے تھے بتلاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اشعر بن سبا یمنی شعر گوئی کا موجد ہے اور موجد کے نام ہی کی نسبت سے سخن موزوں کو شعر کہتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ فارسی شعر گوئی کی ایجاد کا فخر بہرام گور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک روز وہ گورخر کے شکار میں مصروف تھا کہ بیساختہ اس کی زبان سے یہ شعر نکل گیا۔

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ　　　نام بہرام مرا کنیتم بوجبلہ

بہرام گور کے اس شعر کے بعد کس نے شعر کہا اس میں اختلاف ہے۔ بعض شخص یعقوب بن لیث کو جن کا زمانہ ۲۵۱ھ ۸۰۸ء میں تھا اور بعض ابوحفص سغدی کو جن کا زمانہ ۳۰۰ھ ۹۱۲ء میں تھا بتلاتے ہیں۔ فارسی میں قصیدہ کا موجد خواجہ عباس مروی ہے جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کامل تھا۔ ۱۹۳ھ ۸۰۸ء میں جبکہ خلیفہ مامون رشید عباسی بطور دورہ مرو میں وارد ہوا۔ خواجہ عباس نے اُس کی مدح میں فارسی میں قصیدہ کہہ کر دربار میں سُنایا اور اس کے صلے میں ہزار دینار علاوہ مقررہ وظیفہ کے پائے۔ اس قصیدے کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین　　　گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را　　　دینِ یزداں را تو بائستہ چو رخ را ہر دو عین

کس بریں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت　　　مر زبانِ پارسی را ہست مر ایں نوع بین

لیک ازاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں طریق　　　گیرد از مدح ثنائے حضرتِ تو زیب و زین

۳۰۰ھ ۹۱۲ء تک فارسی شعر گوئی کا یہ ہی حال رہا کہ کبھی کبھی کسی نے کوئی شعر یا قصیدہ موزوں کر لیا تو کر لیا مگر کوئی اس کی ترتیب و تدوین کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ سلاطین سامانیہ کے عہد میں سب سے پہلے حکیم محمد ابوالحسن رودکی نے فارسی شاعری کو کمال کے زینے پر پہونچایا۔ قصیدہ اور غزل کی طرح ایجاد کی۔ کہتے ہیں کہ وہ مادرزاد اندھا تھا مگر ذہن اس کا ایسا عالی تھا کہ باوصف نابینائی سات برس کی عمر میں حافظ قرآن اور بیس برس کی عمر میں حکیم اور شاعر اور لطیفہ گو ہو گیا۔ علاوہ اس فضل و کمال کے نہایت خوش آواز اور علم موسیقی میں بھی کامل اُستاد تھا۔ ابتدائے حال میں مطربی کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ خضر بن احمد سامانی کی ملازمت میں جا پہنچا اور فضل و کمال کے وسیلہ سے ایسے مدارج اور مراتب اعلیٰ پر پہنچا کہ مشہور ہے کہ

شعرا میں جو دولت وحشمت اُسے حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ شرح یمینی کی روایت کے مطابق اُس کے اشعار کی تعداد اکتیس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسدیؔ، طوسیؔ، ارزقیؔ، فردوسیؔ، عنصریؔ، انوریؔ، دقیقیؔ، عسجدیؔ، فرخیؔ، فلکیؔ، نظامیؔ، خاقانیؔ، سنائیؔ، فاریابیؔ وغیرہ فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکے اور ہر ایک نے اپنے اپنے کلام اور ایجادات کی خوبی کے انعام واکرام شہرت کے خزانہ سے پا کر کمال کے دربار سے بقائے دوام کی سند حاصل کی۔

ساتویں صدی میں مشرقی شعرا کے سرتاج شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے گلستانِ شاعری میں ایسے عجیب وغریب اور خوشنما گل کھلائے ہیں کہ دنیا محو ہو گئی اور بحیثیت مجموعی جو قبولیتِ عام اس برگزیدہ روزگار کے کلام کو حاصل ہوئی وہ آج تک کسی شاعر کے کلام کو نصیب نہیں ہوئی۔ عزیزی کا قول ہے۔

در شعر سہ تن پیمبر انند　　ہر چند کہ لانبی بعدی
اوصاف قصیدہ وغزل را　　فردوسی وانوری وسعدی

انہوں نے برخلاف شعرے متقدمین کی بے نمک اور پھیکی غزلوں کے اپنی غزلوں میں عاشقانہ مضامین اور شوخی اور بانکپن کی ایسی مینا کاری کی کہ موجودہ طرز غزل کے ایجاد کے فخر کا سہرا اُن کے سر پر باندھا گیا اور اُن کی فصاحت نے استعاروں کے پیچ اور تشبیہوں کی رنگا رنگی کو چھوڑ کر سادگی کا ایسا طریقہ اختیار کیا کہ ان کا کلام عام پسند ہو کر مرغوب طبائع خاص وعام ہوا۔

اسی زمانے میں ہندوستان میں حضرت امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ نے اس نئے طرز غزل کو کمال کے درجے پر پہنچایا۔ علامہ زماں میر علی آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں۔

شیخ سعدی شیرازی فردے از افراد اولیا و ثالث رسل ثلاثہ اشعر است واوّل کسیکہ زمرہ غزل سنجید دماغِ عشاق رار سائی تازہ بخشید اگر چہ پیش از شیخ ہم قدما کم قانون غزل نواختہ اندا ما بے نمک۔ شیخ شور غزل بطرزِ تازہ برانگیخت ونمک بر جراحت درد مندان ریختہ ولہذا دیوان اورا نمک دان مے گویند وہم شیخ در حالت حیات بود کہ امیر خسروؒ وامیر حسن در ہندوستان غلغلہ غزل انداختند وسوز سینہ داغدارا انجمہا را گرم ساختند۔ سلطان محمدؒ قاآن مشہور بخانِ شہید ناظم ملتان دو مرتبہ التماس قدوم شیخ سعدی از شیراز نمود و بجد زمان ایں فصحاے

ثلاثہ باب غزل مفتوح شد۔ ودر ہر عصر جمع طریق اجتہاد پمودند و حُسن غزل را بہ انواع آرائش افزودند۔

امیر خسروؒ کے کلام پر رائے

امیر خسروؒ کا صرف وہ کلام جو انواع واقسام کے صنائع بدائع اور مختلف رنگوں اور نئے نئے تصرفوں اور ایجادوں سے مرصع ہے اگر جمع کیا جاوے تو بہت سے شعرا کے کلام سے زیادہ نکلے گا اُن کا تمام کلام عاشقانہ اور تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ غزلوں میں عاشقانہ اور صوفیانہ مضامین کی ایسی مینا کاری کی ہے کہ خاص وعام سب میں یکساں ہر دلعزیز ہیں۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلوں کو گا کر محفلوں کو گرماتے ہیں[1] عوام اور اربابِ نشاط یاروں کو سُناسُنا کر مزے اُڑاتے ہیں۔ جس طرح عوام الناس اُن کے ظاہری عشقیہ مضامین لطف پاتے ہیں اُسی طرح صوفیان صافی دل اور علمائے دقیقہ شناس ادراک معانی سے دقائق ومعارف الٰہی کا خط اُٹھاتے ہیں۔

فارسی کے باکمال شعرا خاقانیؔ، ظہیرؔ، انوریؔ قصائد اور فردوسیؔ میدانِ رزم مولانا نظامی مثنوی، شیخ سعدیؒ[2]۔ غزل اور اخلاقی مضامین کے مرد میدان تھے۔ لیکن اس صاحبِ کمال

---

[1] منقول ہے کہ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں ایک دن شہنشاہ جہانگیر کے بزم شاہانہ میں مجلس سماع گرم تھی۔ اُس وقت مولانا علی احمد نشانی ولد مولانا حسین نقشی دہلوی مشہور شاعر جو علاوہ کمال شاعری کے علم ہیئت اور طبعی میں بے مثال اور انشا اور املا میں بے نظیر اور جملہ خطوط میں ید طولی رکھتے تھے موجود تھے۔ جب سیدی شاہ قوال نے امیر خسروؒ کی یہ بیت گائی ۔

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے

مولانا کو ایسا ذوق پیدا ہوا کہ فوراً سجدے میں گر گئے اور اُسی حالت سجدہ میں انتقال کیا۔
(ماخوذ از تزک جہانگیری ونگارستان سخن)

[2] فارسی کی غزل سرائی میں دو قسمیں ہیں۔ ایک واقعہ بندی اور دوسرے خیال بندی واقعہ بندی میں امیر خسروؒ کو ید طولی حاصل تھا اور سیفیؔ، ترکؔ، ہوتیؔ، وشتؔ، بیاضؔ، آقا شاپورؔ وغیرہ واقعہ بند شعرا اُن کے پیرو ہیں۔ امیر خسروؒ نے غزل سرائی کو اپنے عشق اور تصوف سے جلوہ دیا۔ اسی روش پر مولانا جامی کا کلام ہے۔

کو نظم کے ہر شعبے میں یکساں کمال حاصل تھا۔ غزل میں وہ شعرائے متقدمین اور شعرائے عہد سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مثنوی کے دربار میں اُن کی کرسی مولانا نظامی کے برابر ہے۔ قصیدے کے میدان گھوڑ دوڑ میں وہ خاقانی سے کچھ پیچھے اور ظہیر وغیرہ کے دوش بدوش اُن کے دو قصیدے۔ بحرالابرار اور انیس القلوب فصاحت و بلاغت کے ایسے معراج کمال پر پہنچے کہ بڑے بڑے فضلائے روزگار نے اُن کے جواب میں طبع آزمائی کی مگر کسی کا جواب اُن کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اخلاقی مضامین میں اُن کا نمبر شیخ سعدیؒ کے بعد ہے۔ اور کثرت کلام اور صنائع بدائع کے لحاظ سے غالباً وہ فارسی کے جملہ شعرائے متقدمین اور متاخرین کے سرتاج ہیں۔

امیر خسروؒ کے کمالات شاعری اور ادب پر ریویو کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے، لہٰذا اس مقام پر صرف چند مشاہیر شعرا اور فضلا کی رائیں ان کے کلام کی نسبت درج کیجاتی ہیں۔

مولانا نورالدین جامیؒ بہارستان میں فرماتے ہیں۔

امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ در شعر مستغنے است قصیدہ و غزل و مثنوی در زندہ و ہمہ بکمال رسانید۔ تتبع خاقانی مے کند ہر چند در قصیدہ بہ وے نرسید اما غزل را از وے گذرانیدہ غزلہائے بواسطۂ معنی آشنا کہ ارباب عشق و محبت بحسب ذوق و وجد آن خود را درمے یابند مقبول ہمہ کس اُفتادہ است۔ خمسہ نظامی بہ از وے کسے در جواب نگفتہ دورائے آں مثنویہا دیگر دارد وہمہ مطبوع و مصنوع۔

ایک دوسرے مقام پر امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ کی نسبت فرماتے ہیں۔

آں دو طوطی کہ بنو خیزی شاں | بود در ہند شکر ریزی شاں
عاقبت سخرۂ افلاک شدند | خامشان قفسِ خاک شدند

میر آزاد بلگرامی وقوع گوئی کا بانی مبانی ان کو بتاتے ہیں اور اپنے کلام کی تائید میں ان کا کلام پیش کرتے ہیں۔

خوش آزماں کہ بروئیش نظر نہفتہ کنم | چو سوے من نگرداد نظر بگردانم
غلام آں نفسم کا مدم چو خانۂ او | ولہ بخشم گفت کہ از در کشند بیرونش
چو رفتم بر درش بسیار۔ درباں گفت ایں مسکیں | ولہ گرفتارست شاید کایں طرف بسارے آید

اوران کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں [1]

اے خسروِ شوخاں چہ کند وصفِ تو آزاد　　خوباں عملِ فتنہ زدیوانِ تو یابند
امیر خسرو نمکیں شعر ترا خواند آزاد دیگر از نمکدانِ تو شد تازہ گرفتارئے دل

صاحبِ تذکرہ مراۃ الخیال تحریر فرماتے ہیں۔

یہ یک بیت ازآں عارفِ حقیقی کہ در صنعتِ ابہام ذی الوجوہ واقع شدہ وعجب تر ازآں کسے نہ گفتہ است اکتفا نمود وصنعتِ مذکور چناں است کہ شاعر لفظے درشعر درج نماید کہ آنرا دو معنی یا زیادہ باشد وحضرت امیر دریں بیت لفظے آوردہ ہفت معنی صحیح ازآں برے آید۔ وہی ہذا۔ شعر

پیل تن شاہی وبسیار است بارت برسریر　　زاں مرنج اے ابروباغ ارگویمت بسیار بار

درلفظ بار کہ آخر است ہفت معنی ظاہرے گردد۔ اوّل۔ تو پیل تنی ازاں مرنج اگر گویمت بسیار بار یعنی گراں برائے بار تو بسیار است۔ دوم۔ تو شاہی ازاں مرنج اگر گویمت بسیار بار۔ چہ باردادن بادشاہاں عبارت ازجلوس فرمودن است برسریر سلطنت وخود را بخاص و عام نمودن، سوم، تو شاہی ازاں مرنج اگر گویمت بسیار بار یعنی بسیار نیکوکار۔ چہ بار درلغت نیک کردار است۔ چہارم۔ تو شاہی ازاں مرنج اگر گویمت بسیار بار۔ یعنی بسیار بار ترا شاہ گویند۔ پنجم۔ تو ابری ازاں مرنج اگر گویمت بسیار بار یعنی بسیار بارندہ۔ ششم۔ تو ابری ازاں مرنج اگر گویمت بسیار بار یعنے بسیار بیار۔ ہفتم۔ اے باغ ازیں مرنج کہ ترا بگویم بسیار بار یعنی بسیار میوہ آوردمیوہ دار۔

واین بیت امیر را تا امروز ہیچکس جواب نتوانست رسانید۔

مولانا ضیاالدین برنی صاحبِ تاریخ فیروزشاہی تحریر فرماتے ہیں۔

امیر خسرو خسروِ شاعرانِ سلف وخلف بودہ است ودراختراع معانی وکثرتِ تصنیفات غربیہ نظیر نداشت وہرچہ نسبت طبع لطیف وموزوں کند باری تعالیٰ اورا درآں ہنر سرآمدہ گردانیدہ بود ووجودے عدیم المثال آفریدہ ودرقرون متاخراز نوادراعصار پیدا آوردہ۔

---

[1] ان دونوں بیتوں کے آخری مصرعے امیر خسروؒ کے ہیں اوراوّل مصرعے میر آزاد بلگرامی کے ہیں جوانہوں نے امیر خسروؒ کے مصرعوں میں تضمین کئے ہیں۔

شاہزادہ دارا شکوہ سفینۃ الاولیا میں لکھتے ہیں۔

در شعر چناں قادر بودند کہ مطلع انوار را کہ در جواب مخزنِ اسرار است در دو ہفتہ تمام کردہ اند و در اشعار ایشاں یکہ بتہیا است کہ کم کسے بآں خوبی گفتہ باشد و ایں بیت از یکہ بتہیائے ایشان ست۔

زُلفت زہر دو جانب خونریز عاشقان ست ‏ ‏ چیزے نمیتوں گفت۔ روے تو درمیان ست

و مضمونہائے تازہ عالی در اشعار میر آں قدر است کہ اگر ہمہ را جمع کنند از تصانیف بعضے زیادہ مے شود و ہمیں طور در اقسامِ زبان و فنونِ علم ہندی بے مثل بودہ اند و بجامعیتِ ایشاں کم کسے گذشتہ۔

کاتبی نیشا پوری کا قول ہے۔

گر حسن معنی زخسرو برُ و نتواں عیب کرد ‏ ‏ زانکہ استاد است خسرو بلکہ ز استاداں زیاد

امیر خسروؒ کے تتبع کرنے والوں میں خواجہ عصمت اللہ بخاری بھی ہیں۔ جب کاتبی کے زمانے میں ان کے کلام کی شہرت ہوئی تو ایک دن کاتبی نے امیر خسرو کو خواب میں دیکھا اور اُن سے کہا کہ عصمت آپ کا ایک ادنیٰ خوشہ چیں ہے۔ اُس کے اشعار کی آپ کے اشعار سے زیادہ شہرت کا کیا سبب ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس کا کوئی خوف نہیں۔ عصمت کے اشعار میرے ہی اشعار ہیں۔ اس واقعہ کو کاتبی نے خود اس طرح تحریر فرمایا ہے۔

میر خسرو را علیہ الرحمہ شب دیدم بہ خواب ‏ ‏ گفتم ایں عصمت ترا یک خوشہ چینِ خرمن است
شعرِ او از شعرِ تو چوں بیشتر شہرت گرفت ‏ ‏ گفت باکے نیست شعرِ او ہمیں شعرِ من است

نواب محمد صدیق حسن خاں مرحوم شمع انجمن میں لکھتے ہیں۔

خسرو دہلوی خسروِ قلمرو معانی است و صاحبقرانِ سوادِ اعظم سخندانی۔ نمک کلامش شور افگنِ انجمنہا و سوز سینہ اراتش زن خرمنہا۔ در زبان عرب و عجم و ہند سخن گفت۔ عدد اشعارش بہ پنج لک شعر مے رسد۔ سخن آفرینے بایں قدرت و سرمائگی در ایراں دیار ہم نہ برخاستہ۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ صنائع و بدائع کہ در قدمائے از خسرو دہلوی و در متاخرین از شیخ حبیب اللہ اکبر آبادی برروے کار آمد در قارلب گفت در نیاید موقوف بر گلگشت

مؤلفات ومجامع ایشان است۔

مولوی ابوالحسن صاحب شارح مطلع الانوار فرماتے ہیں۔

خسرو اقلیم سخن بے سخن　　خسرو دہلی ست بزدِ حسن

مولوی ظہیر الدین صاحب فرماتے ہیں۔

برارباب سخن شناس نیکوظاہر کہ ہرچند مذاق سخن تمام اہل سخن ہر یک طرز جداست کہ یکے بہ دیگرے نمی ماند مگر کلام معجز نظام حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ راشانے وآنے دگراست ہر کہ ولے دارد داند کہ در خانہ کیست ودر نامہ چیست فہم من فہم۔

خود از مکیں بود متصور نہ از مکاں　　از اندرونِ خانہ چو آید ندا برون

ہر یک از شعرا رابقدر حصہ از مبدء فیوض نصیبے دادہ اند کہ دراں صفت مستثنیٰ است مگر حصہ ایں خسرو اقلیم سخن از ہر صفت دہرہ صنف بہرۂ وانی ونصیبے کافی است ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

منشی احمد حسین خاں حالات سعدی میں فرماتے ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جو شہرت گلستاں و بوستاں کی بدولت شیخ (سعدیؒ) کو نصیب ہوئی اُس کا عشر عشیر بھی خسروؒ کو نہیں ملا۔ مگر چشم انصاف سے دیکھ کر یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ امیر خسروؒ کی بعض غزلیات شیخ کی غزلیات سے بڑی ہوئی ہیں۔

مسٹر ٹامس ویلیم بیل اورینٹل بایوگریفکل ڈکشنری میں لکھتے ہیں:-

امیر خسروؒ ہندوستان کے سب سے بڑے مشہور شعرا میں ہیں، ہندوستان میں ان کی کتابیں مقبول عام ہیں اور فی الواقعہ وہ ایران کے نہایت قابل قدر شعرا کے کلام کا مقابلہ کرتی ہیں۔

حسین علی خاں عظیم آبادی صاحب تذکرہ "ریاض الشعرا" لکھتے ہیں۔

وے (امیر خسروؒ) جامع کمالات صوری ومعنوی وحاوی فضائل ظاہری وباطنی وعالم معقول ومنقول و ماہر فُروع واصول بود از خداوندانِ کمال گوئے سبقت ربودہ واز ارباب فضیلت درمعرکہ فضیلت ودانشوری قدم اسبق گذاشتہ درجمع نزاکت سخن ورسالت ایں فن شانے عالی ومقامے متعالی دارد۔ شرح نسخۂ فنون دانی او بیروں از حوصلۂ تقریر و بیانِ

انسان است باتفاق خدایان سخن وصاحبانِ ایں فن سوز وگداز عاشقانہ وتاب وطپش بیدلانہ کہ درکلام دے یافتہ مے شود درسخنِ دیگرے کمتر تواں یافت۔ ہر مصرعہ اش خنجرے است براں وہر بیتش تیغے است چوں تیغ ابروئے خوباں

مولانا امجد علی صاحب اشہری کتاب ''ایشیائے شاعری'' میں تحریر کرتے ہیں۔

اس دور کے قابلِ قدر زمانے میں جبکہ شیراز کو سعدیؔ اور حافظؔ جیسے سخن طرازوں سے بلند نامی حاصل تھی دلّی کو امیر خسرو دہلوی کی سخن آرائی نے دوسرا شیراز بنا رکھا تھا، خسرو کے کمالات شاعری اور ادب پر ریویو کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہوسکتا۔ میرے نزدیک اس رُتبے کا شخص نہ صرف دلّی بلکہ تمام دنیا میں بھی دوسرا نظر نہیں آیا جس کی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلاواسطہ مبدءِ فیاض سے مضمون پا رہا اور بلاذریعہ لوحِ محفوظ کو دیکھ رہا اور اس کی نقل اُتار رہا ہے اور جو اُس کا اور صرف اُس کا حصّہ ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر کی طبیعت کا میلان مختلف وقتوں یعنی مختلف عمر میں یکساں نہیں رہتا، اس سبب سے سب سے پہلے امیر خسروؒ کی جدّت پسند طبیعت نے اپنے کلام کو مندرجہ ذیل چار قسموں میں تقسیم کر کے چار دیوانوں پر مشتمل کیا۔

اوائل عمر	عہد جوانی	سن کہولت	پیرانہ سالی
تحفۃ الصغر	غرّۃ الکمال	وسط الحیات	بقیہ نقیہ

دیباچہ بقیہ نقیہ میں خود فرماتے ہیں۔ دریں وقت اکثر طبائع بغزل میل وارد واز اں روز بازار فارس گرم است ورادیانِ سخن مے خوانند تا از شعلہ غزل محرق مجلس را گرم گردانند۔ اکنوں مصلحت آں دیدم کہ بہوائے دلِ خویش کہ کثافتِ طبیعت او آب گشت است از نائرۂ قلم روانہ گردانم دُرا وصاف ہر غزل چہار تشبیہ بہ چہار عنصر برائے نمونۂ شعر ہر آئینہ تخیل حکما از چہار طبع خویش رواں سازم تابدانند۔ شعر

تابدانند کہ یک طبع رہے ہست چہار ۔۔۔ کہ ہمے زاید از و معدنِ حوین ونبات

معلوم خواطر اصحاب طبع باد کہ مرتبہ اوّل غزلیات بمثابہ خاک سرد وخشک وکثیف ونازک است ایں غزلہا نیز بہ نسبت صنائع وبدائع خشک وتکلیفات سرد وکثیف تکلفات و

بکثافت میل کند چوں بکام پرداخت۔ آں دیوانِ اوّل تحفۃ الصغر ست ایں طفل خاک را کہ ایّام خاکبازی ست با طفلاں دہر ضیفے رغبتے تمام غزلہائے دیوان بریں افتادہ است۔ شعر

سہل باشد نباشد آں بسیار کانچناں اندک ست نے بسیار

مرتبہ آں بود و مرتبہ دوم غزلہا آب بود چوں آب برخیال لطیف واز خاک بر تراست واز کدورات الفاظ کثیف مصفا وسط الحیوٰۃ ست گرم وتر اُفتادہ است گوئی آبے ست کہ از آتشِ طبع خویش جوش بسیار یافتہ است از محل مائیت بمرتبہ ہوائیت رسید وودر حد مائیت خویش ماندہ ومرتبہ سوم غزلہائیست برشتہ باد چوں خاصیت آب گرم وتر افتادہ است وایں غزلہا لطیف ترست درواں تر وبرتر واز بس لطافت خلل پذیر بنود وایں غزلہا نیز مانند باد گرم وتر اُفتادہ است واز غزلہائے کہ مانند آب لطیف درواں تر وعالم بے برواز آتشِ طبع قوت بسیار یافتہ است واز مقام ہوائیت بمرتبہ مائیت رسیدہ وایں از آں غُرۃ الکمال ست۔ غزلہائے او نیز بریں نوع اُفتادہ اس باید کہ خوانندہ بطبع وقاد تاویل نماید و مرتبہ چہارم غزلہائے مثال آتش ست چنانکہ آتش یعلو میل دارد وہیچ سر بہ پستی فرو دینارد وتنزل را در وے راہ نبود ہیچ طبعے از بلندتر بنود و باو نرسد چنانکہ حرارت خاصۂ آتش ست ودر دلہائے نرم چوں آتش در پنبہ گیرو دل آہنیں را قدرے نرم سازد و اگر دلے ست کہ درد عشق جائے دارد نیک بسوزاند و خاکستر گرداند۔ غزلہائے بقیہ نقیہ و بعد ازیں اگر شعلۂ روشن و آتش طبع وقاد کہ در شعر بود امید ست کہ ازایں غزلہائے سوزاں بلند کرۂ اثیر را سراسر آتش پائے گردانم بہ شابتے کہ شعلۂ سُوزان آں از خرمن آں رود در خوشۂ عطارد گیرد چنانکہ اشراق آں در چرخ اُفتد و مشعلۂ آفتاب را آب گرداند۔

دیوان تحفۃ الصغر۔ وسط الحیات۔ غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ کی نسبت ایلیٹ صاحب اپنی تاریخ میں حسبِ ذیل تحریر فرماتے ہیں۔

امیر خسروؒ کے پہلے دیوان کا نام تحفۃ الصغر ہے اور اُس میں وہ تصنیفات شامل ہیں جو انہوں نے سولہ برس کی عمر سے اُنیس برس کی عمر تک تصنیف کیں یہ دیوان سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کا ہے۔ اس میں علاوہ غزلیات کے سلطان اور شاہزادوں اور دیگر امراء کی مدح میں قصائد ہیں جو اکثر نوروز اور عید کے موقعوں پر کہے گئے ہیں۔ ترجیع بند عموماً حضرت نظام الدین اولیاؒ یا سلطان بلبن کی شان میں ہیں۔ دوسرا دیوان وسط الحیات ہے

جس میں چوبیس برس کی عمر سے بتیس برس کی عمر تک کی تصنیفات شامل ہیں اور اس کے قصائد عموماً حضرت نظام الدین اولیاؒ کی مدح میں ہیں باقی قصائد دیگر امراء کی شان میں ہیں۔

تیسرا دیوان غُرّۃ الکمال ہے یہ امیر خسروؒ کا تیسرا اور سب سے بڑا دیوان ہے۔ اور مفتاح الفتوح بھی جو کہ ایک مثنوی ہے اسی دیوان میں شامل ہے۔ لیکن بوجہ اپنی عمدگی اور ترتیب کے علیحدہ کتاب خیال کی جاتی ہے۔ اس دیوان کے اکثر نسخوں میں یہ مثنوی بلکہ اس کے علاوہ اور دوسری مثنویاں بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ نسخہ نواب ضیاء الدین خاں دہلوی کے کتب خانہ میں تھا اُس میں مثنوی وغیرہ کچھ نہ تھی۔ اور چونکہ اس نسخہ پر ترکانہ شاہی اور جان بیگ کی مُہر تھی، اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ ہی نسخہ مستند ہو۔ اس دیوان میں چونتیس برس سے بیالیس برس تک کی عمر کی تصنیفات شامل ہیں۔ اس کے شروع میں ایک پُر لطف اور دلچسپ دیباچہ ہے۔ جس میں مصنف نے اپنے حالاتِ زندگی قلمبند کیے ہیں۔ اس میں بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور دیگر امرائے دربار کی شان میں قصائد موجود ہیں۔ اور ایک مرثیہ بھی ہے جو مصنف نے شاہزادے افتخار الدین پسر سلطان جلال الدین کی وفات پر موزوں کیا تھا۔ اس دیوان میں نوروز اور عید وغیرہ کے موقعوں پر جو نظمیں موزوں کی گئی تھیں، وہ سب موجود ہیں۔ دیوان کا حجم تقریباً ۶۹۴ صفحہ ہے۔

چوتھا دیوان بقیہ نقیہ ہے اس میں پچاس برس سے لے کر چونسٹھ برس تک کی عمر کی تصنیفات ہیں۔ اس میں بھی مندرجہ بالا لوگوں کی شان میں قصائد سلطان کی وفات پر ایک مرثیہ اور اس کے علاوہ متفرق مثنویاں ہیں جو کہ شاہزادہ کی شادی اور دوسرے موقعوں پر نظم کی گئی تھیں۔ دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں امیر خسروؒ لکھتے ہیں کہ چونکہ لڑکپن کا زمانہ تھا اس واسطے میں نے کبھی کلام جمع کرنے کا خیال نہیں کیا۔ میرا بھائی تاج الدین زاہد جس کی باریک بین طبیعت مشاطۂ طرۂ اشعار ہے اُن اشعار کو فراہم کر لیتا تھا اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کہا۔ اس کا ایک مجموعہ اُس نے بتایا۔ میں نے اُس کو دیکھ کر کہا کہ یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہے۔ اُس نے نہ مانا اور فرمایش کی کہ اِس کو مسلسل کر دو۔ چنانچہ میں نے ہر حصّہ کلام پر ایک شعر اُس کے عنوان کے طور پر کہہ کر لگا دیا۔ یہ میرا ایجاد ہے۔ مجھ سے پیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا۔ اس دیوان کا نام تحفۃ الصغر ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہر چند اور

علائق باطل جمع ہیں میدان نشیب وفراز سے معمور تھا۔اور پاؤں میں لنگ تھی ۔ میں نے بہت چاہا کہ بادپائے قلم کو جنبش نہ کرنے دوں لیکن دوستوں نے نہ مانا۔عموماً سب اور خصوصاً بھائی تاج الدین برابر مصر رہے۔میں برسوں اس تاج بلند گوہر کے سلکِ محبت میں سرفراز رہا ہوں اور اخوت کے اثر نے ہم دونوں کو بے مبالغہ برادران لوام کی مثال بنادیا ہے خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے۔ بسکہ جانم یگانہ شد باأو در گمانم کہ ایں منم باأو

اُس کا مقصود یہ تھا کہ یہ دفتر پر حشو کسی شمار میں آجائے میں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے۔وہ کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر کہ یہ بچپن کا کلام ہے اعتراض نہ کرے گا۔نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا۔میں کہتا تھا کہ اس میں شُتر وگربہ (رطب ویابس) بہت ہے۔اُس کا جواب تھا کہ لوگ اس کو تعویذ بنا کر موشک بازو (بازو کی چوہیا) پر باندھیں گے۔غرض برادر موصوف کے اصرار سے اس مجموعہ کو یاران خوب شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔امید ہے کہ طیبِ خاطر قبول فرمائیں گے[1]

امیر خسروؒ کے اِن چاروں دیوانوں میں سے آج کل عام طور سے کوئی دستیاب نہیں ہوتا انہوں نے اپنی زندگی میں ان چاروں دیوانوں سے انتخاب کرکے ایک دیوان مرتب کیا تھا جس کا نام عناصر خسرو ہے۔یہ اُن کے کل کلام کا عطر یا اُن کے گلستان شاعری کا ایسا خوشنما گلدستہ ہے۔جس میں گلہائے رنگا رنگ اپنے قدرتی جوبن دکھا رہے ہیں۔اس کے مختلف اشعار انواع واقسام کے صنائع وبدائع سے آراستہ اور اُس کی غزلیں مضامین عاشقانہ صفائی بیان۔طرز ادا کی نزاکت سے پیراستہ ہیں۔

علمی دنیا منشی نول کشور صاحب سی۔ایس آئی کے اس احسان کی ہمیشہ ممنون ومشکور رہے گی کہ انہوں نے دس برس کی لگاتار تلاش وجستجو کے بعد عناصر کا ایک پرانا قلمی نسخہ جو مصنف کے بہت قریب زمانے کا لکھا ہوا تھا دستیاب کرکے ۱۸۷۱ء میں اُس کو اپنے مطبع میں چھپوا دیا جو اُن کی بدولت شائقین کو آج تک عام طور سے مل جاتا ہے۔

دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرے میں امیر خسروؒ کے دیوان کی نسبت حسبِ ذیل تحریر فرمایا ہے۔

---

[1] مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی (از مخزن)

دیوان امیر خسروؒ کو فضلائے عہد جمع نہ کر سکے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سمندر کا برتن میں علم لدنی کا تحریر میں آنا ناممکن ہے اسی طرح اُن کا کل کلام جمع کرنا ناممکن امر ہے۔ شاہزادہ سعید بایسنغر بہادر نے نہایت تلاش اور کوشش سے ایک لاکھ بیس ہزار بیتیں غزلیات کی جمع کر کے خیال کیا کہ اُن کا کُل کلام جمع کر لیا لیکن اس کے بعد دو ہزار بیتیں ایک دوسری جگہ سے دستیاب ہوئیں۔ اور جب لوگوں کو تحقیق ہوگئی کہ اُن کے کُل اشعار جمع کرنا مشکل ہے تو لوگوں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔

عناصر خسروؒ میں اکیس قصیدے آٹھ سو نوے غزلیں ستاون قطعات ورباعیاں ہیں۔ اُس کے کُل اشعار کی تعداد سات ہزار سات سو پچاس ہے۔ ہر غزل یا قصیدہ کے شروع میں نام دیوان کا جس سے وہ قصیدہ یا غزل منتخب کی گئی ہے لکھا گیا ہے۔ اس خزائنِ خسروی سے یہ چند گوہرِ بے بہا دکھائے جاتے ہیں۔

قصیدہ فی توحید باری تعالیٰ

اے زخیال ما بروں در تو خیال کے رسد — باصفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت — دامنِ عزتِ ترا زوال کے رسد
کنگرِ کبریائے تو ہست فراز لامکاں — طائرِ مادراں ہوابے پر و بال کے رسد
بر درِ بے نیازیت صد چو حسینِ کربلا — تشنہ بماند بر گذرتا بہ زلال کے رسد
ہست بہ تختگاہِ دل جلوۂ قرب روز و شب — لیک بجلوۂ چناں چشمِ خیال کے رسد
زاں چمنے کہ بلبلش روح قدس می سزد — گلخنیان خاک را بوے وصال کے رسد
توسن چابکاں سبک عرصۂ کوے نیکواں — آنکہ فتاد مرکبش بر سرِ حال کے رسد
حربۂ ردِ عاشقاں بر سرِ چوں منی سزد — راہروانِ پاک را لوثِ وبال کے رسد

آیتِ رحمت از حرم ہست برائے حاجیاں
خسرو بت پرست راجز خط و خال کے رسد

ایضاً

اے بہ در ماندگی پناہِ ہمہ — کرمِ تست عذر خواہِ ہمہ
بند نعلین رہروانِ درت — شرمہ تکمۂ کلاہ ہمہ

قطرۂ زابرِ رحمت تو بسست شُستنِ نامۂ سیاہ ہمہ
از رہے برسرا کہ در تو رسم اے بسوے درِ تو راہ ہمہ
گنہِ ماہمہ فزونِ زقیاس عفوت افزوں تراز گناہ ہمہ
خسرو از تو پناہ مے جوید
اے پناہِ من وپناہِ ہمہ

قصیدہ فی نعت سیّد المرسلین وخاتم النبیّن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اے رسالت راعلم افراختہ دستِ تو تیغِ شریعت آختہ
مرکبت کو بر مکاں بنہاد پائے قدر تو برلامکانش تاختہ
آدم ومن دونہٖ تحت اللوا آمدہ چوں تو لوا افراختہ
نہ قبائے چرخ راختیاط صنع خاص بہرِ قامت افراختہ
میم احمدؐ را گزیدہ بعد ازاں خاتمِ مُہرِ نبوّت ساختہ
ہر کہ اوازمیم احمدؐ طوق یافت در یکے گوئی رود چوں فاختہ
جز خدا کس حدِّ تو نشناخت زانکہ کس خدا را ہمچو تو نشناختہ
تافتہ نورِ تو از روزِ ازل پرتوِ خود تا ابد انداختہ
دیدۂ کش در نظر ناید بہشت عشق باخاکِ جنابت باختہ
عاصیانِ زدو رورا کردگار از بروے روے تو بنواختہ
بندہ خسرو تا نویسد نعتِ تو
زآتشِ دل جانِ خود بگداختہ

قصیدہ فی المدح سلطان علاؤالدین محمد شاہ خلجی

درآاے ہمچو شاخ گل لطیف وناز نین وتر نشاط انگیز وعیش افزاوراحت بخش وجاں پرور
نہ زیبائی ولطف ونازکی وتازگی پیشت چہ ریحان وچہ نسرین وچہ شمشاد وچہ نیلوفر
زعکسِ عارض وجعد وبناگوش و دو چشم تو وہم لالہ چمد سنبل فتد نسریں پروجہر

زگلگشت وجوے افشاں نسیم وعطرِ تو جوید
چمن روح وسمن طیب وصبا مشک وگیا عنبر

تن وروے وخط وخد وبر وقد ولبِ لطفت
مہ ومہر وشب وروز وگل وسرو دمے وشکر

شمم در ہجر وبیداری وشوق وغم بود بے تو
نفس مونس حجر بالش خشک بالیں رہیں بستر

زہے از ابرو ومژگاں خجے از نرگس وغمزہ
خصومت ساز وعاشق سوز وافسوں خوان وجادوگر

بیا تا با تو شادم خرم و آسودہ و خنداں
شوم ہمدم کنم عشرت خورم بادہ کشم ساغر

کہ ہست از عون وعدل وبذل واحسانِ شہِ عالم
جہاں بیغم اماں محکم طرب بے حد خوشی بے مر

جہانداری نکوکاری فلک قدری ملک صدری
علاؤالدین علوِ حق محمدؐ نام احمدؐ فر

سرافراز وسرانداز وجہانگیر وز حالف گش
ظفریاب وگہر پاش وجہاں بخش وکرم گستر

رہِ رائے دوم حلق وفنِ علم وہنر صافش
خرد را بیخ وجاں را شاخ وتن را رگ وحق را بر

امان وامن وعدل وراحت سمت اندر زمان او
بشرق وغرب وشہر ودیہ وکوہ ودشت وبحر وبر

جمال وزیب ویمن وفر گرفت از خطبۂ نامش
رخِ جمعہ صفِ قبلہ درِ مسجد سرِ منبر

بزرگ وخرد وخاص وعام را در ذکر ذاتِ او
صفت ورد ولقب حرز ودعا یاد وثنا از بر

ربود وبود وبشکست وستد بادِ سنانِ او
زمرداں دل زشیراں جاں زخصماں تن زشاہاں سر

دراں روزے کہ از فہم دلاور خاک وخوں گردد
جہاں او ہم ہوا ابرش قضا ابلق سما اخبر

سواران ویلان وپردلاں وصفدراں بینی
کمند انداز وخنجر گیر وناوک یار وجولاں گر

بہ آہنگ وورنگ وحیلہ وحملہ شود پیدا
یل از شست وبز از گرگ وسگ از شیر ودلیر از غر

کند شاہ از سنان وتیر وگرز وحربہ گر خواہد
فلک زیر وزمیں بالا ودوراں پشت ودہر ابتر

حسود ودشمن وبدخواہ وخصمش را رسد ہر دم
بہ دل ناوک بجاں ژوپین بتن نیزہ بسر خنجر

بشست ہر دو دست کر دو مشتِ قوس وپشتِ یل
رود ناوک دو دیلک جہد سورے پر دگلبر

زرعب وبیم وترس وہیبت شہ گم کند آں دم
ثوابت جا ثریارہ کواکب پا ملایک بر

کشاید چار چیز از چار جا یک زخمِ تیرِ او
زتن خون وز ابر آب وز کہ دود وز سنگ آذر

بہر جائے وصف وکوس ورکاب وعرکبش راشد
شرف موکب علو رایت بقا ساقہ ظفر رہبر

جہاندارا بہ علم وحلم ومہر وکیں سر آید دم
تنِ عالم دلِ دریا کفِ معدن سرِ لشکر

سزیر ملت وملک وجہاں در ضبط خود کردہ است
بہ کاروبار دین وکیش دوست وشت وزور وزر

زعنف ولطف توہستند مردم عاصری ومفلس ۔۔۔ بہ نارو ونور ودودودادوسوزوسازوخیروشر
زقلبت ہرامیرو پہلوان وگردولشکر کش ۔۔۔ تہمتن تن سیاوش وش فریدوں فرسکندر در
حریم بارو چترِ مل ونعلِ اسپ وپابوست ۔۔۔ درِ خلدوشب قدرومہ عید وحج اکبر
سزورضوان وحوروآفتاب وزہرہ وربزمت ۔۔۔ نشاط آغازوساحت زیب ونقل آرائے وخنیاگر
زطبع وذہن وفہم ودہم وخسرو یافت درمدحت ۔۔۔ زباں گوہرسخن ہدیہ قلم حلیہ ورق دفتر
ہمیشہ تابشکلِ طول وعرض وعمق چرخ آمد ۔۔۔ زہِ قوس وجدِ جدی وسرِقطب وخطِ محور

بجزم وعزم و بزم و رزم بادت ہرکجا خواہی
قدر حالی فلک خادم قضاحافظ خدا یاور

غزلیات

بقیہ نقیہ

اے چہرۂ زیبائے تورشکِ بتانِ آذری ۔۔۔ ہرچند وصفت میکنم لیکن ازاں بالاتری
آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام ۔۔۔ بسیارخوباں دیدہ ام اماتوچیزے دیگری
تانقش می بندوفلک کس رانداداایں نمک ۔۔۔ حورے ندانم یاملک فرزندآدم یاپری
ہرگز نیاید در نظر نقشے زرویت چوتر ۔۔۔ شمسی ندانم یاقمر یازہرہ یامشتری
من توشدم تومن شدی من جاں شدم توتن شدی ۔۔۔ تاکس نگوید بعدازیں من دیگرم تودیگری
توازپری چابک تری وزبرگِ گل نازک تری ۔۔۔ وزہرچہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری
عزمِ تماشا کردۂ آہنگ صحرا کردۂ ۔۔۔ جان ودل مابردۂ انیست رسمِ دلبری
لعلِ بدخشاں دیدہ ام الماس راسنجیدہ ام ۔۔۔ درِ عدن راچیدہ ام یکتا تدرجِ گوہری
عالم ہمہ یغمائے توخلقے خداشیدائے تو ۔۔۔ آں نرگسِ شہلائے توآوردہ رسمِ کافری
اے راحت وآرامِ جاں باقدِتوسرورواں ۔۔۔ زینساں مروداممکشاں کارام جانم مے بری

خسرو غریب است وگدا افتادہ درشہرِ شما
باشد کہ از بہر خدا سُوے غریباں بنگری

تحفۃ الصغر

ابرے بارودمن میشوم از یار جدا ۔۔۔ چوں کنم دل مچنیں روز زولدار جدا

ابر باران و من و یار ستاده بہ وداع — من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا
سبزہ نوخیز و ہوا خرم و بستاں سرسبز — بلبل روے سیہ ماندہ ز گلزار جدا
اے مرا در تہِ ہر بند ز زلفت بندے — چہ کنی بند ز بندم ہمہ یک بار جدا
دیدہ ام بہرِ تو خونبار شد اے مردم چشم — مردمی کن مشو از دیدۂ خونبار جدا
نعمتِ دیدہ نخواہم کہ بماند پس ازیں — ماندہ چوں دیدہ ازاں نعمتِ دیدار جدا
دیدہ صد رخنہ شد از تیرہ تو خاکی ز رست — زود برگیر و یکاں رخنہ پے نار جدا
مے دہم جاں مرو از من وگرت باور نیست — پیش ازاں خواہی تو بستان و نگہدار جدا
حسن تو دیر نماندہ چو ز خسرو رفتی — گل بسے دیر نماند چو شد از خار جدا

مسلماناں گرفتارم بہ دستِ نامسلمانے — ازیں دیوانہ بد مستے و بد خوے و نادانے
بطرہ آشنا بندے نجندہ پارسا بینے — بغمزہ ناخدا ترسے بکشتن نامسلمانے
بابرو فتنہ انگیزے بنرگس عالم آشوبے — بہ بالا آفتابدے بہ کاکل کافرستانے
دعاے بد نخواہم کرد لیکن ایں قدر گویم — کہ یارب مبتلا گردے چو من روزے بہجرانے
طبیباں بہر جانِ ناتوانم غم مخور چندے — رہا کن جاں دہم زیرا نے ارزم بہ درمانے
کنوں یادِ شراب و شاہد و مستی و قلاشی
گذشت است آنچہ خسرو را سرے بود ست و سامانے

گرچہ خوباں زمہ فزوں باشند — پیش آں ماہِ من زبوں باشند
مردمانے کہ روے او دیدند — تا بہ باشند سرنگوں باشند
گفتمش بندہ ایم گفت خموش — تو چہ دانی کہ بندہ چوں باشند
یار مہمانِ تست اے دیدہ — مرر ساں را بگو بروں باشند
اے دلِ خوں گرفتہ عشق میار — کہ بتاں تشنگانِ خوں باشند
عافیت را بخواب مے جویند — دردمنداں کہ بے سکوں باشند
عقل دردِ سرست زیں معنی — عارفاں عاشقِ جنوں باشند
تو بروں رو کہ سینہ ام گاے جاں — یار یاراں ازو دروں باشند

عشق بازی زخسرو آموزند
لیلےٰ و مجنوں ازکنوں باشند

از غزلیات

چہ بلاست ازدوچشمت نظرِ نیاز کردن   مژہ راکشاد دادن درِ فتنہ باز کردن
چوکمال صنع بے چوں زجمال تست پیدا   نتواں حدیث عشقت زرہِ مجاز کردن
ہمہ خوابِ مرد ماں شد بدو دیدہ تلخ یارب   زکجات گشت شیریں حرکاتِ ناز کردن
چہ خوشست باتو خلوت کہ دہد سرشک خونیں   زخراشِ دل گواہی بہ زبان راز کردن
توبخسپ خوش کہ ماراز غمش چوشمع جوشد   ہمہ روز زندہ بودن ہمہ شب گداز کردن
بجفات دل نہادم بکن آنچہ مے توانی   چہ کنم نمے توانم زتواحتراز کردن
بہوس فدا کنم جاں بدرت کہ نیست عاری   پسرِ سبکتگیں را ہوسِ ایاز کردن
صفِ عاشقانست اینجامدہ اے فقیہ زحمت   کہ بشہرِ بت پرستاں نتواں نماز کردن

چہ بود متاعِ خسرو کہ کند نثار جاناں
مگسے چہ طعمہ راند بہ دہان باز کردن

از غزلیات

بخرام اے سرورِ ضواں کزباغ رضواں خوشتری   دلدادگانِ خویش رامے کش کہ از جاں خوشتری
درہوشیاری مہوشی سرمست وعلطاں دلکشی   چوں موکنی شانہ کشی طرہ پریشاں خوشتری
چوگانت دلجوے از ہمہ سر بردہ ہر موے از ہمہ   خوش میبری گوے از ہمہ زلعب چوگاں خوشتری
بانکہ خوش باشد چمن از سرو ونسرین وسمن   بسیار دیدم ازتومن بسیار از یشاں خوشتری
ہرچند بینم دلبرا تشنہ ترست ایں دل مرا   خواہم بیاشامم تارکز آب حیواں خوشتری
گرچہ جوانی خوش بودے بے تو ندانی خوش بود   وز زندگانی خوش بود حقا کہ توزاں خوشتری
بجدےح چپ باشد دل بہ ییں کانجا کئی منزل گزیں   درچار سوے جاں نشیں کزہست بستاں خوشتری
نقش تواے شمع چگل بیروں دہم زیں آب وگل   لیکن توئی چوں گنج دل ودرکنج ویراں خوشتری

دارم زتو درد ے قوی میخواہمش از سرنوی
زانکہ کہ دردِ خسروی لیکن زدرماں خوشتری

انتخاب غزلیات

غرۃ الکمال

اے باد برقع برفگن آنروے آتشناک را   دے دیدہ گر صفرا کنم آبے بزن ایں خاک را
خسرو کہ امیں خس بود کز سوز عشق از بس بود   یک ذرہ آتش بس بود صد خرمنِ خاشاک را
بشگفت گل در بوستاں آں غنچۂ خنداں کجا   شد وقتِ عیشِ دوستاں آں لالۂ بستاں کجا
ہر بار کو در خندہ شد چوں من ہزارش بندہ شد   صد مردہ زاں لب زندہ شد دردِ مرا درماں کجا
مے گفت با من مرزباں گر جاں دہی یابی اماں   من میکنم فرماں بجاں آں یارِ بے فرماں کجا
گفتم توئی ایں در تنم تا ہست جانِ روشنم   گفت کہ آرے ایں منم گر ایں توئی بس جاں کجا
برقع برافگن اے پری حسنِ بلا انگیز را   تا کلک صورت بشکند ایں عقل رنگ آمیز را
دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا   تنم از بیدلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا
صد ہزاراں آفریں جاں آفرینِ پاک را   کافرید از آب و گل سروے چو تو چالاک را
جاں فدائے دوست کن زاں زنِ ہندو نہ   کز وفائے شوے در آتش بسوز و خویش را
خسروا گر انگبیں میخواہی از شکّر لباں   اوّل اندر کامِ شیریں کن زبانِ خویش را
ماہر ویانہ خونِ من مشتاب   کشتنِ عاشقاں کہ دید صواب
چہ ملامت کنید خسرو را   فاتقو اللّٰہ یا اولی الالباب
دلِ ما را از دستِ غم اماں نیست   نشانِ شادمانی در جہاں نیست
جہاں پر آشنا و من بہ غم غرق   مگر دریائے محنت را کراں نیست
اندراں معرض کہ خود را زندہ سوز د مردِ عشق   اے بسا مردِ خدا کو کمتر از ہندو زنے ست
یار چوں با ماست بہرِ دیدنش تعجیل چیست   یوسف اندر مصر دل در دیدہ رودِ نیل چیست
چوں جمالت آیتِ رحمت شد اندر شانِ خلق   آخر ایں چندیں ز بہر کشتنم تاویل چیست
ایکہ خسرو را نصیحت مے کنی از بہرِ عشق   پند چوں مے نشود بیہودہ قیل و قال چیست
گلستا نیست خاک آستانت از رخِ خوباں   کہ مرغِ آں گلستاں خسروِ سحر البیاں آمد
مبصراں کہ مزاجِ جہاں شناختہ اند   دو روزہ برگِ اقامت درو نساختہ اند
سرے کہ زیرِ زمیں شد نہفت شاہاں را   ہماں سرا ست کہ بر آسماں فراختہ اند

خسرو اول بدکن از نامرادیہاے دہر (قطعات) کاسماں را ایں ہمہ بہ آدمِ ہشیار بود

دو چشمت کہ تیرِ بلاے زند — چنیں تیر برماچہ امے زند

کماں جانبِ دیگرے مے کشد — ولے تیر برجانِ ماے زند

زہے غمزہ کز شوخے وچابکی — کجاے نماید کجاے زند

چوبوئے تراورچمن مے برد (فرد) نسیمِ بہار از صباے زند

کسیکہ یار وفادار مہرباں دارد — سعادتِ ابدو عمرِ جاوداں دارد

خراشِ سینۂ خود بابتِ خونخوارے گویم (رباعیات) حسابِ خویش میدانم کہ غم بایار میگویم

من ایں آہِ جگرسوز از دلِ پیماں شکن دارم — چرا از دیگرے نالم کہ دردِ خویشتن دارم

بجاے محنتِ ایوب واندوہِ دلِ یعقوب — بلا اینست وبیماری وتنہائی کہ من دارم

زدینا میرو وخسرو بزیرِ لب ہمے گوید — ولم بگرفت ازیں غربت تمنائے وطن دارم

اے آرزوِ امیدواراں — وے مرہم دردِ دل فگاراں

از دشمنی آنچہ بود کردی — اے دوست چنیں کنند یاراں

گرشرح دہم غم توصد سال — یک قصہ نگویم از ہزاراں

خواہی دلا فردوس جاں رخسارِ جانانرا بہ بیں — وربایدت سرورِرواں آں میرِ خوبانرا بہ بیں

اے دل کہ ہستی بیقرار از روے آں نگار — ایں جانت مے آید بکار آں شکل جانانرا بہ بیں

اے بت پرستِ ہندو چیں کرنا و بتر بوسی زمی — چندیں چہ گوئی بت چنیں آں یک مسلماں را بہ بیں

گم کردجانا بردرت ہم جان وہم دل چاکرت — در گیسوِ عذر آورت ایں را بجو آں را بہ بیں

دارم زتو داغ کہن درنیست باور ایں سخن (قطعات) بند ازم ودل پارہ کن داں داغِ پنہاں را بہ بیں

رواے صبا و سلامم بدلنواز رساں (؟) نیاز بندہ بہ آں شوخ عشوہ ساز رساں

سلام خدمتِ ماے صبابہ یار بگوے (تخمس) فغان وزاری وبلبل بہ نوبہار بگوے

بیچارہ خسرو خستہ را خوں ریختن فرمودہ است — خلقے بمنت یکطرف آں شوخ تنہا یکطرف

قطعہ ورباعیات

مرد بخشندہ کسے را گویند — کہ بہ درویش دہد پے درپے

ہرکہ بخشد بہ توانگر درمے — خندہ کن گرچہ بود حاتمِ طے

ابر اگر بر سرِ دریا بارد　　شاید ار برق بخندد بر وے

حاصلِ خود بخور واندوہِ بیہودہ مخور　ولہ　باشد آنرا چہ خوری حاصلِ دیگر باشد

دگر آنرا نخوری حاصلِ دیگر نشود　　غم امروز ہماں روزت در خور باشد

الٰہی باشد باہستی زرغم خوردن　　ہم کہ اوغم خورد و زر نخورد خرباشد

روشندلانِ صاف دروں راخلل بود　ولہ　در کار خلق چشم کشادن بخیروشر

روشند لانِ صاف دروں راخلل بود　ولہ　درکار خلق چشم کشادن بخیر و شد

پوشیدہ نیست نزوہمہ کس کہ طاس را　　سوراخ عیب باشد و غربال راہنر

تاکے اے بے ہمت از بہرِ دوفلس کردہ ریگ　ولہ　قبلہ سازی وہ کہ مستی جاہلِ افسردہ را

گرقبائے مے کنی بارے منہ سر برزمیں　　زانکہ دردیں سجدۂ بنود نماز مُردہ را

بجاہ فقر توانگرنمائے ہمت باش　ولہ　کہ گرچہ ہیچ نداری بزرگ دارندت

بدانکہ درہمہ ہستی شوی خسیس مزاج　　کہ گرچہ ہیچ نداری بزرگ دارندت

از عزّ محمدارنہ داری خبرے　ولہ　لن از رہِ عقل درشہادت نظرے

اللہ و محمدست پیوستہ بہم　　یعنی کہ میان شان نگنجد دگرے

وصفِ شرفِ توبیش از اوراک آمد　ولہ　سبق اوبت نعبدو ایاک آمد

توقیع توکز صحیفۂ پاک آمد　　لولاک لما خلقت الافلاک آمد

احمدنانے کہ کانِ عالم زوبود　ولہ　یک توے قبایش فلکِ نہ توبود

بسیار چکید قطرہا از آدم
آں قطرہ کہ بحر گشت آخر اوبود

مختلف کلام

مختلف تاریخوں اورتذکروں سے امیر خسروؒ کا وہ چیدہ کلام جو عناصر خسرویا دیگر تصنیفات میں موجود نہیں ہے درج کیا جاتا ہے۔

درردیف ماہ نوعید

برآمد ماہِ عیداز اوجِ گردوں　　طرب چوں ماہِ نوشد ہردم افزوں

بلوحِ آسماں نونے است یاعین　　کہ بیروں آمداست ازکلکِ بیچوں

بگرش ہست چندیں نقطہ را انجم — اگر یک نقطہ باشد بر سرِ نوں
ببیں اندر رکوع آں پارۂ نور — ہلالش گوے خواہی خواہ دوالنوں
ہمانا حلقۂ گوش سپہر است — کہ دارد ا کواکب درمکنوں
سوادِ شام درپیشِ مہِ نو — مگر لیلےٰ ست در پہلوئے مجنوں
چنیں ماہِ نو و عیدِ حجتہ — مبارک باد بزداتِ ہمایوں

غزل

کافرِ عشقم مسلمانی درکار نیست — ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست
از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب — دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست
ابر را بادیدۂ گریانِ من نسبت مکن — نسبتے باند کے دارد و لے خونبار نیست
شاد باش اے دل کہ فردا بر سرِ بازارِ عشق — مژدۂ قتل است گرچہ وعدۂ دیدار نیست
ماغریباں را تماشاے چمن درکار نیست — داغہاے سینۂ ماکمتر از گلزار نیست
ناخدا در کشتئ ماگر نباشد گو مباش — ماخدا داریم مارا ناخدا درکار نیست
خلق مے گوید کہ خسرو بت پرستی مے کند — آرے آرے میکنم باخلق عالم کار نیست

غزل

تُوئی در ملک جاں خسرو چہ خسرو خسرِ خوباں — بودِ نخلِ قدت فتنہ چہ فتنہ فتنۂ دوراں
جمالت مجمعے باشد چہ مجمع مجمعِ خوباں — چُو خوبی خوبۂ یوسف چہ یوسف یوسفِ کنعاں
دہانت غنچۂ باشد چہ غنچہ غنچۂ دل کش — چہ دلکش دلکشِ خرم چہ خرم خرمِ خنداں
بسر زلفت یکے ہندو چہ ہندو ہندوئے کافر — چہ کافر کافرِ رہزن چہ رہزن رہزنِ ایماں
چو خسرو بندۂ باشد چہ بندہ بندۂ عاشق — چہ عاشق عاشقِ بیدل چہ بیدل بیدلِ ہجراں
خسرو اور عشقبازی کم ز ہندو زن مباش — کز براے مردہ سوز وزندہ جانِ خویش را

بتم سلطانِ لکِ حسن و ما در سلک درویشاں — دلا دامن فراہم کن کجا ماوٗ کجا ایشاں

مثنوی

نشاید بادشہ رامست بودن — نہ در عشق و ہوس پیوست بودن

بودشہ پاسبان خلق پیوست　　خطا باشد کہ پاسباں مست
شباں چوں چد خراب از بادۂ ناب　　رمہ در معدۂ گرگاں کند خواب
در آئینے کہ رسم ملک داری ست
ثباتِ کارہا در ہوشیاری ست

متفرق رباعیات

رفتم سوے خطیرہ وبگریستم بہ زار　　از ہجرِ دوستاں کہ اسیر فنا شدند
ایشاں کجا شدند چو گفتم خطیرہ است　　داد زصدا جواب کہ ایشاں کجا شدند
اقبال رالنا بنود دل درد مبند　　عمرے کہ برغرور گذاری ہسبابود
گرنیست بادرت زمن ایں نکتۂ شریف　　اقبال را چوقلب کنی لابقا بود
خسروچہ حالتست کہ درد ہرعالماں　　از جاہلان دون دنی باز پس تراند
ایں نکتہ ابیں وانصاف خوش سرائے　　کز چار حرف قطرہ ودریابرابر اند
از شعلۂ عشق ہرکہ افروختہ نیست　　بادرسوزنی دلم و وختہ نیست

ہندی کلام

امیر خسروؒ کا ہندی کلام بھی بہت تھا جواَب نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی حالت اُس زمانہ میں بالکل ایسی ہوگی جیسی آج انگریزوں کی ہے۔ آج انگریز اور انگریزی تعلیم یافتہ اُردو اور دیگر ملکی زبانوں اور اُن کی تصنیف وتالیف کو نہایت بے قدری اور نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور اُن میں تصنیف وتالیف اور کمال پیدا کرنے کو کوئی کمال نہیں سمجھتے اسی طرح اُس زمانے میں مسلمانوں کا حال ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہندی کلام کی ترتیب وتدوین کی طرف کوئی متجوہ نہیں ہوا۔ صرف چند گیت اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور دوہرے وغیرہ اور ایک غزل اور خالق باری کا اختصار آج تک مشہور چلا آتا ہے جن کا بیاں باب پنجم میں ہو چکا ہے۔

☆☆

باب ہشتم

شعرائے عہد

امیر حسن علاء سجزی دہلوی

نجم الدین نام حسن تخلص سادات عظام دہلی سے تھے۔ باپ کا نام علاؤ الدین سیستانی تھا۔ حضرت امیر خسروؒ اور یہ دونوں میدانِ سخنوری میں توام اور مصداق۔ ان ھذا الساحرون کے ہیں۔ آپ حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھے۔ ابتدائے حال میں روٹی کی دُکان کرتے تھے۔ جب امیر خسروؒ اور ان سے محبت پیدا ہوئی اُس وقت سے علوم و کمال کی تحصیل میں مشغول ہوئے اور بہت تھوڑی مدّت میں قابلیت علمی کے علاوہ اخلاق و عادات اوضاع و اطوار اور دیگر اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ سے موصوف ہوئے۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سے محمد تغلق کے عہد تک ہر بادشاہ کی ملازمت اور مصاحبت میں رہے اور ہر بادشاہ نے اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اعزاز و اکرام سے رکھا۔

ملا قاسم فرشتہ تاریخ فرشتہ میں تحریر کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت سلطان المشائخ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے واسطے پرانی دہلی کو تشریف لے گئے تھے۔ جب حضرت خواجہؒ کی زیارت سے فارغ ہو کر تالاب شمسی کے کنارے رونق افروز ہوئے اُس مقام پر امیر حسن شاعر جن کا سن اُس وقت پچاس برس سے زیادہ تھا اور جو ابتدائے حال میں حضرت سلطان المشائخ سے رابطۂ اتحاد اور مصاحبت کُلّی رکھتے تھے مع ایک جماعت یاروں کے مے نوشی میں مشغول تھے۔ جب حضرت کو دیکھا۔ آپ کے روبرو آئے اور یہ بیتیں پڑھیں ۔

سالہا باشد کہ ماہم صحبتیم ۔۔۔ گرز صحبتہا اثر بودے کجاست
زہد ماں فسق از دلِ ماکم نہ کرد ۔۔۔ فسق مایاں بہتر از زُہدِ شماست

حضرت سلطان المشائخ نے اِن بیتوں کو سن کر ارشاد فرمایا کہ صحبت ہار اثر ہاست انشاء اللہ روزے بود۔ یہ جواب جادو کی طرح اُن کے دل پر اثر کیا گیا۔ فوراً سر برہنہ کر کے حضرت سلطان المشائخ کے قدموں پر رکھ دیا اور جمیع مناہی سے تائب ہو کر مع اپنے رفقا کے مشرف بہ بیعت ہوئے اور ایسا مرتبہ کہ مقبولان اور محبوبان حضرت سلطان المشائخ سے ہو کر زمرۂ اولیاء اللہ میں شامل ہوئے۔ تائب ہونے کے بعد آپ نے ایک غزل میں یہ بیت موزوں کی تھی۔ اور اس کو اکثر پڑھا کرتے تھے۔

اے حسن توبہ انگہے کردی ۔۔۔ کہ ترا طاقتِ گناہ نہ ماند

مولانا جامیؔ نفحات الانس میں اور مولانا ضیاء الدین برنی اپنی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مکارم اخلاق اور محامد اوصاف اور لطافت و ظرافت اور قناعت اور عقل و فہم اور روش صوفیہ اور پاکیزہ اعتقادی اور شگفتہ روئی اور تہذیب میں مثل امیر حسنؒ کے بہت کم دیکھا اور سنا گیا ہے۔

اُن کی تصنیف و تالیف کی نسبت مولانا ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ علاوہ دیوان اور مثنویات کے نظم و نثر میں اُن کی بہت سی تصنیفات ہیں اور چونکہ وہ نہایت روانی سے وحدانی غزلیں موزوں کرتے تھے اس وجہ سے خاص و عام ان کو سعدی ہندوستان کہتے ہیں۔

مولانا جامیؔ بہارستان میں فرماتے ہیں کہ غزل میں اُن کا رنگ خاص ہے۔ انہوں نے ایسے تنگ قافئے اور عجیب و غریب ردیفیں اور خوش رنگ بحریں اختیار کی ہیں کہ اُن کے اشعار بادی النظر میں آسان معلوم ہوتے ہیں لیکن کہنے میں بہت دشوار ہیں اور اسی وجہ سے سہل ممتنع کے نام سے مشہور ہیں۔

امیر حسنؒ تمام عمر مجرد رہے اور جس زمانے میں محمد شاہ تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد بسانا شروع کیا۔ یہ بھی مشائخ دکن کی زیارت کی آرزو میں دولت آباد تشریف لے گئے اور اُسی جگہ ۲۹ صفر ۷۳۶ھ ۱۳۳۵ء کو وفات پائی اور بالاگھاٹ[1] پر مدفون ہوئے۔

---

[1] امیر حسن دہلویؒ کی درگاہ خلد آباد کی آبادی کے قریب واقع ہے جو دولت آباد سے دو تین کوس پر ہے۔ احاطہ درگاہ میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کا بھی مزار ہے۔

مخدوم اولیا نے یہ قطعہ تاریخ میں لکھا ہے۔ مادہ تاریخ عدی کی بیشی ہے ۔

چو خواجہ امیر حسن دہلوی آہ — بمردہ بعالم شدہ شور برپا
سنش عاشقے از سر آرزوے — بگفتہ حسن یافت نزد نبی جا

صاحب منتخب التواریخ لکھتے ہیں کہ قبر اُن کی دولت آباد میں مشہور ہے اور لوگ بطور تبرک اُس کی زیارت کیا کرتے ہیں۔ اب تک یہی حال ہے۔ اور دُور دُور سے لوگ مزار پر حاضر ہوتے ہیں اور اپنے بچوں کی ترقی ذہن کے واسطے شکر مزار پر ڈال کر کھلاتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے عہد میں ملک الشعرا فیضی دکن تشریف لے گئے تھے انہوں نے خاندیس سے بادشاہ کے نام ایک طول طویل عرضداشت بھیجی تھی اُس میں لکھتے ہیں۔ تربتِ میر حسن دہلوی در دولت آباد است غالباً ہمراہ سلطان علاؤ الدین آمدہ اینجا عمر مستعار بآخر سانید بخاطر رسید کہ دیوانِ او کشودہ یک غزل تبرکاً و تیمناً تتبع نمودہ شود اتفاقاً این غزل آمد ۔

بازنوائے بلبلاں عشق تو یادے دہد — ہر کہ بہ عشق نیست خزش عمر بباد ے دہد

فیضی نے اس غزل کے تتبع میں جو غزل اس موقع پر لکھی تھی، اس کا مطلع اور مقطع یہ ہے ۔

صبح کہ ترکِ مستِ من شیشہ کشادے دہد — عقل بجاک میدہد صبر بباد ے دہد
فیضی نامراد من از غم دہر غم مخور — زانکہ مراد ہل دل شاہ مراد ے دہد

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس فاضل باکمال کی تصنیف وتالیف سے اب سوائے فوائد الفواد کے اور کوئی یادگار باقی نہیں۔ اُن کا دیوان بھی نہیں چھپا۔ نہ عام طور سے دستیاب ہوتا ہے۔ تذکروں اور تاریخوں میں بھی اُن کی غزلیں اور اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں۔ فوائد الفواد میں حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات ۳ ماہ شعبان ۷۰۷ھ سے ۱۱ شعبان ۷۲۲ھ تک کے جمع کیے ہیں۔ اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں کہ امیر خسروؒ فرمایا کرتے تھے کہ کاش فوائد الفوائد میری طرف منسوب ہوتی اور میری تمام تصانیف امیر حسنؒ کے نام ہوتیں۔

دولت شاہ سمرقندی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ امیر حسنؒ شعر میں امیر خسروؒ کا

تتبع کرتے تھے اور ان کا کلام بہت شیریں ہے اور اس زمانہ ۷ ۹۵ ھ میں ان کا دیوان عزیز ومکرم ہے۔ امیر حسنؒ خود فرماتے ہیں۔

حسن گلے زگلستانِ سعدی آوردہ است — کہ اہل معنی گل چین آں گلستانند

اپنے اور امیر خسروؒ کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں۔ قطعہ

خسرو از راہ کرم بپذیرد — آنچہ من بندہ حسن مے گویم
ختم چوں سخنِ خسرو نیست — سخن ایں ست کہ من مے گویم

حضرت سلطان المشائخؒ نے ان کے اور امیر خسروؒ کے کلام کی نسبت یہ فقرہ فرمایا تھا ''کلامِ خسرو دریائے شوراست وکلامِ حسن جوئے شیریں۔'' مختلف تذکروں سے امیر حسنؒ کا تھوڑا سا کلام انتخاب کر کے درج کیا جاتا ہے۔

غزل

ساقیا مے دہ کہ ابرے خاست از ساغر سفید — سرو را سر سبز شد صدر برگ را چادر سفید
بادہ در جامِ بلوریں دہ مرا گرمے دہی — خوب مے آید شرابِ لعل را ساغر سفید
ابر چوں چشم زلیخا بہر یوسف ژالہ بار — ژالہا چوں دیدۂ یعقوب پیغمبر سفید
عنکبوتِ غار را گفتم کہ ایں پردہ چہ بود — گفت مہمانِ عزیز آمد کہ کردم در سفید
اے حسن اغیار را ہرگز نباشد طبع راست — راست است ایں زاغ ہرگز نباشد پر سفید

نیست چو رویت بہ گلستاں دگر — روے دگر باشد دبستاں دگر
یار چہ سخت ست دلِ کافرت — سخت دگر باشد وسنداں دگر
از تفِ عشقت جگرم پختہ شد — پختہ دگر باشد وبریاں دگر
غمزۂ خونخوار تو خونم بریخت — غمزہ دگر باشد وپیکاں دگر
گفت اگر عاشقِ مائی بمیر — عشق دگر باشد وقرباں دگر
چشم حسن بین ودر وموجزن
موج دگر باشد و طوفاں دگر

کارے کہ بود باتو مرا بیشتر نہ رفت — سر رفت در ہوائے تو ایں دردسر نہ رفت

مرا از زلف او موے پسند است   فضولی میکنم بوے پسند است
چہ لشکر مے کشی بر قلب عشاق   صفِ مغلوب را ہوئے پسند است
شتم زفرق تا بقدرم حلقہ در رکاب   آں شہسوار من قدم از من دریغ داشت
رسوار و نداز سر کوئے تو زاہداں   بر سر سبوئے بادہ بجائے عما مہا
تو آفتاب بے من صبح نتواں دانست   کہ بے تو من نتوانم نفس بر آوردن
از خویش بروں رو۔ زور دوست دروں آئے   تاگم نشوی گم شدۂ خویش نیابی
من بودم دکنجے وحریفے وسرودے   غم راکہ نشاں داد بلا راکہ خبر کرد
مشکل سرور کاریست کہ بر وعدۂ معشوق   صابر نتواں بود وتقاضا نتواں کرد
حسن دعاے تو گر نیست مستجاب مرنج   ترا زبان دگر و دل دگر دعا چہ کند
چرخ را در اصل چوں خلقت کج است   دور کج رافعل کج آید تراست
مور مسکیں ہوسے داشت کہ در کعبہ رس   دست بر پاے کبوتر زود ناگہ برسید
نمیرفتم بلاشد بوئے زلفش   خراب اندر پئے آں بوئے رفتم
عطار گو بہ بند دکاں راکہ من ز دوست   بوے کشیدہ ام کہ بمشک وعبیر نیست
زہے ترکے کہ از خمہاے ابرو   کماں پیدا کند پنہاں زتدبیر
بگوشِ مدعی کے جاے گیرد   مزامیرے کہ ہست اندر مزامیر

رباعی

دارم دلکے غمگیں بیامرز و مپرس   صد واقعہ در کمیں بیامرز و مپرس
شرمندہ شوم اگر بپرسی علم   اے اکرم الاکرمی بیامرز و مپرس

دیگر

یک حرف تو چہل صباح عالم رانور   یک حرف تو ہشت خلد را مایۂ حور
حرف کمیں چہل دلے را دستور   زاں چار چہار رکن عالم معمور

ملک سعد الدین منطقی

یہ سلطان جلال الدین خلجی کے مصاحبوں میں تھا۔ ابتدائے حال میں قلندری

میں بسر کرتا تھا۔ بادشاہ نے جامۂ قلندری سے نکال کر امیر کبیر بنا دیا۔ یہ اور عبید شاعر اُن لوگوں میں تھے کہ حسد کی آگ میں جل کر چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے تھے اور اپنے کلام کو امیر خسروؒ کے کلام پر ترجیح دیتے تھے۔ افسوس ہے کہ باوجود تلاش ان کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوا۔

عبید

غیاث الدین تغلق کے عہد میں ایران سے ہندوستان میں وارد ہوا۔ شہزادہ الغ خاں (محمد تغلق) کی ملازمت میں نہایت اعزاز و اکرام سے بسر کرتا تھا۔ لیکن نہایت بلند نظر، مغرور، بد دماغ اور بدنیت تھا۔ اکثر علوم میں مہارت رکھتا تھا۔ لیکن طبیعت بیہودہ گوئی پر بہت راغب تھی۔ اپنے آپ کو امیر خسروؒ کا مدمقابل سمجھتا تھا۔ آپ کی نسبت اُس کا یہ شعر مشہور ہے ؎

غلط اُفتاد خسرو راز خامی　　　که سکبا پخت در دیگِ نظامی

۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء میں جبکہ شاہزادہ الغ خاں قلعہ وارنگل کا محاصرہ کر رہا تھا کسی وجہ سے دہلی کی ڈاک آنے میں دیر ہوئی۔ عبید نے مفسدہ پردازی کی وجہ سے یہ خبر لشکر میں اُڑا دی کہ بادشاہ (غیاث الدین) کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر سے تمام لشکر میں کھلبلی پڑ گئی اور عبید مع چند دیگر سرداروں کے لشکر سے بھاگ گیا لیکن شاہزادے نے بہت جلد گرفتار کرا کر دہلی بھیج دیا۔ جہاں بادشاہ نے اُس کا قتل کرا دیا۔

عبید کے کلام سے یہ رباعی اور غزل مشہور ہے۔ رباعی

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلبِ علم　　　کاندر طلبِ راتبہ ہر روز بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز　　　تا دادِ خود از کہتر و مہتر بستانی

رسد بشیتے رویت جمالِ مہ بہ کمال　　　بروز نکہت رویت صبا خبر بہ شمال
زندہ تیر نظر غمزہ ات نشانۂ مہر　　　کشد بہ گوشۂ چشم ابروت کمانِ ہلال
توئی کہ آبِ حیات از لبت بود سائل　　　خوشا کسے کند بالبت جواب و سوال

حرام گشتہ بغیر از عبید در عشقت
بشاعرانِ تخیل نمائے سحر حلال

قاضی مغیث ہانسوی

سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں ایک بڑا عالم فاضل تھا۔ اُس نے ایک غزل لکھی تھی جو اُنیس بحروں میں پڑھی جاتی تھی۔ اس غزل کا مطلب یہ ہے۔

دو دُر گوش وقد خوش دو خد خوب وخط تر　　فرتوفری پری وپرے وباکروفر

ان کے علاوہ امیر خسروؒ کے ہمعصر اور بھی بہت سے شاعر مثل تاج الدین عراقی اور مؤید جرجامی اور مؤید دیوانہ اور امیر ارسلان کلامی اور اختیار الدین باغی گذرے ہیں لیکن جس طرح کہ آفتاب و ماہتاب کی روشنی میں چراغ کی روشنی کو فروغ نہیں ہوا اور نہ آج ان کا کلام ملتا ہے۔ اکثر مؤرخین نے تو صرف یہ لکھ کر ٹال دیا ہے کہ امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ کے علاوہ اور بھی شاعر اُس وقت میں صاحبِ دیوان تھے مگر ان کے حال لکھنے کے بعد اُن کا ذکر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

خاتمہ کتاب

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(حافظ)

اے شناورِ دریائے حقیقت وتوحید واے بلبلِ گلستانِ چشت واے طوطیٔ بوستانِ نظامیہ۔ مجھے اوائل عمر سے آپ کے ساتھ جو محبت اور اعتقاد ہے اس کے لحاظ سے میں نے اپنی بساط کے موافق فارسی اُردو انگریزی کے بیش بہار اور لازوال خزانوں سے آپ کے کمالات کے خوشنما گوہروں کو چُن چُن کر ان اوراقِ پریشاں میں جمع کیا ہے۔ مگر میری بے بضاعتی اور کم علمی کی وجہ سے آپ کے اوصاف وکمالات کا سچا اور خوشنما فوٹو مجھ سے نہ کھنچ سکا۔

اے جامع علوم ظاہری وباطنی ومنبع کمالات صوری ومعنوی! آپ کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ کی تعریف مجھ جاہلِ محض کے بیان کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کے اخلاق اور اوصاف کی مجسم یادگاریں اور فخر کی دستاریں خود آپ کی تصنیفیں تالیفیں صفحۂ روزگار پر موجود ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گی۔

اے نخلبند بوستانِ سخن آرائی!

آپ کا نامِ نامی میری طرف سے شہرت کا محتاج نہیں ہے بلکہ خود آپ کے مضامین سحر آمیز کے خوشنما پھول اس گلشن دہر میں اپنے قدرتی اور لازوال جوبن کی بہار دکھا دکھا کر آپ کے نام نامی اور اسمِ گرامی کی شہرت اور عزّت کا باعث ہیں۔

اے صدر آرائے مجالسِ فصحا!

آپ کی نیک زندگی کے حالات لکھنے میں میری مثال مانند اُس بڑھیا کے ہیں جو محض اپنے جوشِ عقیدت سے ایک چند یا سوت کو لے کر بازار مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں شامل ہوئی تھی۔ پس میں نہایت صدق دل اور عاجزی سے آپ کی روح سے اپنی ناکامی اور درماندگی کی معافی چاہتا ہوں۔

اور

بارگاہ ایزدی میں دست بہ دعا ہوں

کہ

آپ کے نام اور کلام کی برکت ان پراگندہ اوراق کو قبولیتِ عام کا اعزاز اور مجھ عاجز گنہ گار کے نام کو آپ کے نامِ نامی کے طفیل میں بقائے دوام کا افتخار حاصل ہو اور انجام بخیر ہو۔

آمین یارب العالمین

☆☆

ضمیمہ

حضرت نظام الدین اولیاؒ

تمہید

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اور انبیائے عظام علیہم السلام کے ذکر کے بعد کوئی ذکر اولیائے کرام اور صوفیانِ عظام کے ذکر سے بہتر نہیں ہے۔ حدیثِ قدسی میں آیا ہے عند الذکر الصالحین تنزل الرحمۃ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت صالحین کے ذکر کے وقت نازل ہوتی ہے۔ مولانا سید عبدالواحد بلگرامیؒ فرماتے ہیں ؎

اے دل از اخلاقِ مرداں بہرہ مند ار نیستی | بارے اخلاقِ بزرگاں راز جاں تکرار کن
عِندَ ذِکرِ الصالحین الحق نزول رحمت ست | ہر زماں ذکرِ جوانمردانِ دیں بسیار کن
گہ بدل برخوبۓ احوال شاں مشتاق باش | گہ زچشم از پاکی اخلاق اشک ایثار کن

حضرت شیخ الاسلام عبداللہ انصاری رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے اولیاءِ خدا کی باتیں یاد رکھو اور جو یہ بھی نہ ہو سکے تو ان کے اسمائے گرامی ہی یاد رکھو کہ یہی کافی ہیں۔

خود حضرت سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اے امیر خسروؒ ملفوظات مشائخ کو یاد کرو اور اُن کا ذکر کیا کرو کہ اُن سے دل کو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ ہماری زبان اُردو میں حضرت سلطان المشائخ کی متعدد سوانح عمریاں اور ملفوظات شائع ہو چکے ہیں لیکن محض اس سعادت ابدی اور دولتِ سرمدی کے حصول کی خواہش میں حضرت

کا مختصر ذکرِ خیر ان پراگندہ اوراق میں تیمناً وتبرکاً تحریر کیا جاتا ہے کیا عجب ہے کہ یہ چشمۂ خیر اس ناچیز کتاب کے واسطے آبِ حیات کا باعث ہو اور اسے مقبولیتِ عام اور بقائے دوام کا مرتبہ حاصل ہو اور یہی ذکرِ خیر قیامت کے دن اس عاجز گنہگار بندۂ شرمسار کی بخشش کا وسیلہ ہو۔ بقول شیخ سعدی علیہ الرحمتہ ؎

شنیدم کہ در روز امید وبیم | بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

دعا

یارب اندر معصیت دارم بہ اہل اللہ صفا | آں صفا را چارۂ عفوِ من بدکار کن
برورِ مرداں کہ لَاخَوْفٌ وَّلَاہُم تیغ زَنُون | بندۂ مملوک آزاد از عذابِ نار کن
کسوتِ اہل از من نااہل تلبیس ست اگر | ہم تو بر مستہزئے موسیٰ پیمبر کار کن

بندۂ گنہگار عاجز وشرمسار

(مولانا سیّد عبدالواحد)

سعید مارہروی

☆☆

حضرت کا اسمِ مبارک نظام الدین محمد اور آپ کے والد ماجد کا نام خواجہ سید احمد ہے آپ سادات عظام حسینی سے ہیں۔ نسب شریف آپ کا بعض کتب سیر میں اٹھارہ واسطہ سے اور بعض میں سولہ واسطہ سے حضرت شیر خدا علی کرم اللہ وجہہ سے اس طرح ملتا ہے۔

حضرت سید (۱) احمد بن حضرت خواجہ سید (۲) علی الحسینی البخاری بن سید عبد (۳) اللہ بن سید (۴) حسن بن سید (۵) میر علی بن سید (۶) میر احمد بن سید (۷) میر ابی عبداللہ بن سید (۸) میر علی اصغر بن سید (۹) جعفر بن سید (۱۰) علی امام بن سید (۱۱) علی الہادی النقی بن سید (۱۲) امام محمد ن الجواد بن امام الاتقیا حضرت امام (۱۳) علی موسے رضا بن امام (۱۵) علی موسیٰ کاظم الغیظ بن الامام الہمام حضرت (۱۵) جعفر صادق بن الامام محمد ن الباقر بن الامام علی حضرت زین العابدین بن الامام فی الارض والسماء سلطان الشہداء جناب حضرت امام حسین الشہید رضی اللہ عنہ ابن امام الاولیاء حضرت علی مرتضیٰ علیہم السلام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

سلطان شمس الدین کے عہد میں آپ کے جدّ امجد حضرت خواجہ علی بخاریؒ اور جدّ مادری حضرت خواجہ سید عربؒ نے بخارا یا غزنی سے ہندوستان میں تشریف لا کر پہلے لاہور میں قیام کیا اس کے بعد بدایوں تشریف لائے اور وہیں سکونت اختیار کی اور دونوں بزرگوں میں آپس میں قرابت پیدا ہوئی۔ یعنی خواجہ عربؒ نے اپنی دختر نیک اختر رابعۂ عصر بی بی زلیخا کی شادی خواجہ سید احمدؒ خلف خواجہ علیؒ کے ساتھ کی۔ خواجہ احمد نہایت صالح متقی اور صاحب فضل وکمال تھے اُن کا مزار بدایوں میں ہے۔

۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء میں بروز آخری چہار شنبہ ۲۷ صفر کو بعد از طلوع آفتاب بطن حضرت بی بی زلیخا سے حضرت سلطان المشائخ پیدا ہوئے۔ مولانا جمالی صاحب سیر العارفین کیا خوب فرماتے ہیں۔

آفریں از خدائے بر پدرے — کہ از و ماند ایں چنیں پسرے
پدرے را کہ آنچناں خلف است — مادرے را کہ ایں چنیں پسرے
آفتابش بر آستین قباست — ماہتابش بر آستان دراست

آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی زلیخا کاملہ رُوزگار اور رابعہ عصر تھیں۔ اخبار الاخیار اور فوائد الفواد میں خود حضرت سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ والدہ مارا با خدائے آشنائی بود یعنی اُن کو اللہ تعالیٰ سے دوستی تھی آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب میری والدہ ماجدہ کو کوئی حاجت پیش آتی تو پانچ سو بار درود شریف پڑھتیں اور دامن مبارک اپنا پھیلا کر دعا مانگتیں وہ دعا مقبول ہوتی تھی۔ جس دن گھر میں غلہ موجود نہ ہوتا تھا تو جب میں گھر میں جاتا مجھ سے فرماتیں۔ نظام الدین امروز ما مہمان خدائیم۔ مجھ کو یہ سخن بہت پیارا معلوم ہوتا تھا ایک روز میں اسی سخن کے ذوق میں تھا کہ اتفاقاً ایک مرد ایک تنکہ کا غلہ لاکر میرے گھر میں دے گیا۔ چند روز متواتر اُس سے روٹی پکا کر گذر کی میں تنگ آگیا کہ کب میری والدہ یہ لفظ فرمائیں گی کہ ما مہمان خدائیم جب وہ غلہ تمام ہوا اور میری والدہ نے فرمایا کہ ما مہمان خدائیم اُس وقت جو ذوق اور راحت مجھ کو پیدا ہوئی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔

جب حضرت سلطان المشائخ کی عمر پانچ برس کی ہوئی آپ کے والد ماجد نے اس دار فانی سے انتقال فرمایا۔ آپ کی والدہ ماجدہ متکفل آپ کی پرورش اور تربیت کی ہوئیں اور مکتب میں برائے تعلیم قرآن مجید و فرقان حمید بھیجنا شروع کیا۔ اوّل آپ نے خواجہ شادی مقری بدایونی سے ایک پارہ قرآن شریف کا پڑھا۔ اس کے بعد مولانا سید علاؤ الدین اصولی اور مولانا کمال الدین سے علم ظاہری حاصل کیا۔

ایک روز آپ کی والدہ ماجدہ علماء اور مشائخ شہر کی دعوت فرمائی اور جلسہ دستار بندی فضیلت منعقد فرمایا۔ ایک پگڑی اپنے دست مبارک سے سوت کات کر آپ کی والدہ نے بنوائی تھی وہ پگڑی ایک صاحب کمال درویش علی مولا نامی نے حضرت سلطان المشائخ کے سر پر باندھی۔ حضرت نے اپنا سر مبارک علی مولا کے قدموں پر رکھا۔ انہوں نے دعا دی کہ اللہ تجھ کو علمائے دین سے کرے۔

بیس یا پچیس برس کی عمر میں آپ مع اپنی والدہ ماجدہ کے دہلی تشریف لائے اور ہلال طشت دار کی مسجد کے نیچے ایک حجرے میں سکونت اختیار کی۔ اُس وقت دہلی میں ایک فاضل متبحر خواجہ شمس الدین خوارزمی تھے اُن کے حلقہ دُرس میں آپ نے شامل ہو کر مقامات حریری کے چالیس مقامے پڑھے اور علم حدیث کی سند حاصل کی۔

صاحب تاریخ فرشتہ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ جامع علوم ظاہری و باطنی تھے اور ہمیشہ آپ کا دل انوار منزل کتب معتبرہ تصوف مثل فصوص الحکم اور مواقع النجوم اور ان کی شرحوں کے مطالعہ کی طرف مائل تھا۔ فقہ حنفی اور تفسیر و حدیث اور اصول و کلام میں آپ مہارت تمام رکھتے تھے۔

منقول ہے کہ جس زمانے میں کہ عمر شریف آپ کی بارہ برس کی تھی اور آپ بدیوں میں کتب لغت پڑھتے تھے ایک قوال ابوبکر نامی ملتان سے آپ کے اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا حال بیان کرنا شروع کیا کہ میں نے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی مجلس میں راگ گایا اور یہ شعر پڑھا ۔

قدلسعت حیته الهوی کبدی

(ہر آئینہ ڈسا ہے مار عشق نے میرے جگر کو) مصرع دوم اس کو اُس وقت یاد نہ آیا جس کو آپ نے یاد دلایا وہ یہ حال دیکھ کر آپ کی جانب مخاطب ہوا اور آپ سے اپنے سفر اور خانقاہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے حالات بیان کرنا شروع کئے اور کہا کہ خانقاہ شیخ موصوف میں ہر شخص ذاکر ہے حتیٰ کہ لونڈیاں جو آٹا گوندھتی ہیں اپنے کام میں بھی ذکر اور شغل سے فارغ اور خالی نہیں رہتیں۔ میں ایک عرصے تک وہاں رہا۔ بعدہٗ روانہ ہو کر پاک پٹن میں آیا اور وہاں زیارت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہٗ سے مشرف ہوا۔ آپ اس قدر باعظمت اور ہیبت ہیں کہ حال شریف آپ کا اور درویشان خانقاہ کا میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ کی ذات ایک عجب دریائے فیض ہے کہ آنے والا کیسا ہی بد بخت ہو خانقاہ مبارک سے محروم نہیں جاتا۔ بمجرد استماع ان حالات کے حضرت سلطان المشائخ کو عشق غائبانہ حضرت بابا خواجہ فرید الدین شکر گنجؒ کا پیدا ہو گیا اور اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے آپ ہی کا خیال دل میں رہنے لگا۔ جب آپ بدایوں سے دہلی تشریف لائے۔ اتفاق سے آپ جس حجرے میں مقیم تھے اسی کے قریب حضرت شیخ نجیب الدین متوکل قدس سرہٗ کا جو چھوٹے بھائی بابا فرید شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کے تھے مکان تھا۔ وہ نہایت درجے کے صاحب باطن اور عالم صوری و معنوی تھے۔ حضرت سلطان المشائخ بہ حسن عقیدت اکثر آپ کی خدمت میں نشست و برخاست رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ فیمابین بہت محبت اور اتحاد بڑھ گیا۔ ایک دن آپ نے اُن سے فرمایا کہ آپ میرے

واسطے دعا فرمائیں کہ میں کسی جگہ کا قاضی ہو جاؤں تا کہ خلق خدا کے مقدمات وہ معاملات کو انصاف سے فیصل کیا کروں۔ یہ سن کر حضرت نجیب الدینؒ ساکت ہوئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ آپ یہ سمجھے کہ شیخ نجیب الدینؒ نے نہیں سنا۔ پھر باواز بلند کہا التماس فاتحہ کی رکھتا ہوں۔ اس مرتبہ شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ تو قاضی نہ ہوگا لیکن وہ ہوگا جو میں جانتا ہوں۔ اس کے بعد ایک شب کو جبکہ آپ جامع مسجد دہلی میں تھے صبح کی نماز کے وقت آپ نے سنا کہ موذن نے منارے پر یہ پڑھا۔ اَلَمْ یَانِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ (کیا وقت نہیں پہنچا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں اُن کے دل اللہ کی یاد سے) یہ سنتے ہی آپ کا حال متغیر ہوا اور نور الٰہی نے آپ کو گھیر لیا۔ چونکہ اُس زمانے میں خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کی مشیخت اور کرامت کا شہرہ عالمگیر ہو رہا تھا۔ اور پہلے ہی سے حضرت کے غائبانہ عشق میں آپ مبتلا تھے۔ صبح ہوتے ہی بغیر سواری اور زادِ راہ کے انتظام کے آپ پاک پٹن کی طرف روانہ ہوئے۔ راحت القلوب[1] میں آپ خود تحریر فرماتے ہیں کہ بتاریخ ۱۰ ماہ رجب المرجب ۶۵۵ھ بروز چہار شنبہ مجھے سعادت قدمبوسی حضرت سید العابدین سند العارفین کی حاصل ہوئی آپ نے نہایت مہربانی اور شفقت فرمائی اور خرقہ اور نعلین چوبی (کھڑاویں) مرحمت فرمائیں اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میرا ارادہ ولایت ہند کسی دوسرے شخص کو تفویض کرنے کا تھا مگر تم راستے میں تھے کہ مجھ پر الہام ربانی ہوا کہ یہ نظام الدین کا حق ہے جب وہ حاضر ہو اُسے عنایت کرنا چاہیے۔ میں یہ سن کر قدمبوسی ہوا اور اس شوقِ ملازمت کا حال بیان کرنا چاہا جو مجھے واسطے حضوری کے تھا۔ الّا زبان نے یاری نہ دی اور دہشت شیخ الاسلام رحمتہ اللہ علیہ کی غالب آئی۔ آپ نے روشن روشن سے واسطے رفع ہیبت کے فرمایا کہ جائے دہشت اور مقامِ خوف نہیں ہے اور یہ بھی ارشاد فرمایا۔

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ   سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں تحریر فرماتے ہیں کہ جس روز حضرت

---

[1] راحت القلوب۔ اس کتاب میں حضرت سلطان المشائخ نے ملفوظات اپنے پیر بابا فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کے جمع فرمائے ہیں۔

سلطان المشائخ شرف بیعت سے مشرف ہوئے آپ نے خدمت مرشد میں عرض کی کہ اگر حکم صادر ہو تو میں ترک تعلیم کر کے اوراد و نوافل میں مصروف ہوں آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں کسی کو تعلیم و تعلم سے منع نہیں کرتا یہ بھی کرو اور وہ بھی کرو۔ غالب اپنے مغلوب کو آپ ترک کرا دے گا۔ درویش کو کسی قدر علم ضرور ہونا چاہئے۔ اس کے بعد آپ خانقاہ مبارک میں مصروف عبادت ہوئے اور طریقہ مجاہدہ اور ریاضت کا اختیار کیا۔ آٹھ ماہ کے بعد ۲ ربیع الاوّل ۶۵۶ھ کو حضرت بابا فرید الدین شکر گنج نے دستار مبارک حضرت سلطان المشائخ کے سر پر رکھ دی اور عصا مرحمت فرما کر خرقہ خواجگان چشت رحمتہ اللہ علیہم جو سلسلہ بہ سلسلہ چلا آتا تھا اپنے دست مبارک سے حضرت سلطان المشائخ کو پہنایا اور فرمایا کہ نماز دوگانہ شکرانہ ادا کرو۔ اس کے بعد سند خلافت حضرت شیخ بدر الدین اسحٰقؒ سے لکھوا کر اپنے دست مبارک سے عطا فرمائی اور بغلگیر ہو کر ارشاد فرمایا کہ جاؤ خدا کو سونپا۔ حضرت سلطان المشائخ حسب الحکم مرشد کامل کے پاس پٹن سے دہلی تشریف لائے اور حضرت نجیب الدین متوکلؒ سے سب حالات وہاں کے بیان فرمائے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد آپ آبادی سے دور ایک غیر معروف جگہ غیاث پور میں سکونت پذیر ہو کر یاد الٰہی میں مشغول ہوئے۔ جب ۶۸۵ ہجری میں سلطان معز الدین کیقباد نے موضوع کیلوگڑھی میں جو نزدیک موضع غیاث پور کے تھا قصر شاہی اور قلعہ تعمیر کرا کر شہر آباد کیا اور جامع مسجد بنائی اُس وقت سے ایک انبوہ کثیر آپ کے پاس آنے جانے لگا۔ خود آپ سے منقول ہے کہ جب خلق کا مجھ پر ہجوم ہوا اور آمد و رفت امرا اور ملوک بہ کثرت ہونے لگی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس جگہ سے چلا جانا مناسب ہے۔ اسی اندیشے میں تھا کہ اُسی روز عصر کے وقت ایک جوان صاحب جمال بغایت نحیف البدن آیا اور مجھے دیکھتے ہی یہ اشعار زبان پر لایا ؎

آں روز کہ مہ شدی نمید انستی ۔۔۔ کانگشت نمائے عالمے خواہی شد
امروز کہ زلفت دل خلقے بربود ۔۔۔ در گوشہ نشستنت نمیدارے سود

اس کے بعد یہ بات کہی کہ آدمی کو اوّل مشہور نہ ہونا چاہئے اور جس وقت مشہور ہوا پھر اسے گمنام ہونے کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ ورنہ فردائے قیامت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو شرمندہ ہونا ہوگا۔ اس کے بعد کہا کہ کس قدر پست ہمتی اور کم حوصلگی

کی بات ہے کہ خلق سے گوشہ گیر ہو کر حق سے مشغول ہوں بلکہ مردوں کا یہ کام ہے کہ باوجود کثرت آمد ورفت خلائق حق سے مشغول رہیں۔ جب وہ خاموش ہوا میں نے کسی قدر طعام جو موجود تھا اُن کے روبرو رکھا، انہوں نے نہیں کھایا۔ میں نے اُسی وقت دل میں نیت کی کہ یہیں رہوں گا۔ جس وقت میں نے یہ نیت کی انہوں نے ہاتھ کھانے میں ڈالا اور کسی قدر تناول فرمایا اور پانی پیا اور چلے گئے۔ بعد اس واقعہ کے میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔

اسی عرصے میں امیر خسروؒ مع اپنے بھائیوں اعزالدین علی شاہ اور حسام الدین کے حضرت کے مریدوں میں داخل ہوئے اور خاص وعام بجانب حضرت کے رجوع لائے اور دروازے فتوح کے مفتوح ہوئے کہ ایک عالم نے اُس سے فائدہ اُٹھایا۔ لیکن باوجود اس شوکت وعظمت کے ریاضت اور مجاہدہ آپ کا اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ہر روز روزہ رکھتے اور وقت افطار بہت تھوڑا کھانا تناول فرماتے اور سحری بھی نہ کھاتے تھے۔ اہل خانقاہ نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ آپ کھانا بہت کم کھاتے ہیں اور سحری بھی نہ کھاتے تھے۔ اہل خانقاہ نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ آپ کھانا بہت کم کھاتے ہیں اور سحری بھی تناول نہیں فرماتے۔ اس سبب سے آپ کی قوت بہت کم ہو جاوے گی۔ آپ یہ سن کر رو پڑے اور فرمانے لگے کہ بہت سے درویش اور مساکین مساجد اور دوکانوں کے گوشوں میں بھوکے پیاسے فاقہ زدہ پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کا یہ حال ہو اور میں شکم سیر ہوں۔ اس حالت کی یاد آوری سے کھانا میرے حلق کے نیچے نہیں اُترتا۔ ایسی ہی باتیں فرما کر آپ زار زار رونے لگے۔

مجاہدہ اور روزے کی نسبت آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ ہنگام سفر کشتی میں تنہا حضرت بابا فریدالدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ تھا۔ آپ نے مجھ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ دہلی میں بیکار رہنا اچھا نہیں ہے۔ مجاہدہ اختیار کرنا، روزہ ہمیشہ رکھنا کیونکہ روزہ نصف راہ دین ہے اور دیگر اعمال نصف راہ دیگر۔

منقول ہے کہ آپ شب کو حجرہ خاص کا دروازہ اندر سے بند فرما لیتے تھے اور تمام شب راز و نیاز میں مشغول رہتے تھے۔ جب صبح کے وقت دروازہ کھولتے تو بوجہ شب بیداری چشم مبارک سُرخ ہوتی تھیں۔ اس وقت جس کی نظر آپ کے جمالِ مبارک پر پڑتی وہ یہی تصور کرتا تھا کہ ایک مست و مخمور ہیں۔ امیر خسروؒ اسی ضمن میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

تو شبینہ ے نمائی ببرے کہ بودی امشب — کہ ہنوز چشم مست اثر خمار دارد

حضرت سلطان المشائخ کو سماع سے بہت رغبت تھی۔ دو سو قوال جن کا سردار امیر حسن قوال تھا آپ کی خانقاہ کے وظیفہ خوار تھے۔ امیر خسروؒ اور خواجہ حسن بھی کہ علم موسیقی میں عدیم المثال تھے۔ مجلس سماع میں نہایت خوش لحانی سے گاتے تھے۔

منقول ہے کہ جس زمانے میں حضرت سلطان المشائخؒ اپنے پیر حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کے حضور میں حاضر رہتے تھے ایک مرتبہ حضرت بابا صاحب نے آپ کے پاجامے کی طرف نظر کی تو وہ بہت بوسیدہ اور پھٹا ہوا معلوم ہوا۔ حضرت بابا صاحب نے اپنے گھر میں سے اپنا پاجامہ طلب فرما کر آپ کو عنایت فرمایا اور کہا کہ اس کو پہن لو۔ آپ نے کمال خوشی سے اسی وقت اپنے پاجامے پر اس کو پہن لیا لیکن جب کمر بند باندھتے تھے تو وہ کھل جاتا تھا۔ حضرت بابا صاحب نے فرمایا کہ اچھی طرح باندھو، آپ نے فرمایا کہ کس طرح باندھوں۔ فرمایا کہ ایسا باندھو کہ پھر حوروں کے واسطے بھی نہ کھلے۔ آپ نے سر قدموں پر رکھ کر قبول کیا اور بتوفیق الٰہی آخر عمر تک مجرد رہے اور مباشرت نہیں فرمائی۔

منقول ہے کہ خانقاہ عالی میں دو ہزار تنگہ روزانہ خرچ مطبخ اور خیرات فقراؔ و مساکین وغیرہ میں اٹھتا تھا۔ روزانہ جس قدر نذرانہ آتا تھا سب فقراؔ اور مساکین پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ایک روز سلطان علاء الدین خلجی نے ایک مندیل زر و جواہر سے مملو کر کے برسم نذر حضرت سلطان المشائخؒ کے پاس بھیجی۔ اس وقت ایک قلندر اسفندیار نام حضرت کے پاس بیٹھا تھا۔ دور سے اس کی نگاہ اس پر پڑی اور اسے دیکھ کر حضرت کی طرف مخاطب ہو کر کہا:۔ ایہا الشیخ ہدایا مشترک۔ آپ نے از راہ ظرافت جواب دیا۔ اما تنہا خوشتر۔ قلندر نے مایوس ہو کر اٹھنا چاہا۔ آپ نے فرمایا کہ تنہا خوشتر سے میرا یہ مقصود تھا کہ تنہا تجھے مبارک ہو۔ یہ فرما کر تمام زر و جواہر اس قلندر کو بخشا۔ اس سے تنہا نہ اُٹھ سکا اور خانقاہ کے خادموں نے اس کی مدد کی۔

حضرت سلطان المشائخؒ سے اس قدر کرامات اور خوارق عادات منسوب ہیں کہ اگر مختصر بھی بیان کئے جاویں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاوے افسوس ہے کہ اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں۔ جن صاحبوں کو شوق ہو وہ سیر الاولیاء، سیر العارفین، راحت المحبین۔ افضل الفوائد، اخبار الاخیار اور دیگر کتب، سیر میں ملاحظہ فرمادیں۔

منقول ہے کہ آپ نے رحلت فرمانے سے چالیس روز پیشتر کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ آٹھ مہینے سے آپ کو بول و براز نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز اقبال اپنے خادم کو روبرو بلا کر فرمایا کہ جو کچھ اسباب نقد و جنس ہماری ملکیت سے ہے وہ سب حاضر لاؤ کہ ہم مستحقین کو تقسیم کر دیں۔ خواجہ اقبال نے عرض کیا کہ جو کچھ فتوح میں اسباب آتا ہے وہ اسی دن خیرات ہو جاتا ہے۔ البتہ چند ہزار من غلّہ کا انبار ہے کہ جو روزانہ خرچ لنگر میں صَرف ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو کس واسطے رکھا ہے اسے بھی جلد باہر نکالو اور مستحقین کو تقسیم کرو غرضیکہ اسی وقت تمام غلّہ اور اسباب لٹوا دیا۔ اور بعد نماز ظہر بدھ کے دن حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ کو طلب فرما کر خرقہ اور عصا اور مصلا اور تسبیح اور کاسۂ چوبی جو اپنے پیر سے ملا تھا عطا فرمایا اور کہا کہ تم کو یہاں دہلی میں رہ کر زمانے کے جور و جفا پر صبر کرنا چاہئے۔ اس کے بعد نماز عصر آپ نے ادا فرمائی اور تھوڑی دیر بعد تاریخ ۱۸ ربیع الثانی[1] ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء کو ۹۴ برس کی عمر میں جوارِ رحمت حق میں آپ واصل ہوئے۔

منقول ہے کہ حالتِ بیماری میں اکثر بیہوش ہو جاتے تھے۔ جب ہوش آتا ارشاد فرماتے کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے یا نہیں اگر کہا جاتا کہ آپ ادا فرما چکے ہیں تو آپ ارشاد فرماتے کہ ایک مرتبہ اور پڑھ لوں۔ اسی طرح ایک وقت کی مکرر سہ کرر نماز ادا فرماتے تھے اور اکثر یہ مصرعہ وردِ زباں رہتا تھا۔

میروم میروم میروم

مزار مبارک آپ کا مرجع حاجات خلائق اور زیارت گاہ خاص و عام موجودہ دہلی سے تین کوس جانب دکن واقع ہے۔ یہ مقام حضرت کی زندگی میں غیاث پور کے نام سے مشہور تھا اب آپ کی درگاہ عالی کے باعث درگاہ نظام لدین کے نام سے موسوم ہے۔

یہ قطعہ تاریخ وصال کسی نے خوب موزوں کیا ہے جو درگاہ میں دیوار مسجد پر کندہ ہے۔

نظام دو گیتی شہِ ماوطیں ۔۔۔ سراجِ دو عالم شدہ بالیقیں

جو تاریخ فوتش بجستم زغیب ۔۔۔ ندا داد ہاتف شہنشاہ دیں

---

[1] حضرت امیر خسروؒ نے جو مرثیہ لکھا ہے اس میں یہ بیت تاریخ وصال میں تحریر فرمائی ہے۔

ربیع دوم ہژدہ زمہ وار برفت آں مہ ۔۔۔ زمانہ چوں شمار بیست داد و پنج و ہفصد را

حضرت کے بہت سے خلیفہ ایسے ہیں کہ جو اولیاء اللہ میں شمار ہوتے ہیں، اور ان سے بے شمار فیض جاری ہوئے ہیں لیکن سب سے مشہور فاضل اور کامل یہ بزرگوار ہیں۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ، حضرت خواجہ حسن علاء سنجری دہلویؒ، مولانا فخر الدین زرادیؒ، مولانا علاؤ الدین نیلویؒ، مولانا شمس الدین یحییٰؒ، مولانا حسام الدین ملتانیؒ، مولانا سراج الدین عثمانؒ، شیخ قطب الدین منورؒ اور مولانا وجیہ الدین پائلیؒ۔

امیر خسروؒ حضرت کے مریدوں کی نسبت کیا خوب فرماتے ہیں ؎

وال مریدان رہروانِ یقیں — ہر یکے والئے ولایتِ دیں
ہمہ شیطاں کش فرشتہ خدم — دود ہش بر ہوا نہادہ قدم
زندہ دار شب از دم تسبیح — غلغل افگندہ در رواقِ مسیح
ہر سوار آستین شرع ساختہ تاج — دل شاں عرش وسجدہ شاں معراج
ملک بوحدت بنام ایشان ست — بندہ خسرو غلام ایشان ست
نامِ من زاں ستو وہ کیشاں باد — حشر من درمیان ایشاں باد

حضرت امیر خسروؒ نے حضرت سلطان المشائخؒ کی مدح اور شان میں اس قدر فرمایا ہے کہ اگر سب کو یک جا جمع کیا جاوے تو بلا شبہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاوے۔ اس میں تبرکاً و تیمناً کچھ حصہ باب دوم میں نقل کیا گیا ہے اور چند اشعار اس مقام پر بھی درج کیے جاتے ہیں۔

قطعہ

قطبِ عالم نظامِ ملت ودیں — کآفتاب کمال شد رخ او
وز جنید و ز شبلی و معروف — یادگارے ست ذاتِ فرخ او
شیخ ایشاں اگر چنیں بودند — ورنہ بودند ایں چنیں شیخ او

مثنوی

غوثِ عالم نظامِ ملت ودیں — قطبِ ہفت آسمان و ہفت زمیں
رہبر پیش بیں محمدؐ نام — زرہ پے پر پئے محمدؐ گام

☆☆

امیر خسرو کا ہندی کلام

حافظ محمود خاں شیرانی

امیر خسرو ادبی دنیا کے آفتاب عالمتاب ہیں۔ اور خاکِ ہند اب تک ان کے اوصاف کمالات کا انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔ وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم و ناثر ہیں۔ دوسری طرف عربی و سنسکرت میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔ متعدد امور کی ایجاد انہی کی طرف منسوب ہے۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی تدوین کر کے اپنی ایجادوں سے اس کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ جہاں فارسی پر ان کے احسان ہیں۔ وہاں ہندی بھی ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفات نظم و نثر کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے درمیان کہتے ہیں۔ جس قدر فارسی میں ان کا کلام ہے اس سے کہیں زیادہ ہندی بتایا جاتا ہے لیکن امیر نے دیباچہ غرۃ الکمال میں اپنی ہندی نظموں کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے:

> ''جزوے چند نظم ہندوی نیز نثر دوستاں کردے شدہ است۔ ایں جا ہم بہ دیگرے بس کردم و نظر بر نداست کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفے ندارد مگر بضرورت آں جا ضرورت بودہ است آوردہ شد۔''

آخری فقرہ میں اشارہ ہے۔ ان الفاظ و فقرات ہندی کی طرف جو امیر گاہ گاہ اپنے اشعار میں لکھ گئے ہیں۔ لیکن امیر کے ہندی کام کا اب تک پتا نہ چل سکا۔ گزشتہ صدی کے تذکرہ نگاروں نے جو نمونہ کلام دیا ہے۔ میں یہاں نقل کیے دیتا ہوں، از قسم شہر آشوب۔

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے ۔۔۔۔ از دست و زبان چرب او وا ویلے

خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تل است　　　گفتار کہ برو نیست دریں تل تیلے

یہ عین ترجمہ ہے "ان تلوں میں تیل نہیں۔" کا ہندوستان کا قاعدہ ہے کہ گوجریاں دودھ دہی وغیرہ لے کر گلی گلی آواز دیتی پھرتی ہیں۔ "لیوُدہی لیوُدہی" امیر کے عہد میں بھی یہی دستور تھا۔ فرماتے ہیں۔

گجری تو کہ در حسن ولطافت چونہی　　　آں دیگ دہی برسر تو چتر شہی

از ہر دو لبت قند و شکر میریزد　　　ہرگاہ بگوئی کہ "دہی لیہو دہی"

دیگر ۔

زرگر پسرے چوماہ پارا　　　کچھ گھڑیے سنواریئے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست　　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اشعار ذیل بھی صنف شہر آشوب سے تعلق رکھتے ہیں ۔

رفتم بہ تماشا بکنار جوئے　　　دیدم بلب آب زند ہندوئے

گفتم صنما چیست بہائے مویت　　　فریاد برآورد کہ درد رموئے

"دردر موئے" فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جاتا ہے۔ فارسی میں یہ معنی ہیں کہ ایک ایک موتی کا ایک ایک بال ہے۔ ہندی میں یہ مطلب ہے کہ مردار دور ہو۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ شہر آشوب امیر کے نام پر دیا ہے۔

ہندو بچہ ہیں کہ عجیب حسن دھرے بچھے　　　بروقت سخن گفتن مکھ پھور جھرے پچھے

گفتم زلب لعل تو یک بوسہ بگیرم　　　گفتار کہ ارے رام ترک کا ہیں کرے بچھے

اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا قطعات کی شکل میں ذکر ہو۔ شہر آشوب کہلاتی ہیں۔ مولانا محمد امین چڑیا کوٹی جنہوں نے جواہر خسروی میں امیر کا شہر آشوب مرتب کیا ہے فرماتے ہیں۔

"سنسکرت اور ہندی بھاشا میں اس قسم کی نظمیں میری نظر سے گزری ہیں۔ دیتی داگیر دلاس گوپال کوی نے اسی طرز پر نظم کیا ہے۔ جس میں تمام پیشہ وروں کے نام اور ان کے کام نظم میں بیان کئے ہیں۔ غالباً اسی طرز کو امیر خسرو نے فارسی زبان میں لاکر ایک جدت اور

فارسی لٹریچر میں نیا اضافہ کیا ہے۔"

میں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ خاص میں امیر خسرو سنسکرت و بھاشا کے مرہونِ منت معلوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ خواجہ مسعود سعد سلمان سب سے پیشتر فارسی میں ان نظموں کا رواج دیتے ہیں۔ اور "مقطعات شہر آشوب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تمثیلاً خواجہ کے شہر آشوب سے یہاں ایک آدھ نمونہ حوالۂ قلم کر دیا جاتا ہے۔

درحق دلبر خبار گفتہ

آنکہ او بردکاں زبس خوبی ہمچو خورشید بر سپہر آمد
شد فراز تنور چوں دل من یاد و مہ رفت و بادہ مہر آمد

صفت یار بربطی گفتہ

بتا زہرۂ آسمان جمالی چو زہرہ بمن برتو فرخندہ فالی
کُنا تو خالی نباشد زبربط زبربط نباشد یکے زہرہ خالی

ذیل کی نظم بھی امیر کی طرف منسوب ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف درد زوصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سُناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زمہراں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کے داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے درائے لاکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار آپ پار اُتر گئے ہم تو رہے اردار
بھائی رے ملا جو ہم کوں پارا تار ہاتھ کا دیو دنگی مندرا گل کا دیوں ہار

دکھ میں اپنے حال کوں روؤں زار وزار | پی کن وِنتا بہت ہیں ہم ہیں او گنہگار
بابل بھیجی مَیں دنج کوں تانداں کو پھول | ہو چھاونجہ دہا جیا نالا ہا مول
چکوا چکوی دو جنے ان کو مارو نہ کو | اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو
سیج وچھتی دیکھ کے روؤں دن رین | یا کرتی ہیں پہروں پل بھر سکھ نہ چین
سونا ریں سو سکھ سیویں کتاں کوں گل لار | میں دوکھیاری جنم کی دوکھی گئی بہار
تازی چھوٹا دیس میں قصبے پڑی پکار | دروازے دیتے رہ گئے نکس گئے اسوار
گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس | چل خسرو گھر آپنے سانجھ ہوئی چو دیس

(از بیاض مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم ،اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

ذیل کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے، جو تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی ہے۔

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر | ایسا نہیں کوئی عجیب راکھے اسے سمجھائے کر
جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا | حقا الٰہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر
توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے | تجھ دوستی بسیار ہے یک شب ملو تم آئے کر
جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں | تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملو تم آئے کر
میرا جو من تم نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دیا | غم نے مجھ ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر
خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب | قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

(از بیاض پروفیسر سراج الدین آذر ۔ایم اے)

میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے۔ لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔

خالق باری

یہ وہ خوش قسمت کتاب ہے۔ جو بالاتفاق امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اس کے متعلق حسب معمول مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مولوی محمد امین صاحب چریاکوٹی فرماتے ہیں کہ "اس میں اسّی ہزار اشعار تھے۔" مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی" اور اپنے تخیل کی رنگینی سے کام لے کر یہ فقرہ

بھی اضافہ کردیا ہے کہ ”وہ ایک بھٹیاری کے لڑکے کے لئے لکھی گئی تھی۔“ لیکن اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یقین ہے کہ یہ بیانات بے اصل ثابت ہوں۔ یہ بات تو عقل میں آتی ہے کہ بچوں اور مبتدیوں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ بالعموم مختصر اور رسالہ کی شکل میں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً حامد باری، رازق باری، واحد باری، اللہ باری، ایزد باری، صمد باری اور قادر نامہ وغیرہ جو سب کی سب اسی خالق باری کی طرز میں ہیں۔ یہ رسالے اکثر اوقات بچوں کو حفظ کرائے جاتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مختصر ہوں۔

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق باری کو امیر کی طرف منسوب کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں، کلیات خسرو کے سلسلہ میں ایک جلد موسوم بہ جواہر خسروی بھی علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں امیر کے متفرق کلام کے علاوہ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے خالق باری کو نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شامل کردیا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مولانائے ممدوح ذیل کی بعض وجوہ کی بنا پر خالق باری کو امیر کی تسلیم کرتے ہیں۔

”جتیل کا لفظ اس کتاب میں ملتا ہے۔ جو حضرت امیر کے زمانہ تک ایک ہندی سکہ تھا۔ اور آپ کے قریب عہد میں متروک ہو چلا تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں اس عہد کے بعد اس کا نام بھی نہیں ہوتا ہے۔“

میں اس کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ جتیل ہر زمانہ میں ملتا ہے۔ مثلاً آئین اکبری میں جہاں اکبری عہد کے سکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابوالفضل جتیل کو ایک فرضی سکہ اور دام کا پچیسواں حصہ مانتا ہے۔

مہابت خاں عہد عالمگیر کا ایک امیر ہے۔ وہ ایک عرض داشت میں جو سرتاپا شکایت سے مملو ہے لکھتا ہے:

”مدار کار بر قاضی وقاضی برشوت راضی۔ در غزنی وقندھار اشتہار یافتہ کہ مطربان باستقبال فرمان می شتابند و نرخ حسب الحکم موقوف بردو جتیل افتادہ و اسد خاں کہ ہنوز بوئے شیر از دہانش رفتہ وزیر اعظیم و دستور معظم فرودند۔“

آنند بن بھیم راج گوالیری نے فن سیاق میں ایک رسالہ موسوم بخلاصۃ السیاق ۱۱۱۵ھ مطابق ۴۰ جلوس عالمگیری میں تصنیف کیا ہے۔ اس میں جتیل کا لفظ عام طور پر ملتا ہے۔ چونکہ یہ رسالہ چھپا نہیں۔ اس لئے یہاں ایک دو فقرے نقل کر دیئے جاتے ہیں۔

"دستور معلوم کردن وامہا بہ حساب فی من دو باید کہ مبلغ نرخ من را باد امہا صرب نماید وحاصل ضرب را جتیل دانستہ۔ پنجاہ جتیل یک تنکہ بگیرو۔ مثلاً فی من بیست تنگہ۔ قیمت پنج دام می باید۔ پس بیست را با پنج ضرب دادیم حاصل ضرب یک صد جتیل بیامد وازیں دو تنگہ گر قیمت پنج دام معلوم شد۔"

"اگر کسی پرسد فی من دو تنگہ است دو وآثار راچہ باید داد۔ باید کہ آثار یا تنگہائے نرخ من ضرب دہد وحاصل ضرب را جتیل دانستہ بر چہل جتیل مقرر نماید۔ پس یک بہلولی قیمت دو آثار معلوم شد۔"

شیخ جنید کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو

چو درد اندر کمیں باشد کرے جو نیند بنجارا

نباشد سود یک جتیل گوادے مول ہی سارا

جس زمانہ میں جتیل کا سب سے زیادہ چرچا رہا ہے وہ امیر خسرو کے عین بعد ہے سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ) نے اپنے عہد میں جتیل (ایک تنگہ کا پچاسواں حصہ) کی تقسیم جس میں نیم جتیل اور دانگ جتیل شامل ہے کر دی تھی۔ چنانچہ مولانا شمس سراج اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

"سلطان فیروز شاہ فرمان فمود کہ مہر نیم جتیل کہ آنرا گویند ومہر دانگ جتیل کہ آنرا پنکہ گویند وضع کنند تا غرض فقرا ومساکین حاصل شود۔"

جتیل کے لئے ہر عہد کی مثالیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں بخوف طوالف انہی امثال پر قناعت کر کے مولوی صاحب کے دوسیر استدلال کو بیان کرتا ہوں۔

(۲) محاورات قدیم مثلاً "میں تجھ کہیا۔" "تو کت رہیا۔" "باداڑانی (ہوا چلی)" "آکھنا (دیکھنا)۔" "چاؤ (شوق)" وغیرہ ہم الفاظ کی

گواہی سے خالق باری کا زمانہ۔"

تصنیف عہد خسرو میں قطعی طور پر مقرر اور متعین ہو سکتا ہے۔

یہ دلیل بھی مضبوط معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ میں تجھ کہیا۔ تو کت رہیا آج بھی ہندوستان کے دیہات میں بولے جاتے ہیں۔ آکھنا پنجابی زبان میں کہتے اور دریافت کرنے کے معنی میں آج بھی آتا ہے۔ "باد اڑانی" کے معنی خدا جانے مولانا نے "ہوا چلی" کیسے لکھ دیئے۔ کیونکہ مصرع خاک دھول جو باد اڑانی میں باد اڑانی کا تعلق دھول کے ساتھ ہے یعنی ایسی دھول جسے خاک اڑا سکے۔ بہر حال ان میں کوئی بھی ایسا محاورہ نہیں جو محاورات قدیمہ کی فہرست میں شامل کیا جا سکے۔ تیسری وجہ مولانا نے مفصلہ ذیل دی ہے۔

(۳) اس میں شک کرنے کے بہت کم وجوہ ہیں کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے اور یہ شائبہ شک بھی خود خالق باری کے مقطع یعنی آخری شعر کو دیکھ کر بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ جس میں لفظ خسرو موجود ہے اور جس شاعرانہ شوخی و فصاحت کے ساتھ یہ لفظ مقطع میں واقع ہوا ہے اور اس پر درویشانہ انکسار کا طرّہ دیکھ کر نا ممکن ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص اس کو تخلص نہ سمجھے اور صرف ایک لفظ با معنی مثل دیگر الفاظ با معانی کے جن سے خالق باری بھری ہوئی ہے قرار دے۔ وہ شعر یہ ہے۔

مولوی صاحب سرن پناہ گدا بھکاری خسرو شاہ

اس کی ترکیب بالکل وہی ہے۔ جیسے آج کوئی خسرو نام کا شخص اپنے تئیں کسی تحریر میں خاکسار خسرو لکھ کر ختم کلام کر دے۔ مولانا کا یہ استدلال زیادہ تر شاعرانہ رنگ میں ہے۔ اہل اللہ میں سادات نے اپنے نام سے پہلے یا بعد شاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً شاہ نعمت اللہ ۸۳۲ھ۔ شاہ میاں جی ۸۸۹ھ اور سید راجی حامد شاہ ۱۹۰۱ء وغیرہ لیکن امیر خسرو کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ شاہ کا لفظ اپنے تخلص کے آخر میں لا کر سادات کے نام کے ساتھ خواہ مخواہ التباس پیدا کر دیتے۔ اور نہ امیر کے زمانہ میں فقرا کے نام کے ساتھ اس لفظ کا رواج تھا۔ لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ توجہ طلب مصرع اوّل ہے۔ جس میں مولوی صاحب کی ترکیب موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب منشی صاحب، پنڈت صاحب کی سی ترکیبیں امیر خسرو کے عہد میں رائج نہیں تھیں۔ "مولوی صاحب" درکنار تنہا مولوی کا لفظ بھی امیر

کے عہد میں علماء کے ساتھ نہیں ملتا۔ایسے مرکب محض گزشتہ صدی کی مبتدعات سے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس شعر کو جدید اضافہ ماننا پڑے گا۔اور بات بھی یہی ہے کیونکہ اگر چہ یہ شعر مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ملتا ہے۔مگر قلمی نسخوں میں اس کی شکل بالکل مختلف ہے جو حسب ذیل ہے۔

دو جگ رہا خسرو کا نام خالق باری ہوئی تمام

ایک اور نسخہ یوں ہے ۔

دو جگ وچ رہیا خسرو نام خالق باری ہوئی تمام

ان شعروں میں اگر چہ خسرو کا تخلص موجود ہے۔لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ خسرو وہی مشہور امیر خسرو ہیں۔خسرو اور لوگوں کا بھی تخلص ہوسکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم نے خالق باری کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔تاریخ وادب میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔نہ امیر خسرو کی تصنیفات کے ساتھ اس کا شمار ہوتا ہے اور نہ کوئی اسے جانتا ہے۔اور نہ اس کے قدیم نسخے دستیاب ہوتے ہیں جس قدر نسخے ملتے ہے۔بارھویں اور تیرھویں قرن ہجری کے نوشتہ ہیں۔صرف ایک نسخہ ایسا ہے جو گیارھویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔یہ نسخہ برٹش میوزیم کی فہرست کتب فارسیہ میں ''ردیل ٦ اب ۲'' ہے جو طامس ہائڈ متوفی ۱۷۰۳ء مطابق ۱۱۱۴ھ کی ملک تھا۔فہرست نگار کا بیان ہے کہ کسی فرنگی نے سترھویں صدی عیسوی میں نقل کیا ہے،لیکن افسوس ہے کہ اس نسخہ میں مصنف کا نام مذکور نہیں ہے۔انڈیا آفس میں ایک نسخہ ص ۲۴۴۸،۱۱ھ جلوس محمد شاہی مطابق ۲۸ ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ کا کتابت شدہ ہے۔لیکن اسی کتب خانہ میں ایک اور نسخہ ص ۲۴۴۷، ہماری دلچسپی کے کچھ سامان رکھتا ہے۔اس کی تاریخ کتابت معلوم نہیں لیکن اس کا نام ''مطبوع الصبیان'' دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری کا اصلی نام مطبوع الصبیان ہے۔اس نسخہ کے ساتھ نثر کا ایک دیباچہ بھی ہے۔فہرست نگار نے اس کا ایک پارہ نقل کر دیا ہے۔ وھو اھذا

''الحمدللہ......(بداں) اسدک اللہ تعالیٰ فی الدارین کہ چند کلمہ عربی وفارسی ہرایک باترجمہ ہندوی برائے تعلیم صبیان بہ طریق

ریختہ (گفتہ آمد)''

بد قسمتی سے اس نسخہ میں بھی مصنف کا نام مرقوم نہیں۔ اس رسالہ میں چھپن فصلیں ہیں۔ اور ہر فصل میں چار شعر ہیں۔ اس حساب سے اس کے اشعار کی تعداد ۲۲۴ ہوتی ہے۔ کتاب کا آغاز خالق باری سرجن ہار سے ہوتا ہے۔ اب یہ فصلیں یا تو متناسب الفاظ ولغات یا بحور کے لحاظ سے قائم کی گئی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رائج الوقت خالق باری کا شیرازۂ اشعار بہت کچھ درہم برہم کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا دیباچہ اور نام قطعاً بھلا دیئے گئے۔ سب سے دلچسپ دیباچہ کا وہ پارہ ہے۔ جس میں ریختہ کا لفظ موجود ہے ریختہ کے موجود اگرچہ امیر خسرو ہیں۔ لیکن ان کے ہاں وہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ اس دیباچہ میں ریختہ نظم کے معنوں میں آیا ہے۔ اور یہ وہ معنی ہیں۔ جو ولی اور سراج کے ہاں ملتے ہیں۔ ریختہ بمعنی نظم گیارھویں صدی کے آخری میں ملتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کتاب مطبوع الصبیاں معہ دیباچہ اسی قرن میں کسی وقت تصنیف ہوئی ہوگی۔

عالمگیر کے عہد میں اُردو زبان کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اور بچّوں کے لئے یہی زبان ذریعہ تعلیم بن جاتی ہے، اور بارھیوں اور تیرہویں صدی میں خالق باری کے انداز کی درجنوں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً رازق باری، حامد باری، ایزد باری، واحد باری، صمد باری بارکسباری، اللہ باری اور قادر نامہ مرزا غالب وغیرہ۔ جب اس قدر دو صدی کے اندر اندر لکھی گئی ہیں تو ظاہر ہے کہ خالق باری بھی ان کے متصل زمانہ میں لکھی گئی ہوگی۔ یہ امر قرین قیاس نہیں کہ خالق باری ۷۲۵ھ سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد پورے چار سو برس یعنی گیارہویں صدی تک اہلِ قلم خاموش رہیں اور بارھویں اور تیرھویں صدی میں اس کی تقلید میں درجنوں کتابیں لکھی جانی شروع ہوں۔ میرے نزدیک خالق باری اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کا زمانہ ہمیں دیگر تصانیف کے قریب ماننا چاہئے۔

اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو صورتِ حالات بالکل مختلف ہوتی، اس عہد سے لے کر سیکڑوں کتابیں اب تک اس کی تقلید میں لکھی جاتیں، شارح اس کی شرحیں لکھتے۔ اہل لغات اس سے استناد کرتے۔ اور یہ کتاب مختلف فیہ لغات کے لئے ایک سندی ماخذ بن جاتی۔ بہت کم لوگ واقف ہیں۔ جس محنت اور مشکلات کے ماحول میں آٹھویں،

نویں اور دسویں قرن ہجری کے ہندی فرہنگ نگاروں نے اپنی کتب لغات ترتیب دی ہیں۔ وہ ادنیٰ ادنیٰ شرحوں سے لغات جمع کرتے ہیں۔ کتابوں کے حواشی سے الفاظ لیتے ہیں۔ استادوں سے پوچھ رہے ہیں۔ خطوط ورقعات سے استناد کررہے ہیں، وغیرہ۔ اگر امیر خسرو اتنا بڑا مجموعۂ لغات اپنی یادگار چھوڑ جاتے جو کہا جاتا ہے کئی ہزار اشعار اور کئی جلدوں پر شامل تھا، تو کیا یہ فرہنگ نگار جو ایک درجن سے زیادہ ہیں۔ اس سے استفادہ نہ کرتے۔ یہ خیال کرنا کہ محض اتفاقیہ یہ کتاب ان کے ہاتھ لگی۔ بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو داخل نصاب مانا جاتا ہے۔ اس لئے شروع ہی سے ان کی واقفیت اس سے ضروری تھی۔

مولانا محمد امین صاحب نے اس یقین کے اندر کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ شاعرانہ انداز میں دل کھول کر اس کی مدح سرائی کی ہے۔ بلکہ نصاب الصبیاں سے ایک قسم کا مقابلہ کر کے خالق باری کی افضلیت کو تسلیم کرلیا ہے اور غالباً مولانا نے یہ سب کچھ محض عقیدتاً کیا ہے۔ کیونکہ حقیقتاً اگر ان کو مقابلہ منظور ہوتا تو نصاب الصبیاں کے بجائے عبدالواسع کے نصاب یا قادر نامہ مرزا غالب سے مقابلہ کرتے۔ جو ہر حال میں زیادہ موزوں ہوتا۔ امیر کی وقعت ہمارے دل میں بھی اسی قدر ہے جس قدر مولانا کے دل میں ہے۔ لیکن خالق باری کا معاملہ اور بات ہے۔ میں امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس کے نقائص پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لینی چاہئے۔

اس کتاب میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ مضمون الفاظ اور وزن میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں۔ ہندی الفاظ کے صحیح تلفظ کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے مرادفات التزاماً نہیں دیئے۔ کبھی فارسی ہندی دیئے۔ کبھی فارسی عربی پر قناعت کرلی۔ اور کبھی صرف ہندی الفاظ پر۔ پھر بھرتی کے الفاظ اس کثرت سے لائے گئے ہیں کہ الفاظ برائے بیت خالق باری کا وقیع پہلو بن گئے ہیں۔ مثلاً ؎

بادہ شراب دراوق وصہبا می استومد
گرجر عرزاں خوری تو کنی کارنیک وبد

کا آخری مصرع تمام وکمال برائے بیت۔ پھر وہی الفاظ بعض اوقات دوبارہ دوہرادئے ہیں۔ ان کی مثالیں دینا باعث طوالت ہے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ یہ کتاب نوعمر

بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس کی بحروں کا شگفتہ اور سبک ہونا ضروری تھا۔ لیکن اس تصنیف کی اکثر بحریں غیر شگفتہ اور ناہموار ہیں۔ پھر اوزان کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ ایک مصرع بڑھ گیا اور ایک گھٹ گیا۔ کوئی اوچھا اور کوئی لمبا ہو گیا۔ مثلاً ؎

زر بود سونا سیم جتیل نقرہ روپا　　جامہ کپڑ ٹاٹ ٹپڑ ڈبہ کوپا

جو بظاہر بحر رمل مسدس سالم ہے۔ لیکن مصرع اوّل کی ابتدا میں ایک سبب خفیف زائد از وزن لایا گیا ہے۔ اور شعر ؎

عقرب بتازی بچھو کثر دم برج فلک　　بشر توسروش وفرشتہ ملک

میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرع انگڑائی لے رہا ہے۔ اس کے وزن کی اگر تلاش کی جائے تو فارسی والے کہیں گے کہ کوئی ہندی وزن ہوگا۔ اور ہندی والے کہیں گے کہ فارسی وزن ہوگا۔ آنے والے شعر میں۔

توت فرصاد است کہیر ابادرنگ　　چھبنکا اونگ ہندوی ڈھیل ہے رنگ

آونگ کا گاف اور ڈھیل کی لام زائد از وزن ہیں۔

بعض مقامات پر دیکھا جاتا ہے کہ مصنف مختلف موقعوں پر ایک ہی لفظ کے دو مختلف معنی دے جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کے دو شعر۔

عنقا سیمرغ ہست لگ لگ ہے تیترا　　ہم بارکش ریسماں ہے جیبڑا

طاؤس موریاش دوو درّاج تیترا　　خوب ونکو بھلا بدوزشت ہے برا

مصنف کے نزدیک تیتر کی فارسی لگ لگ بھی ہے اور درّاج بھی۔ لیکن خود فارسی میں لگ لگ اور درّاج دو مختلف جانور ہیں۔ درّاج بیشک تیتر ہے۔ لیکن لگ لگ کو اہل لغات یوں بیان کرتے ہیں:

"مرغے است مشہور کہ گردن ومنقار پائے دراز دارد و ماررا شکار کند۔"

حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آں لگ لگ گوید کہ لک الحمد و لک الشکر　　توطعمۂ من کردہ آں مار ژیاں را

اب ایسی غلطی امیر خسرو سے نہایت بعید ہے۔ کسی دوسرے موقع پر خرما کے معنی ایک جگہ کھجور بتاتے ہیں اور دوسری جگہ املی۔ چنانچہ ؎

جان خرما ہندوی انبلی   واں صمغ گوند گلیم اسب کنبلی
ہندوی گویند خرما را کھجور   داکھ را تو فارسی میدان انگور

املی کو اگرچہ خرمائے ہندی کہا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح سے مصنف نے بیان کیا ہے بیحد مغالطہ خیز ہے۔ انگور کا تلفظ جس طرح شعر دوم میں کیا گیا ہے وہ ہمیں پنجاب کی یاد دلاتا ہے۔ انگور کا یہ تلفظ امیر سے بعید ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ شعر آئندہ میں مصنف سے ایک اور لغزش مشاہدہ ہوتی ہے۔

فارسی سیمرغ وعنقا ہست تدرد کبک ہنس
ہچویرقاں است کانور ہے زریر ونسل بنس

اس شعر میں تدرد، کبک اور ہنس تین مختلف پرندوں کو مصنف نے ایک مان لیا ہے۔
کبک کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اسی کو ہم چکور کہتے ہیں ع

کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

مرزا غالب قاطع برہان میں کہتے ہیں۔ "تدرد در فارسی طائرے را گویند کہ بٹیر ہندی آنست" اور فرہنگ نویس کہتے ہیں کہ "مرغے ست صحرائی شبیہ بخروس در نہایت خوش روشنی وخوش رفتاری۔" لیکن ہمارے لئے سب سے اہم یہ امر ہے کہ خود امیر خسرو کبک اور تدرد کو علی الرغم مصنف خالق باری علیحدہ پرندے تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن السعدین میں ہے۔

آنکہ پریدے زپر خود تدرد   ماندہ چو پرگم شدگان زیرسرد
لالہ چواز کوہ برفت از شکوہ   کبک ببریددل از بیخ کوہ

قرآن السعدین میں دونوں شعر اسی ترتیب سے بلا فاصلہ ملتے ہیں جس سے اس احتمال میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ امیر خسرو ایک شخص نہیں ہیں۔ لیکن صاحب خالق باری نے تدارد اور کبک کو ایک جانور تسلیم کیوں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود بعض اہل لغات اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً موید الفضلا میں تدرد کی تشریح میں ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں۔

تدرد بفتحتین، کبک وآں پرندہ ایست آتش خوار وخوش رفتار کہ بکوہہا بود کذا فی الادات الفضلا

رادات الفضلا، قاضی بدر الدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں تالیف کی ہے، اب

ظاہر ہے کہ خالق باری نے اپنی کتاب کی تالیف کے وقت ادات الفضلا مؤید الفضلا ۹۲۵ھ یا کسی اور ایسی کتاب لغات سے امداد لی ہے۔ جس کے ماخذ میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

بیت ذیل بھی قابلِ توجہ ہے ۔

نیا خال ہندوی ماموں جاں   اور عمر کہئے چچا بکھان

''نیا'' کے معتبر معنی دادا یا نانا کے ہیں۔ چنانچہ لغت فرس۔ فرہنگ جہانگیری، رشیدی چراغ ہدایت اور آنندراج میں صرف یہی معنی دیئے ہیں۔ اور فردوسی علی العموم انہی معنوں میں لاتا ہے۔ مثال:-

درو گر زمانست و ماچوں گیا   ہمانش بنیرہ ہمانش نیا

مصنف خالق باری نہایت مشہور اور مستند معنی کو صرف نظر کر کے غیر معروف بلکہ مشتبہ معنی ''ماموں'' دیتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ یعنی ادات الفضلا مؤید الفضلا وغیرہ لغات سے نقل کر رہا ہے۔ چنانچہ مؤید الفضلا میں اس لغت کے لئے لکھا ہے۔ جد و برادر امد رو برادر بزرگ۔'' لیکن یہ یاد رہے کہ آخری دونوں معنی کے لئے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے اور غالباً ایسے معنی ہیں جو ہندوستان میں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں۔

خالق باری جیسی کتاب کی تصنیف کتب لغات کی امداد کے بغیر دشوار ہے لیکن جو لغات مصنف کے پیشِ نظر ہیں۔ ایسی ہیں جو مغلوں کے عہد سے پیشتر ہندوستان میں لکھی گئی ہیں۔ کیونکہ جو لغزشیں ان کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کا عکس خالق باری میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ خالق باری ان کتب لغات کے بعد لکھی گئی ہو۔ مؤید الفضلا ۹۲۵ھ میں کہا جاتا ہے تصنیف ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ خالق باری اس کتاب کی تصنیف کے بعد تالیف ہوئی ہوگی۔

خالق باری کو مؤید سے موخر ماننے کے لئے ایک اور دلیل بھی ہے۔ جو یہ ہے کہ مؤید الفضلا میں بعض اوقات فارسی الفاظ کے ہندوی مرادفات بھی دیئے گئے ہیں جب ان ہندی الفاظ کا خالق باری کے ہندی الفاظ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو مؤید کا تقدم خالق باری پر صریحاً ظاہر ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ مؤید کی زبان خالق باری کی زبان سے

زیادہ قدیم ہے۔ میں یہاں چند الفاظ کی فہرست مقابلہ کی غرض سے ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مؤیدالفضلا	حربا	کہرکت	داس	ہنسوا	چارمغز	اکروت
خالق باری	حربا	گرگٹ	داس	دانتی	جوزخراسان	اخروٹ
مؤیدالفضلا	جوزبوا	جاپھل	بوے	گندہ	خیار	ککہری
خالق باری	جوزبویا	جائے پھل	بوئے	باس	خیار	ککڑی
مؤیدالفضلا	انگوزہ	ہینگ	دبہ	کوپا	خرس	ریچھ
مؤیدالفضلا	خنور	کوتھی	دوغ	چھاچھ	اُسمانہ	چھنہ
خالق باری	کندو	کوٹھیا	دوغ	مہی	سقف	چھت
مویدالفضلا	فازہ	جنوائی				
خالق باری	فازہ	جمائی				

لیکن خالق باری کی زبان کے مقابلہ کے لئے میرے نزدیک سب سے مناسب کتاب نصاب سہ زبان یا صمد باری عبدالواسع ہانسوی ہے۔ عبدالواسع عہد عالمگیر کے ایک بزرگ مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب دستورالعمل معروف بہ رسالہ عبدالواسع نہایت مشہور ہے۔ اوراب بھی درس میں داخل ہے۔ نصاب سہ زبان ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں التزاماً ہر مصرع میں تین تین لفظ عربی، فارسی اور ہندی کے بالترتیب یکے بعد دیگرے دیئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی متناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کردیا ہے۔ مثلاً لغات اعضائے انسان۔ اجناس غلہ، میوہ جات۔ ترکاری بہادگلہا۔ ادویات وغیرہ خاتمہ میں مصادر مشہور وغیر مشہور دیئے ہیں۔ اب خالق باری اور نصاب کی زبان میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے اکثر الفاظ دونوں میں عام ہیں۔ لیکن چونکہ عبدالواسع ہانسی کے متوطن ہیں جہاں ہریانی زبان کی اشاعت ہے۔ غالباً اس اثر میں عبدالواسع بعض ایسے الفاظ (اگرچہ ہندی ہیں) دے جاتے ہیں۔ جن سے موجودہ لوگ واقف نہیں۔ ذیل میں خالق باری اور نصاب کے مابہ الامتیاز الفاظ کی ایک فہرست دی جاتی ہے۔

خالق باری	غازہ	جمائی	تپ	جوڑی	رسوا	نیول

نصاب سہ زبان	غازہ	جبھائی	تپ	جڑ	رسوا	نیولا
خالق باری	دوباہ	لونکڑی	شیر	مینہ	امید	آس
نصاب سہ زبان	روباہ	لونڑی	شیر	باگھ	امید	آسا
خالق باری	نیا	ماموں	مردمک	پوتلی	لب	ہونٹھ
نصاب سہ زبان	نیا	دادا	مردمک	پتری	لب	ادھر
خالق باری	گوش	کان	رخسار	گال	انگشت	اونگلی
نصاب سہ زبان	گوش	سردن	رخسار	کپول	انکست	انگری
خالق باری	پاے	پانو	مادر	ماں	پیشانی	کپار
نصاب سہ زبان	پائے	چرن	مادر	مہتاری	پیشانی	ماتھا
خالق باری	چشم	نین	پہلو	پانسلی		
نصاب سہ زبان	چشم	لوچن	پہلو	پانسلی		

دونوں کتابوں کی زبان پر غور کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خالق باری نصاب سے چنداں مقدم نہیں ہے۔

آخر میں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے کہ موجودہ خالق باری کا متن جس میں علی گڑھ کے نیز بازاری اڈیشن شامل ہیں۔ چنداں قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتا۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے اگرچہ نہایت جانفشانی سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے لیکن بدقسمتی سے انہوں نے زیادہ تر مطبوعہ نسخوں پر اعتبار کیا ہے اور قلمی نسخوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس لئے ان کا نسخہ اگرچہ بازاری نسخوں کے مقابلہ میں بہتر مانا جاسکتا ہے تاہم مستند نہیں ہے کیونکہ بمرور زمانہ مطبوعہ نسخوں میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ اور حک و اصلاح ہوگئی ہے۔ خالق باری کی قدیم ترتیب اور اشعار کی تنظیم بالکل برباد کردی گئی ہے۔ اور رفتہ رفتہ بعض اغلاط بلکہ یوں کہئے مصنوعی لغات اس میں شامل ہوگئے ہیں۔ میں یہاں صرف چند مثالوں پر قناعت کرتا ہوں۔

علی گڑھ اور بازار کے نسخوں میں ایک مصرع۔

"تابہ گزکان است کڑاہی وتوا

آتا ہے۔ جس میں ''گزکان'' نے مثنوی لغت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ گزکان اس صورت میں آنندراج، برہان، نفائس، رشیدی اور جہانگیری میں نہیں ملتا البتہ قازیان۔ قزقان اور گزغان بمعنی ''دیگ بزرگ مسین'' ملتا ہے۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے امیر خسرو فرماتے ہیں۔

ولے باایںہمہ زیں خوان شمسہ بہ ستم
کہ حلوائے رضا پختہ نگردو اندریں گزغان

قلمی نسخوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مصرع بالا میں ''گزغان'' دراصل لکھا تھا۔ اسی طرح مصرع۔ ع

ہندوی کہانڈا کہا دے اُن من (یا آن من) میغ

میں ''اُن من'' یا ''آن من'' ایک حیرت میں ڈالنے والا لغت بن گیا ہے۔ مولوی محمد امین صاحب بھی اس لفظ کی تشریح سے عاجز ہیں۔ اور تجویز کرتے ہیں۔ ''قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ لفظ ''انمڑ'' ہے۔ اس صورت میں وزن عروضی درست ہو جاتا ہے۔'' لیکن اس کے معنی جو مولوی صاحب ''بادل کا گھر آنا'' بیان کرتے ہیں۔ چنداں چسپاں نہیں۔ مگر قلمی نسخوں میں یہ مصرع یوں ہے۔ ع

ہندوی کہانڈا کھادے ابر میغ

اب وہ تمام گنجلک رفع ہو جاتی ہے۔ ایک مصرع

''ہم قرنفل لوگ را کیکر بخواں''

میں کیکر پنجابی لفظ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ تمام نسخوں میں اس کو پنجابی لکھا گیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت خیز یہ امر ہے کہ اہل پنجاب اس لفظ سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ قلمی نسخوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصرع مذکور دراصل یوں ہے۔ ع

''ہم قرنفل لوگ رانیکو بداں''

اس سے ظاہر ہے کہ کیکر محض اتفاقیہ ایک مصنوعی لغت بن گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر لفظ 'نیکو' ترقی معکوس کرتا ہوا کیکر بن گیا ہو۔

☆☆

حضرت امیر خسرو دہلوی

پروفیسر محمد حبیب
شیخ سلیم احمد

ضیاؤالدین برنی اپنی مشہور تصنیف تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں :-

"سلطان علاؤالدین خلجی کے دور میں ایسے بہت سے بے مثال شاعر تھے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے اور نہ آج تک پیدا ہوئے۔ ان سب میں امیر خسرو اپنے خیالات کی جدّت اور شعروں کی کثرت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم ونثر کے اساتذاء صرف کسی ایک صنف سخن میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس امیر خسرو ہر صنف سخن میں کمال رکھتے ہیں۔ ایسا باکمال شاعر جو تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتا ہو، نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ قیامت تک پیدا ہوگا۔ ان کی ذہانت۔ قابلیت اور علم وفضل کے علاوہ وہ ایک صوفی بھی تھے۔ ہر روز روزہ رکھتے تھے۔ اپنا زیادہ تر وقت قرآن خوانی۔ فرض اور نفل نمازیں پڑھنے میں گذارتے تھے۔ وہ حضرت نظام الدین اولیا کے خاص مُرید تھے۔ اپنے مرشد کا اس قدر مخلص اور سچا عقیدت مند میں نے نہیں دیکھا۔ انہیں اپنے مرشد کا پیار بھی بھرپور ملا تھا ان کی زندگی وجدان اور سرور وکیف میں بسر ہوتی تھی۔ موسیقی اور گانے میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ خدا نے ان کو ایک فنکار اور مہذب انسان کی تمام صفات سے نوازا تھا۔ درحقیقت امیر خسرو جیسے عجیب وغریب انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ امیر خسرو اور دوست

ان کے ایک دوسرے صوفی شاعر امیر حسن سے میری گہری دوستی تھی۔ وہ میرے بغیر خوش نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ان کے بغیر مجھے چین نہیں ملتا تھا۔ میری وجہ سے ان دونوں میں بھی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اکثر ایک دوسرے کے گھر بھی جایا کرتے تھے۔'' [۱]

موجودہ دور کا ایک ممتاز محقق برنی کے اس خراج تحسین سے پوری طرح متفق ہے۔ مولانا شبلی العجم میں لکھتے ہیں:۔

''ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات انسان نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی، انوری، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے بادہ ہیں۔

---

[۱] امیر خسرو کی مکمل سوانح حیات لکھنا مقصد نہیں ہے۔ جو قارئین زیادہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں ان کو دوسرے ماخذ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ مولانا شبلی نعمانی نے جو اس دور کی تاریخی علمی و ادبی شخصیت ہیں اپنی کتاب شعر العجم میں (جلد دوئم۔ صفحات ۱۰۷۔ ۱۹۵) امیر خسرو کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ مولانا نے اپنی تاریخی معلومات کے سلسلہ میں ثانوی ماخذ کا جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے، تنقیدی جائزہ نہیں لیا ہے۔ امیر خسرو نے خود اپنی سوانح اپنے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ میں تحریر کی ہے۔ اپنی دوسری تصانیف میں بھی اپنا بار بار ذکر کیا ہے۔ سب سے زیادہ معتبر احوال ہم عصر تاریخی ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مولانا شبلی نے اس تاریخ سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ اس سے کچھ بعد کی تصنیف سیر الاولیا (باب پنجم) میں اس کے مصنف امیر خورد نے خسرو کا مختصر حال لکھا ہے۔ جو انہوں نے اپنے والد سے سنا تھا۔ ان کے والد امیر خسرو سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ عصری تاریخوں کا اگر اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو امیر کی سوانح لکھنے کے لئے اچھا خاصا مواد مل جائے گا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ بعد کے مصنفین نے تلاش و تحقیق کے بغیر ہی بہت سی بے بنیاد کہانیوں کو اپنی کتابوں میں جگہ دیدی ہے۔ منتخب التواریخ (جلد اوّل) میں عبد القادر بدایونی نے جو کچھ پڑھا وہی لکھ دیا۔ تاریخی خلط ملط اور مبالغہ آمیز تعریف کی انتہائی مثال تذکرۃ الشعراء میں امیر خسرو سے متعلق دولت شاہ کا بیان ہے۔ مجموعی اعتبار سے — فرشتہ نے تاریخی ماخذات سے استفادہ کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیا ہے۔

لیکن ان کی حدودِ حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی[۱] سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے ـــ لیکن امیر خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہے ہیں۔ لیکن امیر کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں جا بجا اس قدر بیتیں ہیں۔

"ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرہ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر خسرو کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے۔[۲] کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ فارسی اور ترکی اصل زبان ہے۔[۳] عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے ماہر ہیں۔ چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

---

۱ یہاں جن اصناف سخن کا ذکر ہے ان کے لئے دیکھئے: پروفیسر براؤن کی تاریخ ایران جلد دوئم۔

۲ یہ قطعی ناممکن ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری کا کچھ حصہ آج بھی موجود ہے۔ لیکن یہ بہت زیادہ کبھی نہیں رہا ہے۔ فارسی کا کلام غیر معمولی زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ان کو روٹی ملتی تھی۔ ہندی میں لکھنے کے لئے یہ محرک موجود نہیں تھا بلکہ وہ محض تفریح کے لئے لکھتے تھے۔

۳ یہ بات جزوی طور پر صحیح ہے۔ امیر ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی والدہ ہندوستانی خاتون تھیں۔ اس دور کے سماجی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ متوسط درجہ کے زیادہ تر مسلمانوں کی مادری زبان ہندی اور فارسی تھیں۔ تاہم انفرادی خاندان پر بہت کچھ منحصر تھا۔ جو خاندان نئے نئے ہند میں آ کر آباد ہوئے تھے وہ زیادہ تر فارسی کا ہی استعمال کرتے تھے، جیسے امیر کا خاندان ان کے (بقیہ صفحہ ۲۸۱ پر)

من قدرے بر سر ایں کار شدم

"شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اس وقت کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انہوں نے ایک کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بے کار کیا۔ لیکن ان کی طباعی و ذہانت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک[1] کا خطاب ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کرسکا۔

(بقیہ صفحہ ۲۸۰ کا) کلام کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے کہ فارسی زبان خسرو کے خیال وفکر میں ایک فطری عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ مچھلی جس طرح پانی میں رہتی ہے۔ وہی حیثیت ان کے لئے فارسی کی تھی۔ لیکن ہندوستان میں عرصے سے رہنے والوں اور نومسلموں کے لئے صورت حال مختلف تھی۔ ان کے لئے فارسی سیکھنے کے بہت سے مواقع تھے۔ فارسی دانشور طبقے کی زبان تھی۔ کی زبان تھی۔ بہرحال پھر بھی اسے کوشش کے ساتھ حاصل کیا جاتا تھا۔ خسرو کے دوست برنی اس کی ایک مثال ہے۔ برنی اور خسرو دونوں، فارسی کے ساتھ ہندی کے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن موخر الذکر ایسا ارادہ اور شعور کے ساتھ کرتے ہیں جبکہ تاریخ فیروز شاہی میں پیراگراف کے پیراگراف ہندی سے ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ ترکی، ہند کے دانشوروں میں کبھی مقبول نہیں ہو پائی۔ اگرچہ شاہی خاندان کے خاندان اور زیادہ تر مسلم مہاجرین ترکی النسل تھے۔ ترکی خطابات اور تکنیکی اصطلاحیں اگرچہ بہت بعد تک باقی رہے (خاص طور پر فوج میں) لیکن اس زبان کا چلن زوال پذیر ہی رہا۔ خسر کے کلام سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکی جانتے تھے۔ مگر انہوں نے اس زبان میں کبھی نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زبان میں قارئین کی تعداد محدود تھی۔ ہندو، مسلمان، زیادہ تر آبادی کی زبان ہندی ہی تھی۔

[1] موسیقی میں خسرو کی مہارت تسلیم ہے۔ دولت شاہ نے خسرو کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ جس میں خسرو نے کہا ہے: "میں شاعری کے ساتھ موسیقی میں بھی کمال رکھتا ہوں۔ میں نے شاعری میں تین دیوان لکھے ہیں۔ موسیقی میں بھی میری کتابوں کی تعداد تین ہو گر موسیقی سے متعلق میرے مضامین کو تحریر شکل دی جائے۔ مولانا شبلی نے اورنگ زیب کے عہد کی ایک کتاب "مانک کہل" کے فارسی ترجمہ "راگ درپن" کے حوالہ سے کئی راگ اور راگنیاں نقل کی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امیر خسرو نے ایجاد کی ہیں۔ اسی بعد کی کتاب میں مندرجہ ذیل واقعہ بھی تحریر ہے:- علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں ملک گیر شہرت کا مالک ایک سنگیت کار تھا۔ جس کا نام گوپال تھا۔ اس کے ۱۶ ہزار شاگرد تھے جو اس کی پالکی کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلتے تھے۔ خلجی کے دربار میں اس نے چھ مختلف نشستوں میں راگوں کا مظاہرہ کیا۔ اس دوران خسرو، تخت شاہی کے نیچے چھپا رہا۔ ساتویں نشست پر خسرو باہر آگئے اور گوپال کو چیلنج کیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ گوپال کے تمام راگ خسرو کی ایجاد تھے۔ خسرو نے اتنے شاندار طریقہ سے موسیقی کا مظاہرہ کیا کہ گوپال بھی حیران رہ گیا۔

"ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر وتصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا ملازمت پیشہ تھے۔ اور امیروں[1] وملکوں کے درباروں میں تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی۔ کام جو سپرد تھا۔ وہ شاعری نہ تھی۔ بلکہ اور اشغال تھے۔ ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا۔"

ایسے صاحب علم وفضل انسان کا جس کی تعریف ہم عصر اور بعد کی نسلیں یکساں طور پر کرتی ہیں تعلق ترکی مہاجرین کے ایک باعزت خاندان سے تھا۔ چنگیز خاں کے حملہ کے نتیجہ میں وسط ایشیا کے جو خاندان بھاگ کر ہندوستان آگئے تھے ان بدقسمت لوگوں میں ترکی کا لاچین قبیلہ بھی شامل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کا تعلق صوبہ ماوراالنہر کے ایک قصبہ طلش سے تھا۔ سلطان شمس الدین التمش[2] نے بڑی گرم جوشی سے ان مہاجرین کا استقبال کیا۔ خسرو کے والد سیف الدین لاچین ترکوں کے امیر تھے اور ان کی والدہ بلبن کے ایک وزیر عارض ممالک عماد الملک کی بیٹی تھی۔ خسرو پٹیالی میں ۶۵۲ھ (۱۲۵۴ء[3]) میں پیدا ہوئے اس کے والد نوزائیدہ بچے کو ایک سفید چادر میں لپیٹ کر ایک فقیر کے پاس لے گئے۔ فقیر نے کہا:۔

"امیر لاچین! تم میرے پاس ایسے بچے کو لائے ہو جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے ہوگا۔"[4]

---

[1] دور وسطیٰ میں۔ خان۔ ملک اور امیر سرکاری خطابات ہوتے تھے۔ اور ان سے افسر کا مرتبہ معلوم ہوتا تھا۔ عام طور پر ایک امیر ۱۰۰ سپاہیوں پر تعینات ہوتا تھا۔ ملک ایک ہزار سپاہیوں پر اور خان دس ہزار پر یہ نظام ترکوں سے لیا گیا لیکن عملاً اس پر عمل نہیں ہوا۔ دیوانی اور فوجداری ذمہ داریوں کو ایک ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ چنانچہ فوج میں ایک منصب کا مطلب ہوتا تھا کہ دیوانی اور انتظامی امور میں بھی اس کا وہی منصب ہوتا تھا۔ تاہم امیر کا لفظ بلا لحاظ عہدہ تمام سرکاری افسروں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

[2] دولت شاہ نے بہارستان سخن کے حوالہ سے شعر العجم میں لکھا ہے کہ لاچین قبیلہ محمد تغلق کے دور میں ہندوستان آیا۔ یہ غلط ہے۔ دولت شاہ نے شمس الدین محمد کا نام لکھا ہے۔ جس کا مطلب سلطان التمش ہی ہے۔ [3] میں نے قران السعدین سے یہ تاریخ نکالی ہے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ مثنوی ۶۸۸ھ میں ۳۱ سال کی عمر میں لکھی۔ شعر العجم میں دیا ہوا سنہ ۶۰۵ھ ظاہر ہے ایک غلطی ہے۔

[4] سیر الاولیا میں امیر خورد نے اس واقعہ کو اپنے باپ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

خسرو سات سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔لیکن چونکہ خاندان خوشحال تھا، اس لئے ان کو اچھی تعلیم دلائی گئی۔خسرو کی بعد کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو اپنے دور کے علوم فلسفہ اور سائنس پر دسترس حاصل تھی۔

مگر ان کا اصل میدان شاعری تھا۔انہوں نے لڑکپن سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔اور بیس برس کی عمر ہونے تک شاعری ان کی زندگی کا مستقل پیشہ بن چکی تھی۔ شاعرانہ مزاج کے لوگ عموماً غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔وہ دنیا کے ہنگاموں سے دور ہی رہتے ہیں۔مشرق و مغرب کے عظیم مفکرین اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔لیکن امیر خسرو ان سے مختلف تھے۔وہ محض ایک شاعر نہ تھے۔اگرچہ شاعری ان کے خون میں شامل تھی لیکن وہ تیز دنیادار انسان بھی تھے۔وہ قلم کے بادشاہ تھے۔لیکن تلوار کے بھی دھنی تھے۔وہ زندگی کے گذرتے ہوئے ہر لمحہ سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔اور اسی وجہ سے وہ اُن بدنصیب شاعروں کی شکست خوردگی سے محفوظ رہے۔دنیوی ناکامیاں جن کا مقدر ہوتی ہیں۔دلّی کو دارالسلطنت بنے تقریباً ۷۵ برس گذر چکے تھے اور اب اس کی شان و شوکت اور عظمت و بلندی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ وہ بغداد ثانی کہلانے لگا تھا۔منگولوں کی تباہ کاریوں نے وسط ایشیا کے بے شمار شاعروں۔امیروں، علماء، دانشور اور سیاستدانوں کو اس ملک میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔اس ملک نے بھی میزبانی کے فرائض اچھی طرح انجام دیئے۔ہندوستانی سوسائٹی کے بھی ہر قسم کے عناصر دلّی میں جمع ہو گئے تھے۔ان میں نجومی، شاعر، ٹھگ، بھانڈ، خونی، معمار، موسیقار بھی شامل تھے۔دلّی فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ چالاک اور مکار لوگوں کا گھر بن گیا تھا۔ہر قسم کے چالاک اور ذہین لوگوں کے لئے یہاں ترقی کے مواقع تھے۔ یہاں کی مضافاتی بستیوں میں سارے ہندوستان سے طوائفیں۔ان کے دلّے، جواری، قمار باز آ کر آباد ہو گئے تھے۔اور اپنا ناجائز کاروبار کرتے تھے۔ان کے توڑ کے لئے گویا خدا نے بے شمار نیک انسانوں کو بھی یہاں بھیج دیا تھا۔ان غلط کردار لوگوں کے ساتھ ساتھ بہت سے عالم، صوفی، فقیر اور اللہ والے لوگ بھی دلّی میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ان ہی نیک لوگوں کی جدوجہد سے شاید دلّی دوزخ کے غار میں گرنے سے محفوظ رہی۔

اندھیروں اور اجالوں کا یہ شہر امیر خسرو کی خداداد صلاحیتوں کے لئے ایک فطری

پس منظر پیش کرتا تھا۔ سیکھنے کے لئے یہاں بہت کچھ تھا اور وہ سیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دلّی کو ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ وہ ایک طرف علماء و دانشوروں کی محفل کے شریک تھے۔ دوسری طرف صوفیوں و فقیروں روح پرور مذاکروں کے شاہد۔ اور وہ رقص و سرور کی نشاط انگیز مجلسوں[۱] سے بھی بے گانہ نہیں تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ان کے سینہ میں انسانی جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

شیخ سعدی شیرازی نے کہا تھا۔ "میں نے ہر درخت کا پھل چکھا ہے" — اور خسرو کو اس بات پر فخر تھا کہ اس نے "شراب شیراز" کو اپنے ساغر[۲] میں انڈیل لیا تھا امیر خسرو نے اپنے پیش رَو کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے زندگی کا ہر رنگ میں مشاہدہ و تجربہ کیا تھا۔ شاہی محل سے لے کر غریبوں کی جھونپڑی تک اور خانقاہ سے لے کر طوائف کے کوٹھے تک انہوں نے زندگی کا ہر جلوہ دیکھا تھا۔ امیر خسرو کی بیشتر تصانیف مصنوعی اور روایتی ہیں۔ لیکن ایسا اس عہد کا تقاضا تھا۔ مصنف کی زندگی کے حقائق سے لاعلمی نہ تھی۔

تاہم زندہ رہنے کے لئے تو کچھ کرنا تھا۔ آزاد خیالی و آزادہ روی اس دور کے ترکی امیرزادوں کی ایک خوبی تھی۔ انہیں کل کی فکر نہ تھی۔ امیر خسرو ان امیرزادوں سے کہیں زیادہ فراخ دل اور آزاد خیال انسان تھے۔ آئینہ سکندری میں وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں۔

> "جو کچھ خدا تمہیں دے۔ اس میں غریبوں اور ضرورت مندوں کو شریک کرو۔ دل سے خودغرضی کا رنگ اتار کر پھینک دو۔ پیشانی سے غصہ کی لکیریں مٹا دو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے خندہ پیشانی سے دوسروں میں تقسیم کر دو کیونکہ خدا تمہیں اس کا دُگنا دے گا۔ اپنے تحفوں کو دوسروں میں بانٹ دو۔ اور ان کو اپنا بنا لو۔ اس شیر کی طرح بنو جو اپنے مارے ہوئے شکار سے جنگل کے تمام جانوروں کی ضیافت

---

۱ اعجاز خسروی۔ جلد پنجم

۲ خسروی سرمست اندر معنی برخت
شرک از خم خانۂ مسی کہ در شیراز بود

کرتا ہے۔ وہ بلّی نہیں جو روٹی کا ایک ٹکڑا لے کر کونے میں چھپ کر کھاتی ہے۔ غیروں و اجنبیوں میں اپنی جود و سخا دکھلاؤ۔ کیونکہ اپنے بیوی بچّوں کے لئے تو ہر احمق گدھا بھی سخی ہوتا ہے۔ وہ انسان جس کی مہربانی و سخاوت صرف اپنے خاندان تک محدود ہے۔ حقیقتاً خود غرض انسان ہے۔"

ان خیالات کے حامل انسان کے لئے محدود دائرہ تکلیف و اذیت کا باعث تھا اور امیر خسرو کا غریب رہنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بیشتر ذہین و ذکی انسانوں کی طرح خسرو کو بھی دولتمند بننے کے سست رفتار اور مسلسل محنت و جانفشانی کے طریقہ سے نفرت تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دَور کا وہی پیشہ اپنے لئے منتخب کیا جس میں کم سے کم محنت اور زیادہ سے فائدہ تھا۔ اور جو انہیں اپنی زندگی کے اصل مشن سے بھی دور نہیں لے جاتا تھا۔ یعنی وہ ایک درباری بن گئے۔ عہد وسطیٰ میں سلاطین و امراء، شعراء کی اسی طرح سرپرستی کرتے تھے جیسے آج کے لیڈر پریس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ شاعر کے قصیدے اس کے مربی کے لئے رائے ہموار کرنے کا کام کرتے تھے اور اس طرح گھر گھر اس کا نام ہوتا تھا۔ اگر شاعر اچھا ہے تو شاعر اور اس کے قصیدے کے ساتھ بادشاہ کو بھی دوام حاصل ہو جاتا تھا۔ امیر خسرو اس منصب کے لئے نہایت موزوں انسان تھے۔ وہ قصیدہ اور غزل اسی رفتار سے لکھتے تھے جس رفتار سے آج کا اخبار نویس اپنے اداریے لکھتا ہے۔ وہ ہر ماحول اور ہر مجلس کے مطابق اپنے کو ڈھال لیتے تھے۔ وہ خوبصورت و وجیح انسان تھے۔ دلکش و دلچسپ گفتگو کرنی جانتے تھے۔ طباع اور ذہین تھے۔ اس زمانہ کی ہنگامی سیاست کے دور میں بلاشبہ یہ راستہ خطرات سے بھرا تھا۔ لیکن خسرو ایک محتاط انسان تھے۔ آگے بڑھنے کی تمنّا کے باوجود انہوں نے اپنے کو خطرات سے بچائے رکھا۔ اس زمانہ میں بغیر سیاستداں بنے درباری بننا مشکل کام تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے مربیوں کی سیاست میں کبھی دخل نہیں دیا۔ انہوں نے دربارداری کو خالص کاروباری اور اچھی مصاحبت کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ انہوں نے بادشاہوں کی تعریف کی کیونکہ اس سے ان کو روپیہ ملتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ چاہتے تھے۔ تقریباً نصف صدی میں کتنے ہی طوفان ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے

لیکن وہ برابر سلاطین قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ ان کا طریقہ تھا جیسے ہی طوفان گذر گیا انہوں نے اسے فراموش کر دیا۔ مطلع اقتدار پر نیا سورج چمکا۔ اور وہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ نئے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سورج مدح سرائی شروع کر دی۔ اس دنیا میں کوئی بھی انسان مکمل طور پر خوش نہیں رہ سکتا۔ لیکن امیر خسرو کے کیریئر پر بڑے سے بڑا خوش نصیب انسان بھی رشک کر سکتا ہے۔

خسرو کا سب سے پہلا مربی علاؤالدین محمد کشلی خاں تھا جس کو عام طور سے ملک چھجو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[1] ۱۲۷۰ء میں خسرو نے اس کی ملازمت اختیار کی۔ وہ غیاث الدین بلبن کا بھتیجا اور امیر کے منصب پر فائز تھا۔ برنی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:۔ ''میں نے معتبر حضرات اور خاص طور پر امیر خسرو سے سنا ہے کچھ دو سخا۔ نشانہ بازی اور چوگان میں ملک کشلی خاں کا ثانی کوئی دوسرا نہیں تھا۔'' ملک چھجو نے دراصل کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اگر چہ یہ شہرت عارضی ثابت ہوئی۔ مشہور منگول ہلاکو خاں نے اس کو ایک تلوار بھیجی تھی اور یہ پیش کش کی تھی کہ اگر وہ اس کے یہاں آ جائے تو وہ اسے نصف عراق کی گورنری دیدے گا۔[2]

سلطان بلبن جو ذرا کفایت شعار اور سنجیدہ انسان تھا۔ اپنے بھتیجے کی اس دریا دلی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی شہرت کچھ شاعروں کی وجہ سے بھی تھی جب وہ کرا (الہ آباد) کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے ایک شاعر خواجہ شمس معین کے ایک قصیدہ لکھنے پر اسے اپنے اصطبل کے تمام گھوڑے دیدیے تھے۔ اور دس ہزار تنکے موسیقاروں میں تقسیم کر دیے تھے۔ بقول برنی کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ چھجو کو سخاوت کا اس قدر شدید دورہ پڑا کہ اس نے اپنی تمام املاک اپنے مداحوں میں تقسیم کر دی اور اس کے پاس سوائے تن کے کپڑوں کے کچھ بھی نہیں بچا۔ دوسروں کی طرح خسرو نے بھی اس کی سخاوت اور فراخدلی

---

[1] مولانا شبلی نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ ملک چھجو اور کشلی خاں اصل میں دونوں ایک ہی شخص کے نام تھے۔ جس نے برنی کو پڑھا ہے وہ اس بات سے واقف ہے۔ چھجو اس کی عرفیت تھی جبکہ کشلی خاں کا خطاب اسے بلبن نے اس کے باپ کی موت کے بعد عطا کیا تھا۔

[2] تاریخ فرشتہ۔ صفحات ۱۱۳۔ ۱۱۴۔

سے فائدہ اٹھایا۔ملک چھجو کی تعریف میں امیر خسرو کا مشہور قصیدہ مبالغہ آمیز تعریف کی روائتی مشرقی مثال کو پیش کرتا ہے۔

"بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح
ہمدمی با باد عنبر بونمود
صب را گفتم کہ خورشیدت کجا است
آسماں روئے ملک چھجو نمود

دو سال ملک چھجو کے ساتھ کام کرنے کے بعد ایک چھوٹے سے واقعہ کی وجہ سے دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور خسرو کو اس کی نوکری چھوڑنی پڑی۔ایک دفعہ ملک چھجو کی ایک مجلس میں بلبن کا دوسرا بیٹا بغرا خاں موجود تھا۔خسرو کے کلام سے متاثر ہو کر بغرا خاں نے ان کو ایک تھال تنکوں کا پیش کیا جسے خسرو نے قبول کرلیا۔اس پر ملک چھجو ناراض ہو گیا۔خسرو نے بہت بار کوشش کی بھی کہ ملک سے تعلقات بہتر ہو جائیں مگر بے سود۔آخر کار خسرو نے بغرا خاں کی ملازمت اختیار کر لی جو اس وقت سامانہ کا گورنر تھا۔وہ اپنے نئے آقا کے ساتھ بھی زیادہ عرصے نہیں رہے۔

جب لکھنوتی کے گورنر طغرل نے بغاوت کر دی تو سلطان نے اس کے خلاف فوج کشی کی۔اس مہمل میں بغرا خاں بھی ساتھ تھا جو اپنے ہمراہ امیر خسرو کو بھی لے گیا تھا۔بغاوت کو کچل دیا گیا۔بلبن نے تادیبی مہم جاری رکھی۔سرکشوں کو سخت سزائیں دی گئیں جن کی وجہ سے پوری سلطنت میں اس کا رعب بیٹھ گیا۔بلبن نے بغرا خاں کو لکھنوتی کا گورنر مقرر کیا۔بلبن کی واپسی کے بعد خسرو نے کسی طرح کچھ دن اس مشرقی صوبہ میں گذارے لیکن ان کو وہاں کا ماحول پسند نہیں تھا۔وہ اپنے مربی کی اجازت لے کر دہلی واپس آ گئے۔یہاں ان کی ملاقات سلطان کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ محمد (جو عام طور پر خان شہید کے نام سے مشہور ہے) سے ہوئی۔یہ شہزادہ خسرو کے مربیوں میں سب سے زیادہ مہذب اور فراخ دل تھا۔اس زمانہ کے معیار سے اگر پرکھا جائے تو محمد ایک مثالی شہزادہ تھا۔وہ مہذب، جری اور بہادر انسان تھا۔وہ کبھی بدکلامی سے پیش نہ آتا تھا۔شراب بھی بہت کم پیتا تھا۔علماء، امرا یا صوفیاء کے کسی جلسہ یا مجلس کی صدارت اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔بغیر کسی تکان یا

سرپرستی کرتا تھا۔ اس کے پاس فارسی اشعار کی ایک بیاض تھی [۱] جس میں اس نے تیس ہزار پسندیدہ اشعار جمع کیے ہوئے تھے۔ ممتاز محققین نے ان اشعار اوران کے جمع کرنے والے کے ذوق کی بڑی تعریف کی تھی۔

سلطان اپنے اس بیٹے کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس نے اس کو سب سے مشکل اور خطرناک کام سپرد کیا۔ یعنی سرحدوں کی حفاظت کا کام۔ نصف صدی سے مغربی سرحدوں پر منگول منڈلا رہے تھے۔ ان کے نام ہی سے ہندوستان کے دیہاتوں۔ قصبوں اور شہروں میں خوف وہراس کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ یہ لوگ ٹڈی دَل کی طرح آتے تھے اور سبزہ زاروں کو صحرا میں بدل دیتے تھے۔ دلّی پر ان کا قبضہ ہونا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ اور ہروقت اس کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ کیونکہ ان کے مقابلہ کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ شیر خاں نے جو بلبن کا ماموں زاد بھائی تھا اور ایک مضبوط انسان تھا پنجاب کی حفاظت کی اور اس طرح سلطنت کو مضبوط بنایا لیکن بلبن اس سے حسد کرتا تھا اور اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں اس نے شیر خاں کو زہر دلوا کر مروا ڈالا تھا۔ اور اس طرح مغربی سرحد کی حفاظت کے لئے کوئی موجود نہیں رہا۔ شہزادہ محمد کے حصّہ میں اپنے ماموں کا ادھورا کام آیا۔ سبھی لوگوں نے اس کے حوصلے کی تعریف کی۔ ملتان میں اس کا دربار بھی فارسی داں دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ’’شہزادہ محمد کی مجلس میں بڑے بڑے علماء اور فنکار شامل ہوتے تھے۔ اس کے درباری شاہ نامہ خاقانی اور سنائی کے دیوان اور نظامی کا خمسہ پڑھتے تھے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں پر شہزادہ کے سامنے بحث ہوتی تھی۔‘‘ جب یہ شہزادہ ۶۷۹ھ (۱۲۸۰ء) میں پنجاب اور سندھ کا محصول لے کر دلّی آیا تو اس کی ملاقات امیر خسرو سے ہوئی۔ وہ ان کو اپنے ہمراہ ملتان لے گیا۔ پانچ سال تک امیر حسن اور امیر خسرو اس کے دربار میں رہے۔ اس نے دونوں شاعروں کی خوبیوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اور وہ ان کا معترف تھا۔ دوسرے درباریوں کے مقابلہ میں ان کی زیادہ عزت کرتا تھا۔ ان کو زیادہ تنخواہیں دیتا تھا اور بہتر خلعتیں ان کو پیش کی جاتی تھیں۔ شہزادہ نے امیر خسرو سے بھی ایک بڑے شاعر کو اپنے دربار میں بلانے کی کوشش

---

[۱] یہ بیاض ایک عجیب وغریب مخطوطے کی حیثیت رکھتی تھی۔ شہزادہ کی موت کے بعد سلطان بلبن نے اسے اپنے دوات دار امیر علی کو دے دیا تھا۔ وہاں سے یہ امیر خسرو کے پاس آئی۔‘‘ شعر العجم

کی۔ دو مرتبہ اس نے شیخ سعدی شیرازی کے پاس اپنے قاصد بھیجے اور پیش کش کی کہ وہ نہ صرف سفر کے اخراجات ادا کرے گا بلکہ ملتان میں شیخ کے لئے ایک خانقاہ بھی بنوا دے گا۔ اپنی پیرانہ سالی کے باعث شیخ نے آنے سے معذرت چاہی تاہم اس نے شہزادہ کو اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی چند غزلیں بھیجیں[۱]

لیکن اچانک آسمان سے ایک بلا نازل ہوئی۔ جیسے زمین حشر کے میدان میں بدل گئی دوست گلاب کے پھول کی پتیوں کی طرح ہوا میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اور پورا باغ ویران ہو گیا[۲] شہزادہ محمد منگولوں کے حملہ میں مارا گیا۔ گویا خدا نے بلبن سے شیر خاں کے قتل کا انتقام لیا۔ صفر ۶۸۴ھ (مارچ ۱۲۸۵ء) میں ایک منگول سپہ سالار اتمار نے تیس ہزار فوجیوں کے ساتھ پنجاب پر حملہ کیا۔ سلطان محمد نے ان کے خلاف چڑھائی کی۔ لیکن اسے جو اطلاع بھیجی گئی اس میں غلطی سے اس نے منگولوں کی تعداد کو تیس کی بجائے تین ہزار پڑھا اور جب وہ لاہور کے قریب دشمن کے بالمقابل آیا تو اسے معلوم ہوا کہ جو فوج وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا وہ ناکافی تھی۔ اس نے دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر ایک گاؤں میں قلعہ بندی کی۔ اور کمک کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن منگولوں نے ایک دوپہر کو دریا عبور کر کے اچانک دھاوا بول دیا۔ شہزادہ لڑنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن باوجود حوصلہ اور ہمت کے شام ہوتے ہوتے شہزادہ جنگ میں ہار گیا اور خود بھی ایک تیر سے بڑی طرح زخمی ہو کر مارا گیا۔ دلی اور ملتان غم میں ڈوب گئے۔ بوڑھے سلطان کی کمر ٹوٹ گئی۔ پورے دن وہ دربار میں بیٹھا سلطنت کے انتظا کو دیکھتا تھا اور رات ہوتے ہی آہ و زاری کرتا۔ ہر شخص دیکھ رہا تھا کہ اب سلطان اس صدمہ سے جاں بر نہ ہو سکے گا۔

امیر خسرو محض ایک درباری ہی نہیں تھے بلکہ فوج کے ایک افسر بھی تھے۔ وہ اس لڑائی میں اپنے آقا کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "مسلم شہیدوں کے خون سے صحرا لالہ زار بن گیا تھا۔ مسلم قیدیوں کی گردنوں کو اس طرح ایک رسّی میں باندھا گیا تھا جیسے ایک

---

[۱] بدایونی کا بیان ہے کہ شیخ سعدی نے امیر خسرو کے نام کی سفارش کی تھی اور خسرو کی بہت زیادہ تعریف کی تھی۔ یہ بیان غلط یا صحیح برنی کے یہاں نہیں ملتا ہے۔

[۲] امیر خسرو:۔ مرثیہ

لڑی میں بہت پھول پرو دیئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ مجھے بھی قیدی بنالیا گیا۔ اس خیال سے کہ وہ مجھے بھی قتل کر ڈالیں گے۔ میرے جسم کا خون خشک ہو گیا۔ میں پانی کی طرح اِدھر اُدھر بہتا پھرتا تھا۔ میرے پاؤں چھالوں سے زخمی ہو گئے تھے۔ شدّت پیاس سے میری زبان اور میرا حلق خشک ہو گئے تھے۔ اور بھوک نے میرا بُرا حال بنا دیا تھا۔ انہوں نے میرے کپڑے اُتار لئے اور مجھے ننگا کر دیا۔ اور میری وہ حالت تھی جیسے سردی میں بغیر پتیوں کا درخت۔ یا جیسے ایک پھول ہو جس کو کانٹوں سے چھیلا گیا ہو۔ میرا نگراں منگول افسر ایک گھوڑے پر سوار تھا جیسے کوئی شیر کسی پہاڑ کی سواری کر رہا ہو۔ اس کے منہ اور بغلوں سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر سنبل کے پھول کی طرح چند بال اُگے تھے۔ جیسے بغلوں کے بال ٹھوڑی پر اُگ آئے ہوں۔ اگر تھک کر میں پیچھے رہ جاتا تو یہ افسر مجھے کوڑے یا بھالے سے دھکا کر آگے بڑھنے کا حکم دیتا۔ میں آہیں بھرتا اور یہ سوچتا کہ اب اس صورتِ حال سے نجات ملنا ناممکن ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس سے پہلے ایک ندی کے کنارے پہنچ کر (غالباً یہ ندی راوی ہوگی) اس منگول افسر اور اس کے گھوڑے پانی پر ٹوٹ پڑے۔ خوب پانی پیا اور مر گئے۔ خسرو پہلے ہی محتاط تھے تھوڑا سا پانی پیا اور راہ فرار اختیار کی[1]

جب وہ دہلی آئے اپنی والدہ کو سخت پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ اس حالت کا ذکر انہوں نے شہزادہ کی موت سے متعلق اپنے مرثیہ میں کیا ہے۔ ایک ایسے عینی شاہد کے درد و غم سے بھرپور بیان نے جو خود بھی اپنے مہربان آقا کے غم میں بے حال ہو اس مرثیہ کو مقبول عام بنا دیا۔ ایک ماہ تک ہر گھر۔ دربار اور لشکر میں اس کے اشعار پڑھے جاتے رہے۔ درحقیقت یہ مرثیہ فن کے ایک شہ پارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

خوف و دہشت جو ملک بھر میں پھیل گئی تھی۔ جس بے مثال خود اعتمادی کے ساتھ

---

[1] مولانا شبلی کا کہنا ہے کہ خسرو کو قیدی بنا کر بلخ لے جایا گیا۔ یہ غلط ہے۔ ان کی گرفتاری اور رہائی صرف ایک دن کا واقعہ ہے۔ جنگ دوپہر میں شروع ہوئی اور شام تک ختم ہوگئی۔ اپریل کی سخت گرمی کا موسم تھا۔ اور خسرو نے جس شدت پیاس کا ذکر کیا ہے وہ ممکن ہے دریائے راوی کے کنارے پہنچتے پہنچتے کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور تاریکی کی وجہ سے خسرو کے بھاگنے میں آسانی ہوگئی۔ چونکہ خسرو خود ایک فوجی افسر تھے اس لئے ان کے ساتھ عام سپاہیوں سے مختلف سلوک روا رکھا گیا تا کہ بعد میں تاوان مل سکے۔ (مصنف)

شہزادہ نے ملتان سے فوج کشی کی۔ منگولوں کا اچانک حملہ۔ شہزادہ کی فوجوں کی شدید گرمی میں جنگ جیتنے کی آخری کوشش شکست خوردہ فوج کا فرار — ان سب کو شاعر نے بے مثال نغمگی کے ساتھ شاعری میں قلم بند کر دیا ہے۔ ایسی نغمگی جس میں بے پناہ سوز و غم بھی چھپا ہے۔ اب تک خسرو کی شاعری کا چرچا صرف تعلیم یافتہ حضرت تک محدود تھا۔ اس مرثیہ نے ان کے نام کو عوام تک پہنچا دیا[۱]

اس سانحہ کے بعد کچھ دن خسرو اپنی والدہ کے ساتھ پٹیالی میں رہے۔ دلّی کی سیاست کا برا حال تھا۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا معزالدین کیقباد تخت نشین ہوا۔ وہ اٹھارہ سال کا نوجوان لڑکا تھا۔ جو عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ انتظام حکومت اپنے وزیر نظام الدین کے حوالے کر دیا۔ نظام الدین ایک حریص سیاستداں تھا جس کے بارے میں خود اس کے چچا دلّی کے کوتوال فخرالدین کی رائے تھی کہ "وہ گیدڑ کی طرف ایک پتھر پھینکنے یا پنساری کو پیاز کے چھلکے سے پیٹنے کی بھی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ چاروں طرف بدنظمی و انتشار تھا۔ اور اہلِ بصیرت حضرات ایک انقلاب کے آثار صاف طور پر دیکھ رہے تھے۔ سلطان کے گرد جو سیاستداں جمع ہو گئے تھے وہ شہید شہزادہ محمد سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ اس کے بیٹے کے خسرو کو انہوں نے قتل کر دیا تھا۔ نظام الدین کی موجودگی میں خسرو کے لئے شاہی دربار میں رسائی ناممکن تھی۔ چنانچہ خسرو کو ایک صوبائی دربار میں ملازمت اختیار کرنی پڑی[۲]۔ امیر علی سر جاندار[۳] جو عام طور پر حاتم خاں کے نام سے مشہور تھا۔ امراء کے طبقہ میں سب سے پرانا امیر

---

۱ امیر خسرو کی اس مرثیہ کو بدایونی نے غرۃ الکمال میں نقل کیا ہے۔ اس نے ایک نثری مرثیہ امیر حسن کا بھی نقل کیا ہے۔

۲ برنی نے لکھا ہے کہ شہزادہ محمد اور فخرالدین میں ایک عورت پر جھگڑا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فخرالدین نے محمد کے بیٹے کیخسرو کو تخت نشین کرنے سے متعلق بلبن کی وصیت کو نظر انداز کر کے کیقباد کو بادشاہ بنا دیا۔ اگر چہ خسرو کے لئے سزا کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن پٹیالی میں ان کا قیام اور بعد میں اودھ چلے جانا غالباً اسی وجہ سے تھا کہ نظام الدین، خسرو کو پسند نہیں کرتا تھا۔

۳ سر جاندار کا مطلب شاہی حفاظتی دستہ کا سپہ سالا۔ شعر العجب میں اس کو "خان جہاں" لکھا ہے اور اسی خطاب سے خسرو نے قران السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے۔

تھا۔اس کی سرپرستی میں خسروکو آنے والے خطرات سے پناہ مل گئی تھی۔اس نے اپنے کیریئر کا آغاز بلبن کے ایک سپاہی کی حیثیت سے کیا تھا اور جلد ہی وہ سلطنت کا سب سے اہم فرد بن گیا۔وہ اپنی فراخدلی اور سخاوت کے لئے مشہور تھا۔ ''دردر بھیک مانگنے والے فقیروں کو بھی وہ سونے اور چاندی کے تنکے دیدیتا تھا۔بخیل کا وہ نام تک نہیں لیتا تھا[1]'' دوسرے شاعروں کی طرح خسرو نے بھی اس کی دریادلی کے گن گائے ہیں۔

''میں نے سمندر سے کہا:۔'تو خان کی طرح سخی ہے'

'اوہ!نہیں۔ہرگز نہیں' روحِ سمندر نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''میری گندی لہروں سے صرف بے کار کوڑا کرکٹ ہی باہر آتا ہے۔

جبکہ وہ اپنی قابلِ فخر سخاوت سے لعل و موتی بکھیرتا ہے[2]''

حاتم خاں جب اودھ کا گورنر مقرر ہوا تو خسرو نے اس کی نوکری کرلی۔مگر وہاں انہیں ابھی دو سال ہوئے تھے کہ دلّی کی یاد آنے لگی۔حاتم خاں نے بخوشی انہیں دلّی جانے کی اجازت دے دی۔سفر خرچ کے لئے دو طشتری سونا دیا۔امیر خسرو کو دہلی آئے ہوئے ابھی صرف دو ہی دن ہوئے تھے کہ سلطان کیقباد نے بلا بھیجا۔خسرو نے زمین کو بوسہ دیا اور سلطان کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔سلطان نے ان کو دو تھیلی اشرفیوں کی اور ایک پٹکا دیا۔اس نے خسرو کو اپنی اور اپنے باپ بغرا خاں کی ملاقات کا حال لکھنے کا کم دیا خسرو کو خصوصی درباریوں میں شامل کرلیا گیا۔اس نے اپنی پہلی مثنوی قران السعدین لکھنی شروع کی جو چھ ماہ کی محنت کے بعد شوال ۶۸۸ھ (اکتوبر ۱۲۸۹ء) میں پوری ہوئی۔

خسرو مثنوی لکھنے میں مصروف تھے اور سلطان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔وہ اپنی بری عادتوں پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں ہی وہ امراضِ خبیثہ کا شکار ہوکر بستر پر دراز ہوگیا تھا۔اس کی موت کے ساتھ ہی اس ترک نوکرشاہی کا بھی خاتمہ ہوگیا،محمد غوری کے زمانہ سے اقتدار جس کے ہاتھوں میں تھا۔ترکی امراء میں خسرو کے بہت سے دوست تھے۔لیکن ان کے زوال کو امیر نے بڑی لاتعلقی کے ساتھ دیکھا ہوا کے رُخ

---

[1] برنی کے مطابق حاتم خاں کی تعریف میں خسرو نے ایک نظم اسپ نامہ کے نام سے لکھی۔

[2] قران السعدین۔صفحہ ۲۲۱۔۲۳۰

کے ساتھ چلنا ہی ان کی زندگی کا اصول تھا۔

جلال الدین خلجی نیا سلطان بنا۔ وہ امیر خسرو کا مداح تھا۔ کئی سال پہلے جلال الدین، امیر خسرو کو ان کے والد امیر لاچین کا منصب عطا کر چکا تھا۔ جس کے تحت خسرو کو بارہ سو تنکے سالانہ ملتے تھے۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد سلطان نے انہیں بڑے سے بڑا منصب عطا کیا۔ "وہ مصحف دار اور ندیم[1] بنا دیئے گئے۔ سلطان نے ان کو دہی خلعت اور سفید رنگ کا کمر پر باندھنے کا پٹکا دیا جو سب سے بڑے ملک کو دیئے جاتے تھے۔" جلال الدین اگرچہ ستر سال کا بوڑھا ہو چکا تھا لیکن متمدن زندگی کے حسن و جمال اور دلکشیوں کو پیار کرتا تھا۔

اس کی شاعری اگرچہ زیادہ بلند پایہ نہ تھی۔ لیکن اس کی تخلیقی صلاحیت کے مقابلے میں تنقیدی نظر زیادہ تھی[2]۔ اس نے اپنے دربار میں ایسے موسیقاروں۔ گلوکاروں اور رقاصاؤں کو جمع کر لیا تھا جن کا ملک بھر میں ثانی نہیں تھا۔ اور اس کی سرور و نشاط کی محفلیں ایسی ہوتی تھیں جن کا صرف خواب ہی میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ساقی کی صحبت ہو۔ جام کا دور ہو۔ رقاصائیں رقص کر رہی ہوں۔ اس موقع پر خسرو کی غزلوں کا اثر تھکے ماندوں میں نئی زندگی ڈال دیتا تھا۔ غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ خسرو سلطان کی محفلوں کے لئے بھی شعر لکھتے تھے۔ خسرو نے مفتاح الفتوح لکھی جو اس کے دور کی منظوم تاریخ ہے۔ امیر خسرو کے دو سابق مربیوں — ملک چھجو اور سر علی جاندار نے جلال الدین کے خلاف بغاوت کی۔ لیکن امیر خسرو نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے نئے آقا کو اس بغاوت کے کچلنے پر مبارکباد پیش کی۔ ابھی خسرو کو اس سے بھی زیادہ کڑوی گولی کو حلق سے اتارنا تھا۔

۱۶ رمضان ۶۹۵ھ (۱۴ جولائی ۱۲۸۹ء) کو ملک علاؤ الدین خلجی نے جو سلطان کا بھتیجا اور داماد تھا کرا کے قریب گنگا کے کنارے جلال الدین کو قتل کر دیا۔ یہ تاریخ کا سب سے زیادہ گھناؤنا قتل تھا۔ جلال الدین نے اپنے قاتل بھتیجے کو باپ کی طرح پالا تھا۔ اور اس

---

[1] ندیم کے فرائض وزیر سے مختلف ہوتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ سلطان کا دل بہلاتا تھا۔ اسے انتظام یا سلطنت کے پالیسی معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس منصب سے عزت و مرتبہ کے مقابلہ میں مالی فائدہ زیادہ تھا۔

[2] اس کی دو رباعیاں بدایونی نے نقل کی ہیں۔

کے لشکر میں بغیر فوج کے آنے کے لئے تیار ہوگیا۔ ''اور احسان فراموش علاؤالدین! یہ تو نے کیا ہے''؟ وہ چلایا مرتے وقت اس کی زبان پر کلمہ تھا۔

قاتل اختیار الدین ہُد۔ سلطان کے پیچھے دوڑا اور سر تن سے الگ کر دیا۔ نئے سلطان نے اس قتل کی کوئی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نے روپے سے اپنے ناقدوں کی زبان بند کر دی اور اس نے اپنی سلطنت کو انتظامی و اقتصادی اصلاحات نافذ کر کے مضبوط بنا لیا۔ علاؤالدین کے تخت پر بیٹھتے ہی ظلم و جور کا دور شروع ہوگیا۔ نئے نئے طریقے اپنائے گئے۔ پرانے ڈھانچہ کو بدل دیا گیا۔ دوسروں کی طرح خسرو بھی نئے سلطان کے حضور میں تحفے لے کر حاضر ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ غم و غصہ سے پاگل ہوگئے ہوں مگر احتجاج کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں آیا[1] درباری شاعر کی حیثیت سے ان کی پوزیشن محفوظ تھی۔ کسی نے بھی ان کی سابقہ وفاداریوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ علاؤالدین نے خسرو کو بھی اسی طرح قبول کر لیا اس طرح کہ اپنے پیش رو کے دربار کی دوسری چیزوں جیسے فرنیچر وغیرہ کو۔ سلطان تعلیم یافتہ اور مہذب انسان نہیں تھا اور برنی اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ اس نے خسرو کی کوئی خاص قدر نہیں کی۔ ''امیر خسرو جیسا شاعر اگر محمود یا سنجر جیسے بادشاہوں کے دور میں ہوتا تو وہ اس کو جاگیریں عطا کرتے۔ اس کو گورنر بناتے۔ اور بڑے سے بڑا منصب دیتے۔ مگر علاؤالدین نے شاعری کا جو جائز مقام تھا اس کو نہیں دیا۔ اور محض ایک ہزار ٹنکے دینے پر اکتفا کیا[2]''

علاؤالدین خلجی ایک دنیادار اور جہاندیدہ بادشاہ تھا۔ اور وہ کسی صوبہ کی گورنری کو شاعروں کا کھلونا نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ معاشی زندگی کے ہر شعبے کی تنظیم نو میں مصروف تھا۔ اور اس پر بھی حیرانی نہیں ہونی چاہئے کہ وہ شاعروں کے طبقہ کے تئیں زیادہ فراخدل نہیں تھا کیونکہ وہ ان کو غیر ضروری سمجھتا تھا۔ تاہم خسرو نے جس طرح سلطان کی سخاوت کی تعریف کی اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کی تعریف بے کار نہیں گئی۔ خسرو کی تعریف کی ایک

۱۔ خزائن الفتوح اور دیول رانی دونوں میں خسرو نے اس قتل کا کوئی ذکر نہیں کیا ایسا علاؤالدین کی خواہش پر ہوا جو اس قتل کو چھپانا چاہتا تھا۔

۲۔ بارہ سو ٹنکے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سرکاری افسر کی حیثیت سے یہی امیر خسرو کی تنخواہ تھی۔

وجہ اور بھی ہے۔ پہلی بار اسے ایسے سیاسی مبصر کی خدمت کا موقع مل رہا تھا جو واقعی تعریف کا مستحق تھا۔ ملک چھجو۔ بغرا خاں، جلال الدین اور شہزادہ محمد معمولی لوگ تھے۔ اور محض اتفاق یا بڑے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے ممتاز تھے۔ علاؤ الدین ایک اصل ہیرو کی حیثیت سے اسٹیج پر آتا ہے۔ اور امیر خسرو ایک باکمال فن کار کی حیثیت سے اب مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت بیان کرتے ہیں اور ایسی تعریف کرتے ہیں جو انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ دورِ وسطیٰ کے شعراء نے اپنے دور کے بادشاہوں کے بارے میں جو قصیدے لکھے ہیں واقعی ان میں ایک وقار اور عظمت ہے۔

علاؤ الدین خلجی کا بیس سالہ دورِ حکومت امیر خسرو کی شاعری کے لئے بھی نہایت تخلیقی اور مفید ثابت ہوا۔ جبکہ سلطان اپنی اصلاحات میں مصروف تھا۔ امیر خسرو اپنی شاعری میں۔ ان کی زود گوئی بے مثال ہے۔ تین سال کی مدّت میں (۱۲۹۷ء سے ۱۳۰۱ء تک) انہوں نے اپنی پانچ مثنویوں — مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینہ سکندری اور ہشت بہشت — کو مکمل کر لیا تھا۔ یہ سب مثنویاں نظام الدین اولیا کے نام سے منسوب ہیں اور علاؤ الدین خلجی کو پیش کی گئیں۔ جب وہ تیسری مثنوی — لیلیٰ مجنوں — لکھ رہے تھے تو ان کی عزیز والدہ اور بھائی کا انتقال ہو گیا۔ آہ۔ میری ماں! تُو کہاں ہے:- اب میں تجھے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے آنسوؤں پر رحم کر اور مسکراتی ہوئی اپنی قبر سے نکل آ — میں نے تیرے ساتھ گستاخیاں کی ہیں۔ لیکن تیرے پیار میں کمی نہیں آئی۔ آج مجھے اپنے کیے پر شرمندگی ہے۔ اب میں تجھ سے کس طرح معافی مانگوں؟ جب آدمی خوشحال اور دولت مند ہوتا ہے اس کو اس کی اہمیت معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اور جب خوشحالی ختم ہو جاتی ہے تو وہ کفِ افسوس ملتا ہے کہ وہ اس کو واپس نہیں لا سکتا۔ جب تو زندہ تھی تو تیری نصیحت میرے لئے بڑا سہارا تھی۔ اب تیری خاموشی بھی میرا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ اور تیرے ساتھ قتلغ بھی رخصت ہو گیا۔ جو میرا بھائی اور تیرا بیٹا تھا۔ وہ جنگ جوئی کی پوری تربیت حاصل کر چکا تھا اور قدرت نے اس کو حسام (تلوار) کے خطاب سے نوازا تھا۔ وہ میرے باپ کی طرح لڑنے میں جری تھا۔

”وہ میری طرح جو ایک ٹوٹی ہوئی تلوار کی طرح ہوں کبھی پیچھے نہیں رہا۔ آہ۔ بے یار و مددگار۔ اب تجھ پر تنہائی میں کیسی گذر رہی ہوگی؟ میرے سامنے آ۔ اپنے چہرہ کو مت

چھپا۔خواب سے جاگ جا،اب تو بہت سوچکی۔اگر اس قدر پاکیزہ ومقدس ہے کہ جسمانی طور پر نمودار نہیں ہو سکتی تو کم از کم خواب ہی میں دکھائی دے جا۔[1]''

اس صدمہ کے باوجود خسرو نے خمسہ پورا کیا:۔ جذبہ شکر کے ساتھ۔وہ ہشت بہشت میں لکھتے ہیں:'' خدا نے ایک نامعلوم خزانہ اتنے موتی میرے دامن میں ڈال دیئے ہیں کہ میں نے اپنے پانچ رسالے (مثنویاں) تین سال میں پورے کر لئے ہیں۔اب جبکہ میں نے انہیں تعمیر کر دیا ہے مجھے اپنے مرنے کا افسوس نہیں۔''ایک کم ہمت اور کم تخلیقی شاعر کی تسلی واطمینان کے لئے یہ پانچ رومانی مثنویاں کافی تھیں مگر خسرو کی توانائی لامحدود تھی۔

اس خیال سے کہ کہیں اس کے ناقد اسے محض ایک شاعر سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔انہوں نے نثر نگاری کی طرف بھی توجہ دی اور مختلف قسم کی نثر نگاری کی۔اولاً انہوں نے خزائن فتوح لکھی جو علاؤالدین کی جنگوں کی ایک مختصر تاریخ ہے۔یہ چھوٹی سی کتاب ہے۔دوسری کتاب نسبتاً طویل اعجاز خسروی لکھی جو پانچ جلدوں میں ہے۔اس میں مختلف نثری اسلوب بیان کئے گئے ہیں۔علاؤالدین کے آخری دور میں دوسری بہترین تاریخی مثنوی دول رانی خصر خاں لکھی گئی۔جس کا المیہ انجام ہے۔[2]

امیر خسرو کا کوئی بھی سوانح نگار امیر خسرو پر شیخ نظام الدین اولیا کے اثر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔اگرچہ دونوں مزاج و کردار میں ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن دونوں کی ایک دوسرے سے دوستی اور پیار خلوص پر مبنی تھے۔دونوں کی ابتدائی زندگی کے دھارے بھی قطعی مختلف تھے۔شیخ نظام الدین کے دادا خواجہ سید علی بخارا سے ہجرت کر کے آئے تھے اور بدایوں میں مقیم ہو گئے تھے۔

۶۳۶ھ (۱۲۳۸ء) میں شیخ[3] نظام الدین بدایوں میں پیدا ہوئے۔ابھی وہ بچے

---

[1] لیلیٰ مجنوں (علی گڑھ ایڈیشن۔صفحات ۱۶۰۔۱۶۵)

[2] ان تمام تصانیف پر بعد میں اظہار خیال کیا جائے گا۔

[3] عام طور پر آجکل ہندوستانی مسلمانوں کو سیّد، مغل اور پٹھان، ذاتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔چوتھی ذات شیخ ہے جو کافی وسیع ہے اور غیر واضح۔عہد وسطیٰ میں ایک شیخ کا مطلب ممتاز صوفی ہوا کرتا تھا۔میں نے اس لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

ہی تھے کہ ان کے والد سید علی بیمار پڑ گئے۔ ان کی والدہ بی بی زلیخا نے خواب میں کسی شخص کو کہتے سُنا کہ اسے شوہر اور بیٹے میں سے ایک کو چُن لینا ہوگا۔ ایک روایتی ہندوستانی ماں کی طرح انہوں نے بیٹے کو چُن لیا۔ اور حالات کچھ ایسے ہوئے کہ سید علی کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ بی بی زلیخا زہد و تقویٰ والی خاتون تھیں۔ اور ان کی شخصیت نے بچہ پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ بچہ سے ماں کو بے حد پیار تھا اور اس نے انتہائی غریبی میں بھی بچہ کو اچھی تعلیم دلائی۔ بچہ اور ماں کا آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بغیر مانگے ہی رحم دل پڑوسی کچھ دے جاتے تھے۔ ان کی نوکرانی غریب گھر کی وجہ سے بھاگ گئی۔ تاہم شیخ ایک محنتی انسان تھے۔ اور انہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں وہ سب کچھ سیکھ لیا تھا جو وہ بدایوں میں سیکھ سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ مزید تعلیم کے لئے دہلی آ گئے۔ اس وقت دلّی میں دانشور اور علماء موجود تھے۔ تعلیم تقریباً مفت تھی۔ اور شیخ آسانی سے اساتذہ سے استفادہ کر سکتے تھے۔ ان کے خصوصی استاد کمال الدین زاہد ایک آزاد خیال عالم تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے مولانا زاہد کے زہد و تقویٰ کے بارے میں سُنا اور انہیں امام اعظم کا عہدہ پیش کیا۔ مولانا نے اس پیش کش کے جواب میں سلطان کو کہلا بھیجا: ''ہمارے پاس صرف ہماری عبادت باقی رہ گئی ہے کیا سلطان اسے بھی ہم سے چھین لینا چاہتا ہے۔'' بلبن یہ جواب سن کر دم بخود رہ گیا اور معافی مانگتے ہوئے مولانا کو رخصت کی اجازت دیدی۔ ایسے عالم سے شیخ نظام الدین نے فراغت کی سند حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اور شاید استاد کی تعلیم کا فیضان تھا کہ دولت مند امراء سے بے نیازی تمام عمر شیخ کے کردار کی اہم خصوصیت رہی۔

اگرچہ شیخ نے معمول کے مطابق رسمی تعلیم حاصل کی۔ ان کا رجحان ہمیشہ تصوّف کی طرف رہا۔ اور وہ اپنے ساتھیوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ ان کے علمی مذاکرات میں زیادہ عرصے تک شریک نہ رہ سکیں گے۔ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے ایک قوال سے بابا گنج شکر کی تعریف سنی۔ اور ان کے دل میں بابا کی عزّت و محبت پیدا ہو گئی۔ جیسے ہی ان کی تعلیم ختم ہوئی وہ ان سے ملنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب وہ بابا فرید کے سامنے پہنچے تو خوف سے ان کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ بابا نے فرمایا: ''ہر نیا آدمی اسی طرح گھبراتا ہے۔'' مگر انہوں نے جلد ہی شیخ کو مانوس بنا لیا۔ شیخ نے اپنا سر منڈوایا اور ان کے

مریدوں میں شامل ہو گئے۔شیخ کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ایک مہربان خاتون نے ان کے کپڑے دھوئے اور جب وہ دلّی واپس جانے لگے تو بابا فرید نے انہیں ایک اشرفی پیش کی۔ بابا کے گھر میں یہ آخری اشرفی تھی۔اور اسی شام شیخ کو اس بات کا علم ہوا کہ اس شام ان کے گھر میں کھانا نہیں بنے گا کیونکہ کھانا خریدنے کے لئے کوئی پیسہ نہیں تھا۔مُرید نے اپنے آقا کا تحفہ واپس کر دیا جو استاد نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔شیخ فرید نے دعا کی ”میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ خدا تمہیں دنیوی دولت سے بھی نوازے گا۔“ اس دعا پر مرید کا دل خوش نہ ہوا۔شیخ کی پریشانی کو دیکھ کر بابا فرید نے مزید کہا: ”گھبرایئے نہیں، تمہارے لئے دنیا لالچ کا گھر نہیں ہوگی۔“ آقا کی چشم بینا اپنے جانشین کی عظمت کو دیکھ رہی تھی۔

تمام مذاہب میں ایسی ممتاز شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں جنہوں نے دنیا۔جسمانی خواہشات اور شیطانی قوتوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کی ہے اور کافی حد تک وہ اس ابدی جنگ میں کامیاب بھی ہوئے ہیں جو انسان کی اچھائی و برائی کے درمیان ہمیشہ سے جاری ہے۔لیکن شیخ نظام الدین ان حضرات میں سے نہیں تھے۔ان کے بارے میں یہ کسی نے نہیں لکھا کہ انہوں نے ریاضت وعبادت کے حیرتناک کرشمے دکھلائے ہوں۔وہ شیخ فرید کی طرح نہیں تھے کہ جنہوں نے اپنے کو کنویں میں لٹکا کر مسلسل روزے رکھ کر موت کے قریب پہنچا دیا۔ان میں رہبانیت کا کوئی عنصر نہیں تھا۔وہ رہبانی ریاضت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے جسمانی تکلیفوں سے نفس کشی کو روا نہیں رکھا۔ان کے خیال میں یہ نفس کشی دنیاداری کی جگہ قنوطیت کو جگہ دیتی ہے۔اور اس سچی خوشی سے انسان کو محروم رکھتی ہے جو اس کے دل کو گرماتی ہے۔انہوں نے شادی نہیں کی۔اور اپنے لئے کبھی گھر نہیں بنوایا۔لوگ اکثر مشاہدہ کرتے تھے کہ شیخ کی آنکھیں رات بھر کی عبادت کے بعد صبح کو سرخ ہوتی تھیں اور ان کے چہرہ پر ایک ناقابلِ بیان خوشی کا نور چمکتا ہوتا تھا۔وہ غریب اور قلاش انسان تھے۔اس روحانی خوشی کے ظاہر اسباب کچھ بھی نہ تھے۔

شیخ فرید نے حکم دیا تھا: ”میں نے ہندوستان کی روحانی سلطنت تیرے سپرد کر دی ہے۔جا تو اسے لے لے۔“ مگر شیخ نظام الدین ایک عرصے تک اسی شش و پنج میں رہے کہ دلّی میں رہیں یا کسی صوبائی شہر میں قیام کریں۔محض یہی ایک کشمکش تھی جس نے ان

کے ذہن کو کچھ پریشان کیا۔ اس کے بعد آخر کار انہوں نے دارالسلطنت میں رہ کر ہی اپنے فرض کو پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہاں ان کی زندگی کے ابتدائی تیس سال انتہائی افلاس میں گذرے۔ اولاً انہوں نے عماد الملک کے گھر میں قیام کیا جو امیر خسرو کے نانا تھے اور عام طور پر راوت ارض کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ لیکن دو سال کے بعد عماد الملک کے دونوں بیٹے دلّی واپس آگئے اور شیخ کو اپنے گھر سے نکال دیا — انہوں نے پڑوس کی ایک مسجد میں پناہ لی۔ اور اسی رات عماد الملک کے گھر میں آگ لگی اور وہ جل کر راکھ ہوگیا۔ کچھ دنوں تک وہ ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ گھومتے رہے۔ آخر کار غیاث پور میں آکر مقیم ہوئے۔ کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ اور شیخ کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلاتے تھے۔ ان دنوں کو یاد کر کے وہ کہا کرتے تھے: ''غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں تربوز ایک جتیل میں ایک من کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ لیکن اکثر و بیشتر موسم ایسے ہی گذر جاتا تھا اور مجھے یہ چکھنے کو بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ پورا دن گذرا پھر رات بھی گذر گئی۔ اگلا نصف دن بھی گذر گیا اور مجھے کھانے کے لئے کچھ نہیں ملا۔ ایک جتیل میں دو سیر روٹی ملتی تھی۔ مگر میرے پاس اتنا بھی نہیں تھا۔ میرے ساتھ میری ماں اور بہن کو بھی تکلیف اٹھانی پڑی۔ ایک بار ہم تین دن کے بھوکے تھے۔ ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کھچڑی کا پیالہ پیش کیا۔ مجھے وہ خشک اور سادہ کھچڑی بے حد لذیذ لگی۔ جب ہمارے گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا تو میری ماں کہا کرتی تھی۔ '' آج ہم خدا کے مہمان ہیں'' اور یہ الفاظ سن کر جو مسرت مجھے ہوتی تھی اس کا بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایک دن بابا فرید کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ہمارے گھر تشریف لائے ہیں۔ میں نے والدہ سے کہا کہ ان کے کھانے کے لئے کچھ لائیں۔ والدہ نے جواب دیا کہ گھر میں تو کچھ ہے نہیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا حضور صلعم، خلفاء راشدین کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے حضور کے قدموں کو بوسہ دیا اور ان سے اپنے گھر چلنے کی درخواست کی۔ مگر پیغمبر نے کہا: ''کس لئے؟'' — میں نے جواب دیا کہ جو کچھ میرے گھر میں ہے آپ اور آپ کے ساتھیوں کے کھانے کے لئے پیش کردوں گا۔ حضور نے جواب دیا۔ کیا تمہاری والدہ نے ابھی کہا نہیں ہے کہ گھر میں کھانے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ یہ سن کر میں شرمندہ ہوگیا۔''

اس دوران شیخ کی شہرت دور دراز علاقوں میں پھیل چکی تھی اور ہر کوئی جوان سے ملنے آتا تھا ان کا اسیر ہو کر جاتا تھا۔ وہ خوشی کا خزانہ تھے۔ ۶۶۶ھ میں شیخ فرید نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور مرنے سے کچھ دن پہلے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف اپنا عصا، جائے نماز اور چوغا شیخ نظام الدین کو دیدیا۔ سلطان جلال الدین نے شیخ کے اخراجات کے لئے ایک گاؤں ان کی نذر کرنا چاہا۔ ان کے مریدوں نے کہا کہ وہ اب کافی تکلیفیں اُٹھا چکے۔ یہ گاؤں ان کو لے لینا چاہئے۔ مگر ان کے احتجاج کے باوجود شیخ نے یہ پیش کش ٹھکرادی۔ اس کے بعد سلطان نے ملاقات کرنا چاہی۔ شیخ نے اس کے لئے بھی انکار کردیا۔ اور جب سلطان نے بغیر بتلائے ہی خانقاہ میں آنے کا ارادہ کیا اور سلطان کا ارادہ امیر خسرو کے ذریعہ شیخ کو معلوم ہو گیا تو وہ اجودھن کے لئے روانہ ہو گئے۔ شیخ نے سیاست میں حصہ نہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ اور اس راہ سے ان کو کوئی نہیں ہٹا سکا لیکن شیخ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ ان کا در ہر کسی کے لئے کھلا تھا اور وہ کسی سیاستداں کو آنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ علاؤ الدین خلجی کے ابتدائی دور میں امراء ان کی خانقاہ واقع غیاث پور میں آنے لگے تھے ––– اگرچہ ان کی آمد سے حضرت شیخ کو پریشانی لاحق ہوتی تھی مگر وہ انہیں منع نہیں کر سکتے تھے۔ دھیرے دھیرے آنے والے امراء کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ علاؤ الدین خلجی کے دور آخر میں نظام الدین اولیاء کی شہرت بام عروج پر تھی۔ تخت کا وارث خضر خاں شیخ کا معتقد تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کے دوسرے گھر والے امراء اور محل کے دوسرے لوگ بھی شیخ کے مرید ہو گئے تھے صرف سلطان بچے ہوئے تھے۔ ضیا برنی نے لکھا ہے۔

"علاؤ الدین کا دل کیسا تھا! وہ کتنا بے نیاز اور جری تھا۔ ہزاروں فرسنگ سے مسافر اور طلبا حضرت شیخ کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ جوان، بوڑھے، دانشور و عالم، جاہل و بے وقوف، ان کے ملنے کے ہزاروں حیلے و بہانے ڈھونڈتے تھے لیکن علاؤ الدین خلجی کو یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ وہ حضرت شیخ کے پاس جاتا یا ان کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دیتا[1] شیخ اور سلطان دراصل دونوں ہی اپنے اپنے دائرہ کار میں عظیم تھے اور دور ہی دور

---

[1] برنی کے اس بیان کے پیش نظر امیر خورد کا بیان قابل قبول نہیں جس میں اس نے کہا ہے کہ علاؤ الدین خلجی نے شیخ سے ملنے کی کوشش کی مگر شیخ نے یہ کہہ کر منع کرادیا کہ اگر سلطان ایک (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سے دونوں ایک دوسرے کے لئے عزت واحترام کا جذبہ رکھتے تھے۔علاؤ الدین کو صوفیوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔شیخ کو سیاستدانوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔اپنے ٹوٹے پھوٹے طریقہ سے سلطان خدا کی بندگی کرتا تھا۔

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) دروازہ سے آئیں گے تو وہ دوسرے دروازہ سے باہر نکل جائیں گے۔امیر خورد کی بیان کردہ دوسری کہانی زیادہ قابلِ قبول ہے۔علاؤالدین تمام مذہبی لوگوں کی سیاسی امنگوں کے بارے میں شک وشبہ رکھتا تھا۔اس نے شیخ کو ایک خط لکھا کہ وہ تمام معاملات میں سلطان کی ہدایات پر عمل کریں۔یہ خط خضر خاں نے شیخ کو دیا مگر شیخ نے اس کو کھول کر بھی نہیں دیکھا۔شیخ نے یہ جواب دیا ''ہم درویشوں کو ریاست کے کاروبار سے کوئی مطلب نہیں ہے۔میں شہر سے دور اس ایک گوشہ میں بیٹھا سلطان اور دوسرے مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لئے دعا میں مصروف ہوں۔اگر سلطان کو یہ پسند نہیں تو وہ مجھے بتلائے میں اور کہیں چلا جاؤں گا۔خدا کی زمین کافی وسیع ہے۔شیخ کے اس جواب سے علاؤالدین مطمئن ہو گیا کہ شیخ سیاسی عزائم نہیں رکھتے۔سلطان غیاث الدین اور شیخ نظام الدین کے تعلقات کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خوشگوار نہیں تھے۔کم از کم بعد کے مصنفین ایسا ہی لکھتے ہیں۔فرشتہ نے ان کے دو اسباب بیان کئے ہیں۔خسرو خاں نے جس کو اپنے حامیوں کی ضرورت تھی ممتاز صوفیوں کو بھی کافی تعداد میں روپیہ تقسیم کیا تھا۔ان میں سے تین صوفیاء نے تو روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔باقی نے لے لیا اور اس کو محفوظ رکھا تا کہ جب بھی کوئی تخت کا اصل وارث بادشاہ بنے پیسہ اس کو واپس لوٹا دیا جائے۔لیکن شیخ نے جن کو پانچ لاکھ ٹنکے ملے تھے یہ روپیہ غریبوں میں تقسیم کر دیا خسرو خاں کی دی ہوئی دولت زیادہ تر غیاث الدین نے لوگوں سے واپس لے لی لیکن شیخ سے کچھ بھی وصول نہیں کیا جا سکا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ شیخ روپیہ پہلے ہی تقسیم کر چکے تھے۔کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ نے سلطان کو ناراض کر دیا تھا۔دوئم یہ کہ سلطان نے شیخ کے سمع سننے پر بھی اعتراض کیا تھا۔اگرچہ بعد میں ایک مذاکرہ کے بعد اس نے یہ اعتراض واپس لے لیا۔سلطان نے بنگال سے لوٹتے ہوئے شیخ کو دلی چھوڑنے کا حکم دیا۔شیخ نے جواب دیا: ''ہنوز دلی دور است۔'' اور سلطان کبھی دلی نہیں پہنچا۔اس واقعہ کو سطحی قسم کے مصنفین نے شیخ کی روحانی طاقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔لیکن واقعہ اس سے کہیں زیادہ المناک ہے۔حضرت نظام الدین اس واقعہ سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔سلطان کا جنازہ بعد میں دہلی میں لایا گیا۔یہ کہانی بعد میں گھڑی گئی ہے۔برنی اور امیر خسرو دونوں میں سے کسی نے بھی سلطان اور شیخ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا ذکر نہیں کیا ہے۔(مصنف)

امیر خسرو، امیر حسن کے ملفوظات اور امیر خورد کی سیر الاولیا کی وجہ سے شیخ نظام الدین اولیا کی پوری شخصیت سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ دورِ وسطیٰ کے دوسرے کسی شخص کے بارے میں ہمیں اتنی واقفیت نہیں" ان کا در ہر کسی کے فیضان کے لئے کھلا تھا۔ وہاں سبھی اعتراف گناہ کے لئے آتے تھے ان میں امراء، عوام الناس، امیر، غریب، ملک، فقیر، طالبِ علم، سیاح، جاہل، شہر و دیہاتی، سپاہی اور دفتری آدمی۔ غلام و آزاد بھی شامل تھے۔"

صبح، دوپہر اور شام کا وقت خصوصیت کے ساتھ ان کے لئے تھا جو ان سے مشورہ طلب کرنے آتے تھے۔ ویسے ہر وقت ہر کوئی ان کے پاس آ جا سکتا تھا۔ وہ کسی کو انتظار نہیں کراتے تھے۔ شیخ کا کام لوگوں کو نیکی اور اچھائی کی تعلیم دینا تھا۔ اور تمام عمر انہوں نے یکسوئی اور انہماک کے ساتھ اس کام پر لگادی۔ ہر طبقہ کے افراد ان کی خانقاہ میں آتے تھے اور وہ ہر ایک سے اس کے مرتبہ اور علم کے مطابق بات کرتے تھے۔ اور ہر شخص ان کا گرویدہ ہو کر واپس جاتا تھا۔ مختصر ملفوظات کے علاوہ شیخ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اور ان کے مریدوں کی تصنیفات جو ہم تک پہنچی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نہ صرف ایک عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے بلکہ ان کی شخصیت دلکش و دلفریب بھی تھی۔ کسی بھی انڈو مسلم صوفی نے اپنے ہم عصروں پر اتنا گہرا اثر نہیں چھوڑا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "قیامت کے دن سب سے بڑا انعام اس کو ملے گا جس نے مسلمانوں اور عام انسانوں کی خوشی کے لئے کام کیا۔" لوگوں کا کہنا تھا کہ اگرچہ شیخ لوگوں سے گفتگو کرتے رہتے تھے لیکن ان کے چہرہ سے ایسا ظاہر ہوتا رہتا تھا کہ جیسے ان کا دل خدا کے ذکر میں مصروف ہے اور گویا وہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اولیا کرام کی سوانح بے معنی معجزات کے بیانات سے بھری پڑی ہیں مگر شیخ معمولی قسم کے معجزہ باز نہیں تھے۔ وہ کبھی ہوا میں نہیں اُڑے۔ انہوں نے کبھی دریا کی لہروں پر چلنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی عظمت تو ان کے پیار بھرے دل میں تھی۔ ان کے معجزے روحانی معجزے تھے۔ جیسے وہ چہرہ پڑھ کر دل کا حال سمجھ جاتے تھے اور کوئی ایک فقرہ ایسا بولتے تھے کہ رنجیدہ دلوں میں خوشی بھر دیتا تھا۔ گوپاموکے خواجہ مبارک جب بھی علاؤالدین کے دربار میں حاضری دیتے تھے تو سلطان ان کو ایک خلعت پیش کرتے تھے۔ لیکن ایک مرتبہ سلطان نے خواجہ کو صرف ایک سفید چادر پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ اس بدلے

ہوئے رویے سے خواجہ کو سخت تکلیف پہنچی۔

وہ اسی حالت میں شیخ سے ملنے کے لئے آئے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولے:

''سیپ ہو یا اشرفی، بادشاہ کا دیا ہوا تحفہ بہر حال قیمتی ہے۔'' خواجہ نے بعد میں بیان کیا:۔'' شیخ کے یہ الفاظ سن کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اور میرا غم غائب ہو گیا۔'' ایک نوجوان دیوانہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شیخ سے ملنے کے لئے آیا اور کچھ تحائف بھی ساتھ لایا۔ ان تحفوں میں اس نے کچھ ریت، ایک پڑیا میں باندھ کر رکھ دیا۔ جب شیخ کے خادم یہ تحفے اٹھانے کے لئے آئے تو شیخ نے ریت کی پڑیا کو وہیں پڑے رہنے کا حکم دیا:۔'' یہ سُرمہ خصوصیت کے ساتھ میری آنکھوں کے لئے ہے'' ۔ یہ سُن کر تحفے لانے والا تھر تھر کانپنے لگا۔ لیکن شیخ نے اس کو دلاسا دیا اور ایک جوڑا کپڑوں کا بھی دیا۔ اپنی غریبی کے زمانے میں ایک دفعہ شیخ کو دو دن کے بعد روٹی کے چند ٹکڑے کھانے کے لئے ملے تھے۔ جو ان کے دستر خوان پر پڑے تھے۔ ایک فقیر ادھر سے گذرا اور یہ سمجھ کر کہ شیخ نے کھانا ختم کر لیا ہے۔ دستر خوان ان کے سامنے سے اٹھالیا۔ یہ دیکھ کر شیخ مسکرائے اور بولے:۔'' خدا نے ہمارے قربانیوں کو قبول کر لیا ہے۔ اسی لئے وہ مزید ہمیں آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے۔''

ایک مسافر نے شیخ اور ان کے مریدوں کی خستہ حالت دیکھ کر شیخ کو علم کیمیا سکھانے کی پیشکش کی۔ اس پر شیخ نے جواب دیا:'' رنگوں کو ملانا عیسائیوں کا کام ہے اور سونا جمع کرنا یہودیوں کا۔ ہم جو مسلمان ہیں نہ اس دنیا کی دولت کی طمع رکھتے ہیں اور نہ آخرت کی۔ ہم صرف خدا کے لئے زندہ رہتے ہیں۔''

اگر آپ چاہیں تو ان تمام واقعات کو معجزات کا درجہ دے سکتے ہیں۔

آٹھ سال کی عمر میں ہی امیر خسرو، شیخ نظام الدین کے مرید بن گئے تھے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ شیخ نے امیر خسرو کے شعری ذوق کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ مگر اپنی ابتدائی زندگی میں خسرو دلّی سے زیادہ تر باہر رہتے تھے اور اسی لئے قرآن السعدین میں جو کیقباد کے آخری دور میں لکھی گئی حضرت نظام الدین کا ذکر نہیں ہے۔ غالباً شیخ اور خسرو کی دوستی جلال الدین خلجی کے دور میں ہوئی۔ اور یہ دن بدن گہری ہوتی گئی۔ اگر چہ دونوں کے مزاج مختلف تھے

لیکن دونوں میں جذبہ ہمدردی مشترک تھا۔ امیر خسرو درباروں میں رہنے کے باوجود دل سے ایک صوفی تھے۔ شیخ بھی اکثر شاعری کرتے تھے۔ چنانچہ وہ خسرو کی شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ جب جوانی کا جوش خروش مدھم پڑا تو امیر خسرو ایک پاکیزہ زندگی گذارنے لگے۔ شیخ کے تئیں ان کا لگاؤ بڑھ گیا اور حضرت شیخ نے بھی جن کی رواداری اور وسعت نظری کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس ترک درباری کو گرمجوشی سے اپنے حلقہ میں شامل کر لیا۔ ان کے آنے کی وجہ سے خانقاہ کی فضا میں ایک نئی دنیا کی تازہ ہوا داخل ہوئی۔ ماحول میں نئی زندگی آئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب وہ تکیہ کے سہارے بیٹھتے تو امیر سے سوال کرتے: "کہیئے آج کیا خبریں ہیں۔؟" اور پھر امیر دن بھر کے دربار کے واقعات سناتے جاتے تھے اور شیخ خوشی سے سر ہلا کر سنتے جاتے۔ وہ اس درباری دنیا سے ایک تماشائی کا سا تعلق رکھتے تھے۔ خسرو ان کی روحانی عظمت سے متاثر تھے۔ شاعر کی پوری زندگی ایک ایسا ادبی شاہکار بنانے میں بیتی جو ان کے نام کو آنے والی نسلوں کے لئے یادگار بنا دے۔ مگر اس کے برخلاف شیخ اس قسم کی خواہش سے بالاتر تھے۔ انہوں نے امیر خسرو کو یہ سبق دیا کہ بڑی سے بڑی دنیوی کامیابی کے مقابلے میں روح کا ارتقا زیادہ اہم ہے۔ اگرچہ خسرو نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل کبھی نہیں بدلا۔ لیکن ان کی ہزاروں غزلوں میں شیخ کی تعلیم کا اثر صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ خسرو اگرچہ قصیدہ گوئی کرتے رہتے تھے۔ مگر وہ کبھی اپنے کو نہیں بھولے۔ چنانچہ بعد کی ہر مثنوی میں نظام الدین کا نام ملتا ہے۔ یہاں تک کہ شیخ کا نام وہ سلطان سے پہلے لکھتے ہیں۔

لیکن کوشش کے باوجود نظام الدین اولیا اپنے کو سیاست کی دلدل سے الگ نہ رکھ سکے۔ سلطان علاؤ الدین کا بیٹا خضر خاں شیخ کا مرید تھا۔ اور یہ سمجھا جانا فطری امر تھا کہ شیخ، خضر خاں کی تخت نشینی کی حمایت کریں گے۔ لیکن علاؤ الدین کی موت کے بعد جوڑ توڑ کا دور چلا اس بارے میں نظام الدین اولیا نے قطعی خاموشی اختیار کی۔ چالیس دن کے وقفہ کے بعد قطب الدین مبارک شاہ اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ اس نے ابتدا میں بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا اور شیخ کے تئیں کسی ناراضگی و دشمنی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن جب مبارک شاہ دکن کی مہم سے واپس آیا تو اسے اپنے خلاف ایک سازش کا علم ہوا جس کے روح رواں ملک اسد الدین تھا جو اس کے والد کا چچازاد بھائی تھا۔ اس نے سازشیوں کو سخت سزائیں دیں

یہاں تک کہ سلطان کے بھائیوں، خضر خاں، شادی خان اور شہاب الدین۔ جن کو ملک کافور نے اندھا کر کے قید میں ڈال دیا تھا کو بھی قتل کرا دیا۔ وہ شیخ سے بھی ناراض ہو گیا۔ برنی لکھتا ہے: ''اس نے شیخ کے خلاف بولنا شروع کر دیا اور دشمنی کا کھلا مظاہرہ کرنے لگا۔ دربار کے امراء و شہزادوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیاث پر شیخ کی خانقاہ نہ جایا کریں۔ مغرور سلطان نے یہ بھی اعلان کیا کہ کوئی شیخ کا سر کاٹ کر ان کے پاس لائے گا وہ اسے ایک ہزار ٹنکے دے گا۔ ایک مرتبہ شیخ ضیاء الدین رومی کے ''صیوم'' میں سلطان اور شیخ کا ایک دوسرے سے سامنا ہوا۔ مگر مبارک شاہ نے شیخ کی کوئی پرواہ نہیں کی اور ان کے سلام کا بھی جواب نہیں دیا۔ اس نے شیخ رکن الدین کو ملتان سے دلّی میں بلانے کی کوشش کی تا کہ عوام کی توجہ شیخ کی طرف سے ہٹ جائے۔ مگر شیخ رکن الدین حضرت نظام الدین کے پرانے دوست تھے وہ دلّی نہیں آئے۔ اس کے بعد سلطان نے ایک شیخ زادہ جام گوان کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا تا کہ جب لوگ لڑنے پر آمادہ ہوں، بہ آسانی ان کے لئے موقع فراہم کیا جا سکے۔ سلطان نے مسجد میری کے نام سے ایک مسجد تعمیر کرائی اور پہلی نمازِ جمعہ کے لئے شہر کے تمام ممتاز لوگوں کو مسجد آنے کا حکم دیا۔ مگر نظام الدین اولیا نے آنے سے انکار کر دیا۔ شیخ نے سلطان کے قاصد کو جواب دیا:-

''میرے پڑوس کی مسجد کا مجھ پر زیادہ حق ہے۔'' مزید طرّہ یہ ہوا کہ شیخ نے مبارک شاہ کے دربار میں بھی آنے سے انکار کر دیا۔ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ ہر ممتاز شہری ہر ماہ کے پہلے دن دربار میں حاضری دیتا تھا۔ شیخ نے اس رواج کی کوئی پرواہ نہیں کیا اور کبھی دربار میں نہیں گئے۔ بلکہ اپنے ملازم اقبال کو اپنا نمائندگی کے لئے بھیج دیا۔ سلطان کے لئے یہ بڑی ذلت تھی۔ اس نے شیخ کے خلاف سمن جاری کر دیا کہ وہ پہلی تاریخ کو دربار میں حاضر ہو۔ مگر وہ دن کبھی نہیں آیا۔ چاند کی پہلی تاریخ کو پرواریوں نے مبارک شاہ کو قتل کر دیا اور اس طرح شیخ نظام الدین کو ایک مشکل صورت حال سے نجات مل گئی۔ بقول امیر خسرو، مبارک شاہ کی موت شیخ کی دعاؤ کے نتیجہ میں ہوئی نہ کہ پرواریوں کے جرائم کی وجہ سے۔ تاہم اس طرح کے معاملات میں کوئی فیصلہ دینا ایک مورخ کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

سلطان مبارک شاہ اور شیخ کے درمیان تعلقات کشیدہ ہونے کے باوجود خسرو

کے تعلقات دونوں سے خوشگوار رہے۔ بلکہ اپنے باپ کے مقابلہ میں مبارک شاہ خسرو کے ساتھ زیادہ سخاوت اور فیاضی کا سلوک کرتا تھا اور خسرو نے بھی اپنے آقا کی مدح میں کمی نہیں کی۔ انہوں نے نہ سپہر لکھی جو مبارک شاہ کے دور کی منظوم تاریخ ہے۔ مبارک شاہ کی موت کے بعد پرواریوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ جو انتہائی بحرانی دور تھا۔ اس کے بعد غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا جو اس دور کے معیار کے مطابق ایک آئیڈیل بادشاہ تھا اس کی ساری عمر فوجی اور دیوانی نوکری میں گذری تھی۔ اس کی ذاتی زندگی پاک وصاف تھی اور اس میں وہ غرور وانا بھی نہیں تھی جو عموماً خودساز لوگوں میں پیدا ہوجاتی ہے۔ ضیا برنی نے لکھا ہے:

''غیاث الدین تغلق نے ایک ہی ہفتہ میں بدنظمی وانتشار کے تمام آثار ختم کردیئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا علاؤالدین خلجی کا دور واپس لوٹ آیا۔''

علاؤالدین کے زمانہ کی سختیاں تو نہیں تھیں۔ لیکن اس کی اصلاحات کو برقرار رکھا گیا۔ امیر خسرو ایسے سلطان کے ساتھ زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے تھے۔ ان کی مثنوی تغلق نامہ اس کا ثبوت ہے۔ جو ان کی آخری مثنوی ہے اور جو اپنے دور کے آخری سلطان کی تعریف میں لکھی گئی۔ جب غیاث الدین تغلق نے بنگال پر حملہ کیا، امیر خسرو ان کے ہمراہ تھے۔ مگر بنگال سے واپسی سے پہلے ہی حضرت نظام الدین اولیا کا انتقال ہوگیا۔ خسرو جب واپس آئے تو انہیں اس خبر سے سخت صدمہ پہنچا۔ اور اس کے چھ ماہ بعد خسرو کا بھی انتقال ہوگیا۔ شیخ نے ایک بار کہا تھا:۔ ''میری زندگی کے لئے دعا کیجئے۔ کیونکہ آپ بھی میرے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیں گے۔'' امیر خسرو کو شیخ کے پائینتی دفنایا گیا۔ شیخ نظام الدین نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی:۔ ''میری قبر پر کوئی یادگار تعمیر نہ کرائی جائے۔ مجھے تو کھلے آسمان کے نیچے ہی آرام ملے گا۔'' لیکن سلطان محمد تغلق نے ایک مقبرہ بنوادیا۔ چھ سو سال سے زیادہ بیت گئے ہیں۔ اس دوران سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں۔ شہر بسے اور اُجڑ گئے۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیا کا مزار آج بھی اسی طرح لوگوں کی امیدوں کا ملجا و ماوا بنا ہوا ہے۔

علی گڑھ میگزین۔ مئی ۱۹۲۵ء

ترجمہ: شیخ سلیم احمد

☆☆

امیر خسرو کا تاریخی شعور۔ ایک توقیتی مطالعہ

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

جدید تاریخ نویسی کے اصول و معیارِ روایت و درایت کی کسوٹی پر خواہ امیر خسرو بحیثیت مورخ کھرے نہ اتریں، تاہم ان کی نثری اور منظوم تصانیف کی تاریخی اہمیت اور قدر و قیمت سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا۔(۱) بلا ریب وہ اصلاً شاعر تھے اور قصیدہ گوئی اور مدح سرائی ان کا بنیادی پیشہ تھا۔ اسی کی بدولت انھوں نے دہلی سلطنت کے امیروں، شہزادوں اور سلطانوں کے درباروں میں بار پایا تھا۔ بلبنی دور (۸۷۔۱۲۶۶ء) کے دو عظیم امیروں ملک علاء الدین کشلی خاں اور ملک امیر علی سرجاندار حاتم خاں کی مصاحبت اور دو شہزادوں ناصر الدین بغرا خاں اور محمد سلطان "خان شہید" کی ندیمی(۲) نے امیر خسرو کو وہ شعری پختگی اور فنی شہرت عطا کی جس کے نتیجہ میں البری عہد کے آخری سلطان معز الدین کیقباد (۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء۔ ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء) نے ان کو اپنے "ندیمان خاص" کے حلقہ میں داخل کر لیا تھا۔(۳) امرا اور شہزادگان کی خواہش و خوشنودی کی خاطر امیر خسرو اپنے ذہن و قلم کے جواہر پارے قصیدوں اور ترجیعوں کی شکل میں لٹاتے رہے تھے۔ لیکن اب نوخیز و عیاش مگر علم پرست البری سلطان کی فرمائش پر انھوں نے اپنی پہلی تاریخی مثنوی لکھی(۴)۔ پھر تو زندگی بھر نہ ان کی درباری وابستگی ٹوٹی اور نہ ان کی تاریخی نگارشات کا سلسلہ ختم ہوا۔

اس درباداری اور سیاسی آلودگی نے اگرچہ ظاہر بین نگاہوں کو ان کے دامن پر کچھ بدنما دھبے دکھائے مگر اسی درباری مجالست و ندیمی نے ان کو وہ مواقع بھی فراہم کیے جنہوں نے تین حکمران خاندانوں — البری، خلجی اور تغلق کے عروج یا زوال کے تاریخی عوامل کا قریب سے مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کی نگاہ بخشی۔ انہوں نے "بارِ سلطان" اور "بزمِ امراء و ملوک و

خوائین'' ہی میں سیاسی شعور پایا۔ اپنے گرد کے سماجی اور تہذیبی تحریکات اور انقلابات کے مطالعہ سے سماجی عناصر وہ عوامل کو سمجھا۔ ان کی حساس طبیعت، باریک بیں نگاہ اور دوررس ادراک نے بالآخر ایک مدح سرا اور قصیدہ گو شاعر کو وہ تاریخی شعور بخشا جو ان کی تاریخی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ قران السعدین، مفتاح الفتوح، خزائن الفتوح، دولرانی خضر خاں، نہ سپہر اور تغلق نامہ اگر ان کی درباری داری کی کہانی سناتی ہیں تو ان کے تاریخی شعور کی امین بھی ہیں۔

امیر خسرو کی مورخانہ حیثیت اور ان کی تصانیف کی تاریخی اہمیت پر متعدد مورخین و مصنفین نے کافی کلام کیا ہے۔ ان میں پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر وحید مرزا، پروفیسر سیّد حسن عسکری، ڈاکٹر پٹر ہارڈی اور کنور محمد اشرف جیسے ممتاز و سربرآوردہ محققین بھی شامل ہیں اور ہم جیسے بہت سے غیر معروف و کم رتبہ مصنفین اور اہلِ قلم بھی۔(۵) اکثر مورخین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ خسروی نگارشات کی ایک بڑی خصوصیت تاریخوں یا شہور وسنین کی کثرت ہے جو مجموعی طور سے قابلِ اعتماد ہیں اور تاریخی ترتیب واقعات یا توقیت (Chronology) کی ترتیب کے سلسلہ میں ان پر دہلی کے عظیم ترین مورخ ضیاء الدین برنی سے بھی زیادہ بھروسا کیا جا سکتا ہے۔(۶) بعض جدید مورخوں نے '' تاریخ سلطنت دہلی'' کے البری، خلجی اور تغلق ادوار کے کسی پہلو پر اپنی نگارشات میں اس خسروی وصف سے عملاً فائدہ بھی اٹھایا ہے لیکن ابھی تک امیر خسرو کی تاریخی تصانیف کا توقیت کے نقطۂ نظر سے کوئی جامع تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں امیر خسرو کی مذکورہ بالا چھ تاریخی تصانیف کے متون کا ایک تنقیدی جائزہ اسی زاویہ سے لیا گیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو امیر خسرو کے تاریخی شعور کو جاننے پہچاننے میں مدد ملے گی اور ان کے تاریخی مقام و مرتبے کے تعین و تعیین میں آسانی اور رہ نمائی ہوگی تو دوسری طرف دہلی سلطنت کی توقیت کی ترتیب و تنظیم میں اس '' معاصر شاعرِ مورخ صفت'' کے حصہ اور دین کی قدر و قیمت کا اصل ادراک حاصل ہوگا۔

امیر خسرو کی پہلی تاریخی تصنیف مثنوی قران السعدین ہے۔ اس کا بنیادی موضوع سلطان دہلی معزالدین کیقباد کی اودھ میں دریائے سرجو کے کنارے اپنے والد اور سلطان لکھنوتی ناصرالدین محمود بغرا شاہ سے ملاقات کا بیان ہے مگر امیر خسرو نے اس چھوٹے سے واقعہ کو عہدِ کیقبادی کی توقیت مرتب کرنے کا ایک اہم ذریعہ بنا دیا ہے۔ اگرچہ امیر خسرو نے

خلافِ معمول صرف دو سنین کا ذکر کیا ہے اور ان میں بھی قطعی تاریخیں نہیں دی ہیں تاہم جہاں تک اس مثنوی کے کینوس کا تعلق ہے عہدِ کیقبادی کے بعض اہم واقعات کی تاریخیں ان کی مدد سے متعین کی جا سکتی ہیں۔ معاصرین یا نیم معاصرین میں امیر خسرو واحد تاریخ نگار ہیں جو کیقباد کا سنۂ جلوس ۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء بتاتے ہیں[7] جبکہ اس عہد کے عظیم ترین مورخ ضیاء الدین برنی کی تاریخِ فیروز شاہی میں وہ ۶۸۵ھ/ ۱۲۸۶ء ہے۔[8] اگرچہ امیر خسرو نے دن، تاریخ اور ماہ کا اس ضمن میں ذکر نہیں کیا ہے تاہم یہی سب سے زیادہ صحیح تاریخ ہے۔ اوّل اس لیے کہ کیقباد کی مدت حکومت پر مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ سہ سالہ اور چند ماہ تھی جو[9] ۶۸۹ھ/ ۱۲۹۰ء میں ختم ہو گئی تھی۔ دوم اس لیے کہ اسی تاریخ کو بعد کے تمام مورخین و تذکرہ نگارانِ دہلی سلطنت عصامی، سرہندی اور بدایونی وغیرہ نے قبول کیا ہے۔[10] اس مثنوی کے تمہید نگار سیّد حسن برنی کا قیاس، جو کہ مثنوی ہی میں مذکورہ تاریخوں پر مبنی ہے، صحیح ہے کہ معز الدین کی تخت نشینی ۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء کے اوائل میں ہوئی تھی۔[11] کیونکہ اسی صورت میں کیقباد کی مدتِ حکومت اور سنینِ جلوس و وفات میں تطبیق ممکن ہے۔

برنی کا بیان ہے کہ تخت نشینی کے بعد کیقباد عیش کوشی میں منہمک اور امورِ سلطنت سے غافل ہو گیا تو اس کے باپ ''سلطان ناصر الدین'' کو لکھنوتی میں اپنے فرزند کی حالت پر افسوس و اندیشہ ہوا اور اس نے فرزندِ سلطان کو نصیحت آمیز خطوط لکھے مگر ان کا عیش کوش سلطانِ دہلی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے فرزند سے بالمشافہ ملاقات اور نصیحت کا فیصلہ کیا اور فرزند کو اس سے آگاہ کیا۔ طرفین کی رضامندی سے طے پایا کہ ناصر الدین لکھنوتی سے اور کیقباد دہلی سے روانہ ہوں اور سرجو کے کنارے ملاقات ہو۔[12] لیکن امیر خسرو کا بیان ہے کہ سلطان ناصر الدین بغرا شاہ جو کہ حقیقتاً دہلی سلطنت کا وارث تھا اور لکھنوتی میں بادشاہ بن چکا تھا تختِ دہلی پر قبضہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا اور اودھ پر قابض ہو گیا۔ سلطانِ دہلی کو مہرِ پدری سے زیادہ تختِ حکومت عزیز تھا چنانچہ اس نے ایک فوج بھیجنے کا حکم دیا۔ وہ خود عیش کدۂ سلطانی کو چھوڑ کر'' ہلاکت کدۂ جنگ'' میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر ارکانِ دولت نے اس کو ساتھ جانے پر اپنے دلائل سے راضی کر لیا۔[13] برنی نے اس پورے واقعہ میں تو کیا بقیہ عہدِ کیقبادی کے ضمن میں کسی تاریخ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں امیر خسرو نے

متعدد مہینوں کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ قطعی تاریخیں نہیں ہیں مگر ان سے صرف اس پورے واقعہ کی توقیت کی جا سکتی ہے بلکہ بعض دوسرے واقعات کی تاریخوں کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔

امیر خسرو کا بیان ہے کہ اودھ/ مشرق کی طرف کوچ کی غرض سے کیقباد دہلی کے خانۂ دولت سے "پایانِ ذوالحجہ میں بروز دوشنبہ بوقتِ چاشت" روانہ ہوا اور سیری میں بڑھ کر قیام کیا۔(۱۴) ظاہر ہے کہ اس سے مراد ۶۸۶ھ کا ذی الحجہ ہے اور اس ماہ کا آخری دوشنبہ ۲۶ تاریخ کو پڑتا ہے۔ گویا دہلی سے کیقباد کی روانگی ۲ر فروری ۱۲۸۸ء کو ہوئی تھی۔ وہاں سے دوسری صبح یعنی سہ شنبہ ۲۷ر ذی الحجہ ۶۸۶ھ/ ۳ فروری ۱۲۸۸ء کو سلطان قصر کیلوگھڑی میں جا فروکش ہوا۔(۱۵) یہاں وہ ربیع الاوّل تک مقیم رہا۔(۱۶) یعنی اگلے سال ۶۸۷ھ کے تیسرے ماہ (۳ فروری تا ۱۵ر مئی ۱۲۸۸ء) تک۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم مرتب مثنوی قران السعدین اور سید حسن برنی کا خیال جو کہ امیر خسرو کی عینی شہادت پر مبنی ہے صحیح ہو سکتا ہے کہ سلطان کا اتنا طویل قیام محض لذت نگاہ و فردوس گوش کی خاطر تھا اور وہ عیشکدہ کی لذتوں کو چھوڑ کر جانے سے کسمسا رہا تھا۔(۱۷) مگر امیر خسرو ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سیاسی اور فوجی سبب سے بھی وہاں سکونت پذیر رہنے پر مجبور تھا اور وہ سبب یہ تھا کہ اسی دوران تمر کی قیادت میں منگولوں نے پنجاب پر حملہ کر دیا تھا اور سامانہ اور لاہور کے درمیانی علاقے میں بڑی تباہی پھیلائی تھی۔ سلطان نے ان کی سرکوبی کے لیے ملک شاہک کو تیس ہزار لشکرِ جرار کے ساتھ بھیجا تھا۔ ملک موصوف نے بالآخر حملہ آوروں کو شکست فاش دی اور متعدد منگول سرداروں اور سپاہیوں کو قید کر کے دربار سلطانی میں پیش کیا۔(۱۸) برنی نے اس واقعہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ بہرحال خسروی شہادت سے نہ صرف ایک تاریخی واقعہ کا مزید علم ہوتا ہے بلکہ اس کی توقیت بھی متعین کی جا سکتی ہے۔ نیم معاصرین میں کم از کم یحیٰ سرہندی سے اس کی تصدیق مزید ہو جاتی ہے۔(۱۹)

اس دوران جبکہ پت جھڑ کا موسم گزر چکا تھا اور گرمی شدید کی آمد آمد تھی کہ وسط ربیع الاول (یعنی وسط ربیع الاول ۶۸۷ھ/ اوائل مئی ۱۲۸۸ء) میں کیقباد مع اپنے لشکر کے شہر نو کیلوگھڑی سے روانہ ہوا(۲۰) اور کوچ کرتا ہوا غرۃ الکمال کی قطعی شہادت کے مطابق دو ماہ بعد(۲۱) یعنی وسط جمادی الاولیٰ ۶۸۷ھ/ اوائل جولائی ۱۲۸۸ء کو آبِ سرجو کے کنارے

جا خیمہ زن ہُوا۔ سفر میں سخت گرمی پڑ رہی تھی، ماتھے کا پسینہ ایڑی کو آتا تھا۔ اسی عالم گرما میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور جن تحائف کا تبادلہ ہوا ان میں موسمی پھل خربوزہ بھی شامل تھا۔[۲۲] سید حسن برنی کا خیال صحیح ہے کہ قران السعدین کے اصل واقعہ کی تاریخ جمادی الاولی ۶۸۷ھ کا وسط ہے۔[۲۳] اس کی بالواسطہ تصدیق خسرو کی مثنوی میں مختلف موسموں کی تفصیلی مدح سرائی سے بھی ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے موسموں کے مفصل بیان پر اتنا زور اس لیے نہیں دیا تھا کہ ان کے پاس بقول بعض ناقدین کے کہنے کو کچھ نہ تھا[۲۴] بلکہ وہ ان بیانات سے توقیت اور تاریخ کا کام لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ قران السعدین کے اصل نقطہ کے نہ صرف موسمی وقت کا ذکر کرتے ہیں بلکہ اس کی اصل ساعت اور زائچہ بھی دیتے ہیں جو فلکیات کے جاننے والوں کے لیے واقعاتی شہادت ہیں[۲۵] اور سرسری مطالعہ کنندگان کے لیے حشو زوائد۔

مثنوی قران السعدین کی داخلی شہادت کے مطابق کیقباد بغرا خاں سے ملاقات کے بعد جلد دہلی کے لیے روانہ ہوا جبکہ شدید برسات کے سبب ندی نالے چڑھے ہوئے تھے اور کیچڑ سے راستے پٹے پڑے تھے اور سواروں کے لیے کھانا اور جانوروں کے لیے چارہ کمیاب تھا۔[۲۶] گویا کہ وہ جولائی ۱۲۸۸ء کے وسط/ اوائل میں دہلی کے لیے واپس ہوا تھا اور قیاس کے مطابق دو ماہ بعد اوائل ستمبر ۱۲۸۸ء/ رجب ۶۸۷ھ کے وسط میں واپس دہلی آ گیا تھا۔ اعجاز خسروی میں ایک خط کے مطابق امیر خسرو نے اودھ سے جہاں وہ حاتم خاں گورنر اودھ کے چاکر و ندیم تھے دہلی میں اپنے ایک عزیز بھائی کو یکم رجب ۶۸۷ھ/ ستمبر ۱۲۸۸ء کو خط لکھا تھا جس میں اپنی فرقت کے اندوہ کو بیان کیا تھا۔[۲۷] قران السعدین کے مطابق خود امیر خسرو ذی قعدہ کے ماہ (ذی قعدہ ۶۸۷ھ/ ۲۷۔ نومبر۔ ۲۶/ دسمبر ۱۲۸۸ء) میں کسی وقت دہلی پہنچے اور اپنی آمد کے دو دن بعد کیقباد نے ان کو دربار میں طلب کیا، اپنے ندیمانِ خاص میں داخل کیا اور اس واقعہ کو منظوم کرنے کی فرمائش کی۔[۲۸] شاعر ندیم نے تین ماہ مسلسل قلم ریزی کر کے اور چھ ماہ میں اس کی تہذیب و ترتیب کی اور کل نو ماہ کی مدّت کے بعد بالآخر رمضان ۶۸۸ھ/ ۱۸ ستمبر۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۲۸۹ء میں اس کو سلطان کے ملاحظہ کے لیے پیش کر دیا۔[۲۹] مثنوی قران السعدین کے خاتمہ کے ساتھ عہدِ کیقبادی کی تاریخی

توقیت بھی ختم ہوتی نظر آتی ہے تاہم ایسا حقیقتاً نہیں ہے۔ امیر خسرو نے تاریخ دہلی سلطنت کے اس سرے کو اپنی دوسری مثنوی میں ٹھیک اسی جگہ پکڑ لیا ہے جہاں انھوں نے قران السعدین میں چھوڑا تھا۔

توقیت کے نقطۂ نظر سے مثنوی مفتاح الفتوح کا آغاز سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے تاریخ جلوس سے ہوتا ہے جو امیر خسرو کے مطابق سہ شنبہ ۳ ر جمادالآخر ۶۸۹ھ/ ۱۳ ر جون ۱۲۹۰ء کو ہوا تھا۔[۳۰] برنی نے اولین خلجی سلطان کی تخت نشینی کا صرف سنہ دیا ہے جو ۶۸۸ھ ہے اور اس کی کوئی قطعی تاریخ نہیں دی ہے۔[۳۱] امیر خسرو کی بیان کردہ تاریخ زیادہ صحیح ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ ایک معاصر مورخ اور سلطان ندیم کی بیان کردہ ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس کی تائید سکّوں کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔[۳۲] مفتاح الفتوح کا کینوس بہت چھوٹا ہے کیونکہ وہ عہد جلالی کے اوّلین برس کی فتوحات کے بیان تک محدود ہے۔ چنانچہ امیر خسرو نے اس مختصر مثنوی میں ملک چھجو کی بغاوت اور سرکوبی بجلانہ، بھوج پور اور بدایوں وغیرہ اقطاعات ہندوستان میں سلطانی فتوحات اور پھر فتح رنتھمبور اور اس کے ضمن میں بعض کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔

برنی ملک چھجو کی بغاوت کی کوئی حتمی تاریخ نہیں دیتا ہے بلکہ اس کا دوئم سال جلوس جلالی میں واقع ہونا بتاتا ہے[۳۳] جبکہ امیر خسرو نے اس کی حتمی تاریخیں دی ہیں۔ چنانچہ موخر الذکر کے مطابق جلالی سلطنت کو سب لوگوں نے تسلیم کر لیا تھا'' مگر میر کٹرہ چھجوئی بدعہد'' کے دماغ میں غرور سمایا اور اس نے ہندوستان کے چند بے دین سپاہیوں کے ساتھ مل کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان نے اس کی سرکوبی کے لیے پہلے اپنے فرزند شہزادہ ارکلک خان کو بطور ہراول روانہ کیا اور خود سہ شنبہ ۶ ر رمضان ۶۸۹ھ/ ۱۲ ستمبر ۱۲۹۰ء کو لشکرِ جرار کے ساتھ دہلی سے اس کے پیچھے روانہ ہوا۔[۳۴] شہزادہ کی فوج سے ملک چھجو کے دو معرکے ہوئے جن کی خاصی تفصیل امیر خسرو نے دی ہے[۳۵] لیکن انھوں نے حیرت کی بات ہے کہ ان دونوں معرکوں کی حتمی تاریخیں نہیں دی ہیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ یہ دونوں معرکے رمضان ہی میں کسی وقت پیش آئے تھے۔

ملک چھجو سے نبٹنے کے بعد سلطان نے بجلانہ، بھوج پور وغیرہ میں قیام کیا اور پھر

گنگا پار کر کے مشرقی علاقوں کے متمرد رایوں کی سرکوبی کی۔ اسی دوران شہزادہ ارکلی خان اس سے آملا اور اس کی عظیم کامیابیوں کے عوض اس کو ملتان کا اقطاع عطا کیا۔[۳۶] اس کے بعد سلطان نے ہندوستان کا رُخ کیا اور میتھی، روپال، مکھون اور کھترک وغیرہ متعدد مواسات کے متمردوں کی سرکوبی کی اور زبردست مالِ غنیمت حاصل کیا اور راناؤں اور رایوں پر واجب الادا رقوم وصول کیں۔[۳۷] اور بالآخر ایک ماہ کے سفر کے بعد وہ دوشنبہ آخر ماہ محرم ۶۹۰ھ / ۲ فروری ۱۲۹۱ء کو شہر دہلی میں واپس آگیا اور پورے ماہ صفر سیری میں دادِ عیش دیتا رہا۔[۳۸] بقول امیر خسرو اگلے ماہ نیا آئین و دستور ہوا اور وہ یہ کہ پنجشنبہ ۱۸ ربیع الاول ۶۹۰ھ / ۲۱ مارچ ۱۲۹۱ء کو سلطان نے دربار عام منعقد کیا اور امراؤ شہزادگان کو انعامات سے نوازا[۳۹] اور پھر اسی روز رنتھمبور کی مہم کے لیے روانہ ہوا۔ سیری، لہراوت، چنداول، ریواڑی اور نارنول ہوتا ہوا اور دو ہفتہ میں کوہستان طے کر کے حدودِ رنتھمبور میں پہنچا اور بالآخر جھائن میں مقیم ہوا۔ گردو نواح کے علاقوں کو تاراج کیا گیا اور بالآخر شدید جدّ و جہد کے بعد لشکرِ سلطانی نے جھائن پر قبضہ کیا اور قلعہ رنتھمبور کا محاصرہ کر لیا۔[۴۰] اس کے جنرل سینی پر فتح حاصل کی مگر رانا پہاڑوں میں فرار ہو گیا۔ اسی دوران مالوہ کے علاقے میں متعدد مہمیں بھیجی گئیں جو فتوحات سے سرشار واپس آئیں اور بالآخر سلطان رنتھمبور کا محاصرہ اٹھا کر شنبہ ۳ رجمادی الآخرہ ۶۹۰ھ / ۲ رجون ۱۲۹۱ء کو واپس دہلی پہنچ گیا۔[۴۱] امیر خسرو کی توقیت کے لحاظ سے ان مہموں میں کل دو ماہ چودہ روز لگے۔ برنی نے حسبِ معمول سلطان کی مہم رنتھمبور کی کوئی حتمی تاریخ نہیں دی بلکہ اس کو ۶۸۹ھ میں ہونا بتایا ہے[۴۲] اور ظاہر ہے کہ یہ تاریخ صحیح نہیں ہے۔ امیر خسرو نے اگرچہ سیدی مولا کی سازش اور قتل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ وہ ان کی فتوحات کے بیان کے دائرے کے باہر تھا تاہم مفتاح الفتوح میں ان کی بیان کردہ تاریخوں کی مدد سے اس واقعہ ہائلہ کی توقیت کی جا سکتی ہے۔ تقریباً تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ سیّدی مولا کا واقعہ ملک چھجو کی بغاوت کے بعد مگر رنتھمبور کی مہم کے لیے سلطان کی روانگی سے قبل پیش آیا تھا۔ گویا کہ وہ ۲ رفروری اور ۲۱ رمارچ ۱۲۹۱ء کے درمیانی زمانے کا واقعہ ہے۔[۴۳] اس توقیت سے برنی کے اس تاثر کی کہ سیّدی مولا کے قتل سے سلطنت جلالی کا استحکام جاتا رہا تھا قلعی کھل جاتی ہے کیونکہ اس کے معاً بعد ہم سلطان جلال الدین خلجی کو رنتھمبور میں برسرِ پیکار پاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ

اس کے تقریباً چار سال بعد تک وہ پورے استحکام کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔[۴۴] بہرحال مہم رنتھمبور سے سلطان کی بسلامت واپسی کے ذکر پر اس مثنوی کا اختتام ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے اس مثنوی کو ۲۰ رجمادی الآخر ۶۹۰ھ / ۲۰ رجون ۱۲۹۱ء کو مکمل کر کے بارگاہِ سلطانی میں پیش کر دیا تھا۔[۴۵] ایک لحاظ سے یہ جلالی عہد کے پہلے سال کے اہم ترین واقعات کا ایک سرکاری تاریخی ریکارڈ ہے۔ امیر خسرو کی واحد تاریخی تصنیف اگر سچ پوچھئے تو خزائن الفتوح ہے جو نثر میں لکھی گئی ہے اور عہد علائی (۱۲۹۶۔۱۳۱۶ء) کے اہم ترین واقعات کا ایک عظیم مرقع ہے۔ چونکہ اصلاً اس کتاب کا مرکزی موضوع علاء الدین خلجی کی فتوحات ہیں اس لیے امیر خسرو نے آغازِ کلا علاء الدین خلجی کی اولین مہم دیوگیر سے کیا ہے، اگرچہ وہ توقیت تاریخی کے لحاظ سے عہدِ جلالی کا ایک واقعہ ہے۔ بہر کیف اس کے مطابق علاء الدین خلجی کا لشکر کٹرہ سے شنبہ ۱۹ رربیع الآخر ۶۹۵ھ / ۲۵ رفروری ۱۲۹۶ء کو روانہ ہُوا۔ اور عظیم الشان فتح حاصل کر کے جمعہ ۲۸ ررجب ۶۹۵ھ / یکم جون ۱۲۹۶ء کو واپس کٹرہ پہنچ گیا۔[۴۶] اس معاصرانہ شہادت کے مطابق دلیرانہ مہم میں کل تین ماہ دس دن کی مختصر مدت لگی تھی جس میں سے پچیس دن کا عرصہ اس نے دیوگیر میں گزارا تھا اور بقیہ دو ماہ پندرہ دن آمد و رفت کے سفر میں، مگر اس کے برعکس برنی نے اس مہم کو ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء کا واقعہ بتایا ہے اور نہ اس کی قطعی تاریخیں دی ہیں اور نہ اس کی مدت کا کوئی حوالہ دیا ہے۔[۴۷] اس کے بعد امیر خسرو نے جلال الدین خلجی کے قتل سے گریز کرتے ہوئے علاء الدین خلجی کی کٹرہ میں پہلی تخت نشینی کی تاریخ چہار شنبہ ۱۶ ررمضان ۶۹۵ھ / ۱۸ رجولائی ۱۲۹۶ء دی ہے۔[۴۸] جبکہ برنی نے قتل جلال الدین خلجی کی تاریخ اور علاء الدین خلجی کے جلوس کو در شہور ۶۹۵ھ ہونا بتایا ہے۔[۴۹] برنی نے اسی طرح دہلی میں علاء الدین خلجی کی آمد اور اس کے دوسرے جلوس کو ۶۹۵ھ کے آخر سال کا واقعہ قرار دیا ہے[۵۰] حالانکہ اپنے ایک اور بیان میں اس نے کٹرہ سے دہلی آمد کی مدتِ سفر پانچ ماہ بتائی ہے۔[۵۱] برنی کے ان بیانات سے توقیت کا معاملہ سخت الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر امیر خسرو نے نئے سلطان کی دہلی آمد اور دُوسری تاجپوشی کی قطعی تاریخ دوشنبہ ۲۲ رذی الحجہ ۶۹۵ھ[۵۲] / ۲۰ راکتوبر ۱۲۹۶ء دے کر الجھن قطعی طور سے دور کر دی ہے۔

خزائن الفتوح میں اس کے بعد علاء الدین خلجی کے بعض انتظامی اور تہذیبی کارنامے

بیان کیے گئے ہیں۔ان میں علاء الدین خلجی کی تقسیم دولت کی پالیسی، اصلاح اوزان اور نظامِ عدل، شراب خوری اور زنا کاری کی روک تھام اور اباحتیوں کا خاتمہ، غلّہ اور دوسری اشیائے ضرورت کی ارزانی کا منصوبہ، بعض مقدس عمارت جیسے مسجد جامع حضرت اور مینار کے علاوہ شہر کے عظیم قلعہ اور فصیل ثانی اور دوسرے قلعوں، عمارتوں، حوضوں وغیرہ کی تعمیر شامل ہیں۔(۵۳) دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام انتظامی اور تہذیبی کارناموں کی تاریخیں امیر خسرو نے قطعی نہیں دی ہیں۔اس کے بعد امیر خسرو نے منگول حملوں کی طرف گریز کیا ہے اور ان میں سے صرف تین منگول حملوں —— پنجاب پر کدر کا حملہ، دوآب اور اودھ پر علی بیگ، ترتاق اور طرغی کا حملہ اور پنجاب وراجپوتانے پر کبک، اقبال مند اور تابو کا حملہ —— کا ذکر کیا اور ان میں سے دو کی تاریخیں معہ دن کے دی ہیں۔ چنانچہ کدر پر علائی لشکر نے جارن منجور کے میدان میں پنجشنبہ ۲۲ر ربیع الآخرہ ۶۹۵ھ/ ۶ فروری ۱۲۹۸ء میں،(۵۴) علی بیگ اور ترتاق پر امروہہ کے قرب میں پنجشنبہ ۱۲ جمادی الآخرہ ۷۰۵ھ/ ۳۰ر دسمبر ۱۳۰۵ء کو(۵۵) اور آخری منگول لشکر پر پنجاب وراجپوتانے کے میدانوں میں دوسرے برس کسی وقت شکست دی تھی۔(۵۶) امیر خسرو نے خزائن میں ۱۲۹۹ء میں سیوستان پر سلدی اور دہلی پر قتلغ خواجہ اور پھر ۱۳۰۳ء میں دہلی ہی پر طرغی کے حملوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔(۵۷) اگرچہ قتلغ خواجہ اور طرغی کے حملوں کی طرف انھوں نے دولرانی خضر خاں میں معمولی سا اشارہ کیا ہے لیکن وہاں بھی اس کی تاریخ نہیں دی ہے۔(۵۸) اس سے زیادہ حیرت انگیز ان منگول حملوں کی وہ توقیت ہے جو معاصر مورخ برنی نے دی ہے۔وہ کسی حملہ یا فتح کی قطعی تاریخ نہیں دیتا۔ بلکہ بسا اوقات تو ایک عام قاری کے لیے یہ پتا لگانا دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سا منگول حملہ کس سنہ میں ہوا تھا! لیکن برنی نے ان حملوں کو توقیتی ترتیب سے بیان کیا ہے جبکہ امیر خسرو نے ایک جگہ تینوں حملوں کا ذکر کیا ہے۔بیان کے دونوں طریقوں کے اپنے اپنے فوائد ہیں۔فوجی نقطۂ نظر سے سب سے اچھا بیان ان منگول حملوں کا عصامی کی فتوح السلاطین میں ملتا ہے۔

امیر خسرو نے اس کے بعد گجرات، راجپوتانہ اور مالوہ میں علائی فتوحات کا ذکر توقیتی ترتیب سے کیا ہے اور درمیان میں دیوگیر کی مہم ثانی کا بھی ذکر غالباً توقیت ہی کے خیال سے لے آئے ہیں۔خزائن الفتوح کے مطابق چہارشنبہ ۲۰ر جمادی اولاولی ۶۹۸ھ/

۲۳/فروری ۱۲۹۹ء کو گجرات کی فتح کے لیے علائی لشکر روانہ ہوا۔(۵۹) اور اسی سال شعبان/مئی میں انہل واڑہ، سومنات، کھنبایت وغیرہ کئی شہروں پر قبضہ کیا گیا۔(۶۰) دوسری فتوحات نیز دوسرے مسائل کے حل کی خاطر علائی لشکر کا گجرات میں قیام رجب تا ذوالقعدہ ۶۹۸ھ/ اپریل تا اگست ۱۲۹۹ء رہا۔(۶۱) گویا کہ چھ ساڑھے چھ ہفتے دہلی سے گجرات تک کے جانے کے سفر میں لگے تھے اور پانچ ماہ کی مدت فتوحات کے حصول میں اور پھر اتنے ہی عرصے میں لشکر کی واپسی دہلی ہوئی ہوگی کہ اس کا ذکر امیر خسرو نے نہیں کیا ہے۔ بہر حال ۶۹۹ھ کے آغاز میں اور اکتوبر ۱۲۹۹ء میں کسی وقت سلطانی لشکر دہلی واپس آ گیا تھا۔ گویا کہ اس مہم میں کل آٹھ ساڑھے آٹھ ماہ کا عرصہ لگا تھا۔ برنی نے گجرات کی مہم کو تیسرے سال جلوس علائی کا واقعہ بتایا ہے اور اس کی کوئی بھی مزید تاریخ نہیں دی ہے۔(۶۲)

راجپوتانے کی جن مہموں کی توقیتی تاریخیں خزائن میں مذکور ہوئی ہیں ان میں سے فتح رنتھمبور کی تاریخ سہ شنبہ ۳/ذوالقعدہ ۷۰۰ھ/۱۱جولائی ۱۳۰۱ء دی گئی ہے(۶۳) اور کسی دوسری تاریخ کا ذکر نہیں ہے جبکہ قلعۂ چتوڑ کے لیے سلطانی لشکر کی روانگی کی تاریخ سہ شنبہ ۸/جمادی الآخر ۷۰۲ھ/۲۸/جنوری ۱۳۰۳ء اور اس کی فتح کی تاریخ سہ شنبہ ۱۱/محرم ۷۰۳ھ/۲۶اگست ۱۳۰۳ء دی گئی ہے(۶۴) مگر سلطانی لشکر کی واپسی کی تاریخ نہیں ضروری سمجھی گئی۔ مالوہ کی فتوحات میں قلعۂ مانڈو کی فتح کی تاریخ پنجشنبہ ۵/جمادی الآخر ۷۰۵ھ/ ۲۳/نومبر ۱۳۰۵ء ہے۔(۶۵) اس کے بعد امیر خسرو نے دیوگیر کی دوسری مہم بیان کی ہے کہ شنبہ ۱۹/رمضان ۷۰۶ھ/ ۲۴/مارچ ۱۳۰۷ء کو سلطانی لشکر دیوگیر میں پہنچا تھا اور غالباً یہی مہم ثانی/ فتح کی تاریخ بھی تھی۔(۶۶) پروفیسر حبیب مرحوم نے اپنے ترجمہ میں اس کو دہلی سے سلطانی لشکر کی روانگی کی تاریخ قرار دیا ہے۔(۶۷) بہر حال امیر خسرو نے بقیہ دکنی مہموں اور فتوحات کی مانند دیوگیر کی مہم کی آمد و رفت کی نہ تاریخیں دی ہیں اور نہ کل مدت مہم۔ نہ سپہر کی ایک شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام حالات میں دہلی سے دیوگیر کی مسافت ایک لشکر کے لیے دو ماہ کی مدت تھی۔(۶۸) اسی کی تائید علاء الدین خلجی کی اولین مہم دیوگیر سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تین سو فرسنگ کی مسافت کا سفر وسط رجب/جنوری میں شروع ہوا ہوگا اور دہلی میں واپسی اوائل ذی الحجہ/ جون میں ہوئی ہوگی۔ اس سفر میں دیوگیر

کے حکمراں رام دیو کو بھی گرفتار کر کے دہلی لایا گیا تھا مگر سلطان نے ازراہِ کرم وحکمتِ عملی اس کو نہ صرف رہا کر دیا بلکہ اس کو اس کی سلطنت بھی واپس کر دی تھی اور چھ ماہ شاہی مہمان رکھ کر دیوگیر بصد عزت واحترام واپس بھیجا تھا جس کا ذکر خسرو نے تفصیل سے کیا ہے (۶۹) اس لیے اس کی واپسی جمادی الاولی ۷۰۷ھ/ جنوری ۱۳۰۸ء میں ہوئی ہوگی۔ اس کے برعکس امیر خسرو نے اگلی فتح سیوانا کے سلسلہ میں سلطانی لشکر کی روانگی اور فتح قلعۂ سیوانا دونوں کی تاریخیں دی ہیں جو بالترتیب چہار شنبہ ۱۳ر محرم ۷۰۸ھ/ ۳ر جولائی ۱۳۰۸ء اور سہ شنبہ ۲۳ر ربیع الاول ۷۰۸ھ/ ۱۰ر ستمبر ۱۳۰۸ء ہیں۔ (۷۰) برنی نے دیوگیر کی دوئم مہم کو ۷۰۶ھ/ ۱۳۰۷ء کا واقعہ بیان کیا ہے لیکن اس کی قطعی تاریخ نہیں دی (۷۱) ہے جبکہ سیوانا کی مہم کا وہ سرے سے ذکر نہیں کرتا ہے۔ پروفیسر کے، ایس، لال نے دیوگیر کی مہم ثانی کے ضمن میں برنی کی تاریخ کو امیر خسرو کی بیان کردہ تاریخ پر جو ترجیح دی ہے اور اس کے لیے جو دلیل دی ہے وہ صحیح نہیں ہے (۷۲)۔ حیرت کی بات ہے کہ فتح سیوانا کے لیے اُنھوں نے دوجگہ دو الگ الگ تاریخیں بیان کی ہیں، (۷۳) حالانکہ ان کی دلیل کی ساری عمارت اسی تاریخ پر مبنی ہے۔

امیر خسرو نے عہد علائی کی بقیہ تین دکنی مہموں کے لیے جتنی تاریخیں خزائن میں بیان کی ہیں اتنی کسی اور مہم یا فتح کے لیے نہیں بیان کی ہیں۔ توقیت کے نقطۂ نظر سے ان مہموں کا بیان بے انتہا قیمتی ہے کہ اس میں شاعر مورخ صفت نے لمحہ لمحہ کا حساب رکھا ہے اور اس سے زیادہ اہم یہ کہ وہ توقیتی حساب کے بالکل مطابق ہے۔ اسی لیے بعض مورخین کا خیال ہے کہ امیر خسرو ان مہموں میں لشکر سلطانی کے ہمرکاب رہے تھے۔ ترتیب کے لحاظ سے اول مہم وارنگل کی تھی جو دہلی سے ۲۵ر جمادی الاولی ۷۰۹ھ/ ۳۱ر اکتوبر ۱۳۰۹ء کو روانہ ہوئی (۷۴) ـــــ ۴ جمادی الآخرہ/ ۹ نومبر کو مسعود پور پہنچی، وہاں دو روزہ قیام کے بعد ۶ر جمادی الآخرہ/ ۱۱ر نومبر کو اگلے پڑاؤ کے لیے روانہ ہوئی۔ (۷۵) ۱۵ر جمادی الآخرہ/ ۲۱ نومبر کو ایرج پور (سلطان پور) پہنچی۔ چار روز قیام کے بعد ۱۹/ ۲۵ کو روانہ ہوئی اور تیرہ دن کے سفر کے بعد یکم رجب/ ۵ر دسمبر کو کھنڈا میں آمد ہوئی جہاں شبِ برات تک قیام رہا اور تیوہار منایا گیا اور اس کی دوسری صبح روانگی ہوئی اور آٹھ روز کے کوچ کے بعد نیلکنٹھ پہنچی۔ یہ سلطنت دیوگیر کی سرحد میں تھا اس لیے لشکر سلطانی کی رائے دیوگیر نے خوب خاطر

دتواضع کی۔ سہ شنبہ ۲۶ر رجب ۷۰۹ھ/ ۳۰ر دسمبر ۱۳۰۹ء سے پھر روانگی ہوئی اور سولہ دن کے کوچ در کوچ کے بعد بالآخر تلنگانہ کی حدود شروع ہوئی۔ بیجا گڑھ سے بڑھ کر سر بر (سر بور) کا محاصرہ کرلیا گیا۔ آخر کار وہ فتح ہوا اور شنبہ ۱۰ر شعبان/ ۱۳ر جنوری ۱۳۱۰ کو وہاں سے پھر خیمے اکھاڑ دیئے گئے۔ ۱۴ر شعبان/ ۱۷ر جنوری کو فوج نے کنوربل (کونربل) میں پہنچ کر قیام کیا۔ دوسرے دن وہاں سے کوچ کر کے آنمکنده میں قیام کیا اور اسی دن سے قلعہ وارنگل کا محاصرہ شروع ہوا جو منگل ۱۱ر رمضان/ ۱۲ر فروری تک جاری رہا۔ اس رات قلعہ کے بیرونی حصار گلبن پر حملہ شروع ہوا اور دو دن تک جاری رہا آخر کار ۱۵ر رمضان کو اس پر قبضہ ہوگیا اور اندرونی حصار سنگین کا محاصرہ شروع ہوا۔ محاصرہ نے جب طول کھینچا اور رائے پرتاپ رودر دیو کو قلعہ کے فتح ہو جانے کا خدشہ پیدا ہوا تو اس نے مالِ کثیر دے کر صلح کرلی اور بالآخر کار ۱۶ر شوال ۷۰۹ھ/ ۱۹ر مارچ ۱۳۱۰ء کو لشکر سلطانی دہلی کے لیے وارنگل سے روانہ ہوا اور دو ماہ بائیس دن کے سفر کے بعد ۱۱ر محرم ۷۱۰ھ/ ۱۰ر جون ۱۳۱۰ء کو خدمتِ سلطانی میں پہنچ گیا۔ سہ شنبہ ۲۴ر محرم ۷۱۰ھ/ ۲۳ر جون ۱۳۱۰ء کو سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے فاتح جنرل اور لشکر کے اعزاز واکرام کے لیے چبوترۂ ناصری میں بارِ عام منعقد کیا۔(۷۶) اس طرح امیر خسرو کے بیان کے مطابق کل مدت جو اس مہم میں لگی وہ سات ماہ دس یوم تھی۔ اس کے برعکس برنی نے صرف دو تاریخیں بیان کی ہیں کہ ۷۰۹ھ میں لشکر وارنگل روانہ ہوا اور ''اوائل شہور ۷۱۰ھ'' میں وہ غنائم سمیت وارنگل سے واپس ہوا۔(۷۷)

اسی طرح دوار سمدر کی مہم کی دہلی سے روانگی، منزل بمنزل قیام، رائے دوار سمدر کی صلح وغیرہ کی متعدد تاریخیں امیر خسرو نے بیان کی ہیں۔ چنانچہ دہلی سے مہم کی روانگی سہ شنبہ ۲۴ر جمادی الآخرہ ۷۱۰ھ/ ۲۰ر نومبر ۱۳۱۰ء کو ہوئی۔ اسی دن تنکل میں آمد ہوئی جہاں چودہ دن عرض لشکر کے واسطے قیام رہا۔ ۹ر رجب/ ۲ر دسمبر کو وہاں سے کوچ ہوا اور اکیس دن کے سفر کے بعد لشکر کیتھوں پہنچا وہاں سے سترہ دن کے بعد کھر گانو۔ اس منزل عرصہ محشر نما پر بیس دن قیام رہا۔ جمعہ ۷ر رمضان ۷۱۰ھ/ ۲۸ر جنوری ۱۳۱۱ء کو کھر گانو سے بسرعت تمام روانہ ہوا اور پنجشنبہ ۱۳ر رمضان/ ۳ر فروری کو اس نے دیوگیر میں ڈیرے ڈالے۔ وہاں سہ روزہ قیام کے بعد سہ شنبہ ۱۷ر رمضان/ ۷ر فروری کو پھر کوچ کیا اور پانچ کوچ کے بعد

پرس دیودلوی کے خراب آباد باندری پہنچا۔ یک شنبہ ۲۳ رمضان/ ۱۳ فروری کو باندری سے روانگی ہوئی اور بارہ دن کے مسلسل سفر کے بعد پنجشنبہ ۵ شوال ۷۱۰ھ/ ۲۵ فروری ۱۳۱۱ء کو دوارسمدر کے قلعہ کے سامنے جا پہنچا اور فوراً اس کا محاصرہ شروع ہوا۔ لیکن بلال دیو نے دوسرے دن جمعہ ۶ شوال/ ۲۶ فروری ۱۳۱۱ء کو صلح کر لی۔ بارہ روز قلعہ دوارسمدر میں سلطانی لشکر کا قیام رہا اور پھر اگلی مہم معبر کے لیے مزید جنوب میں روانگی ہوئی۔(۷۸)

چہار شنبہ ۱۸ شوال ۷۱۰ھ/ ۱۰ مارچ ۱۳۱۱ء کو سلطانی لشکر دوارسمدر سے معبر کے لیے روانہ ہوا اور پانچ روز کے سفر کے بعد وہ ولایت معبر کی حدود میں تھا۔ وہ مردی (مدورا) اور کاویری کے کنارے خیمہ زن ہوتا ہوا پنجشنبہ ۵ ذی القعدہ ۷۱۰ھ/ ۲۶ مارچ ۱۳۱۱ء کو بیردھول پہنچا۔ یہاں سے فوج کا ایک حصہ مفرور راجہ ویرپانڈیہ کا مسلسل تعاقب کرتا رہا اور کیم، کندور، جال کوٹہ، برمت اور دوسرے مقامات پر بعض اوقات دو دو بار تاخت کرتا رہا حتی کہ ۱۳ ذی القعدہ ۷۱۰ھ/ ۳ اپریل ۱۳۱۱ء بروز یک شنبہ واپس بیردھول آ کر اصل لشکر سلطانی سے مل گیا۔ پھر لشکرِ سلطانی حرکت میں آیا اور ۱۷ ذی القعدہ/ ۷ اپریل کو شہر کنم میں خیمہ زن ہوا۔ وہاں سے پانچ دن بعد (۲۲ ذوالقعدہ/ ۱۲ اپریل کو) شہر متھرہ میں نزول کیا جو کہ رائے کے بھائی سندر پانڈیہ کا صدر مقام تھا وہاں غنائم کو مرتب کر کے اور مزید فوجی کارروائی کو غیر ضروری سمجھ کو دہلی واپسی کا فیصلہ کیا گیا اور یک شنبہ ۴ ذوالحجہ ۷۱۰ھ/ ۲۴ اپریل ۱۳۱۱ء کو لشکر سلطانی نے دہلی کے راستے پر گامزن تھا اور موسمی سرد و گرم چکھتا، مصائب جھیلتا اور کوچ پر کوچ کرتا دوشنبہ ۴ جمادی الآخرہ ۷۱۱ھ/ ۱۸ اکتوبر ۱۳۱۱ء کو دارالسلطنت دہلی پہنچ گیا اور اسی روز سلطان علاء الدین خلجی نے بارعام منعقد کر کے فاتحین کی تکریم کی۔(۷۹) اسی آخری مہم دکن کے بیان پر خزائن الفتوح کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دکن کی اس دہری مہم میں امیر خسرو کے مطابق کل دس ماہ چار دن کی اور دوسری روایت کے مطابق دس ماہ چودہ دن کی مدت لگی تھی۔ امیر خسرو کی مفصل توقیت کے مقابلے برنی کا یہ بیان کہ ''آخر شہور ۷۱۰ھ'' میں دہری مہم روانہ ہوئی اور ''اوائل شہور ۷۱۱ھ'' میں واپس دہلی آ گئی کس قدر مختصر اور تشنہ لگتا ہے۔ اگر چہ خزائن الفتوح تمام علائی فتوحات کو بیان کرتی ہے اور نہ ان کی توقیت کو تاہم اہم ترین فتوحات بالخصوص تین دکنی مہمات کے بیان اور توقیت کے لیے

ناگزیر ماخذ ہے۔

عہد علائی سے متعلق امیر خسرو کی ایک تاریخی مثنوی "دولرانی خضر خاں" ہے جس کا اصل موضوع علاء الدین خلجی کے فرزند اکبر خضر خاں اور گجرات کے بگھیلا رائے کرن کی سب سے چھوٹی دختر دولدی کے درمیان معاشقہ اور پایان کار شادی کی رومانی کہانی ہے۔ توقیت کے نقطۂ نظر سے اس میں بھی کافی اہم مواد ہے، خاص کر عہد علائی سے متعلق کیونکہ وہ ایک معاصر تصنیف ہے۔ علاء الدین خلجی کے کڑہ مانکپور میں جلوس اول اور دہلی پر قبضہ اور جلوس دوئم کی بالکل وہی تاریخیں دی ہیں جو اس سے پہلے امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں بیان کی تھیں۔(۸۱) اس طرح وہ مزید تصدیق وتوثیق فراہم کرتی ہیں۔ امیر خسرو نے عہد علائی میں گجرات کی فتح کے بارے میں ایک اہم ترین اور نئی شہادت یہ فراہم کی ہے کہ گجرات پر دو حملے ہوئے تھے۔

اوّل بار ۶۹۸ھ/ ۱۲۹۹ء میں: جس کا ذکر تقریباً تمام دہلی سلطنت کے معاصر و نیم معاصر مورخین نے کیا ہے اور جس کو امیر خسرو نے بھی خزائن الفتوح میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

دوسری بار ۷۰۶ھ/ ۱۳۰۷ء میں جبکہ ملک کافور کی کمان میں دیوگیر کی دوسری مہم کے لیے ایک فوج بھیجی گئی تھی۔ اس موقع پر الپ خاں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ گجرات کی مہم سر کر کے دیوگیر جانے والے لشکر سے آملے۔ اگرچہ امیر خسرو نے ان دونوں حملوں کی قطعی تاریخیں نہیں دی ہیں تاہم ان کے بیانات کی داخلی شہادتوں سے کم از کم ان کے سنین حتمی طور سے متعین کیے جاسکتے ہیں۔(۸۲) اس موضوع پر میں دلائل اور بحث کہیں اور پیش کر چکا ہوں۔(۸۳)

دولرانی خضر خاں میں عہد علائی سے متعلق چند اور اہم تاریخیں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک خضر خاں کی الپ خاں کی دختر سے نکاح اور شادی/ رخصتی کی تاریخیں ہیں۔ نکاح کی تاریخ ۲۳ رمضان ۷۱۱ھ/ ۲ فروری ۱۳۱۲ء دی گئی ہے اور رخصتی کی تاریخ یکم ذی الحجہ ۷۱۱ھ/ ۹ اپریل ۱۳۱۲ء بیان کی گئی ہے۔(۸۴) گویا کہ آخری دکنی مہم کی کامیاب واپسی کے تین ماہ انیس دن بعد نکاح ہوا اور اس کے دو ماہ سات دن بعد رخصتی۔ دلچسپ بات یہ

ہے کہ شہزادہ خضر خاں کی دولرانی سے جو اس مثنوی کی اصل ہیروئن ہے شادی کی تاریخ امیر خسرو نے نہیں بیان کی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ جب شہزادے نے اس قصہ کو نظم کرنے کی فرمائش کی تھی تو وہ قصہ ہجر و فراق تھا۔ یہ المیہ طربیہ بعد میں بنا تھا اور چونکہ دولرانی سے شہزادے کی شادی یا بعد کے واقعات اصل قصہ کے حصے نہ تھے اس لیے شاعر نے ان کی توقیت پر زیادہ دھیان نہیں دیا کیونکہ شاعر کا اصل مطمحِ نظر رومانی قصہ کا بیان تھا نہ کہ تاریخی واقعات کی کھتونی۔ بہر حال تاریخی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم ایک اور تاریخ ہے جو معاصرین میں صرف امیر خسرو نے دی ہے۔ اور وہ ہے علاء الدین خلجی کی تاریخِ وفات۔ دولرانی خضر خاں کے مطابق ۷رشوال ۷۱۵ھ/ ۴رجنوری ۱۳۱۶ء کو سلطان نے انتقال کیا تھا۔[۸۵] ضیاء الدین برنی نے سلطان کے انتقال کی تاریخ نہیں دی ہے بلکہ اس کی تدفین ''شب ششم شوال آخر شب'' میں بتائی ہے لیکن سنہ نہیں دیا ہے۔[۸۶] امیر خسرو کے دیوان بقیہ نقیہ میں سلطان کی تاریخ وفات ۸رشوال ۷۱۵ھ/ ۵رجنوری ۱۳۱۶ء مذکورہ بتائی جاتی ہے۔ لیکن وہ دراصل تاریخ تدفین معلوم ہوتی ہے۔[۸۷] ۷ شوال ۷۱۵ھ کی تصدیق یحییٰ سرہندی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔[۸۸] امیر خسرو نے آخری تاریخ اپنی اس مثنوی کی تکمیل کی دی ہے جو ۶رذی قعدہ ۷۱۵ھ/ ۴رفروری ۱۳۱۶ء ہے۔[۸۹] گویا کہ اصل مثنوی علاء الدین خلجی کی وفات کے ٹھیک ایک ماہ بعد مکمل ہوگئی تھی۔ اس کے کچھ اشعار جن کا تعلق خضر خاں کے قتل وغیرہ سے ہے ۷۱۸ھ/ ۱۳۱۸ء میں کسی وقت لکھے گئے تھے۔[۹۰] دولرانی خضر خاں سے عہد علائی کے علاوہ اس کے متصلاً بعد کے زمانے کی بھی توقیت کی جاسکتی ہے، چنانچہ خضر خاں اور شادی خاں وغیرہ کے اندھا کیے جانے، ملک کافور کے تختِ شاہی پر قابض ہونے اور سلطان شہاب الدین عمر خلجی کی مختصر مدتِ حکومت متعین کرنے میں اس سے خاصی مدد ملتی ہے۔ اس مثنوی کے وہ حصے جو علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد کے واقعات سے لکھے گئے تھے دراصل عہد نیابت کافوری اور عہدِ سلطنت قطبی کے واقعات کے دیباچہ کے طور پر بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں اور یہ حصہ دہلی سلطنت کی توقیت کے تسلسل کو امیر خسرو کی دوسری مثنوی نہ سپہر سے جوڑ دیتا ہے۔

دوسرے مآخذ سے ثابت ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد صرف پینتیس دن تک ملک کافور کی نیابت کا زمانہ رہا۔[۹۱] گویا کہ اس کی فرمانروائی ۱۲رذی قعدہ ۷۱۵ھ/

۱۱رفروری ۱۳۱۶ء کو ختم ہوگئی۔ اس کے بعد دو ماہ تک قطب الدین اپنے چھوٹے بھائی کا نائب رہا یعنی ۱۲رمحرم ۷۱۶ھ/۱۱راپریل تک۔ اور اس کے بعد قطب الدین مابرک شاہ خود تخت نشین ہوگیا۔ برنی نے علاء الدین خلجی کی موت کے بعد کے زمانے کے واقعات کی تاریخیں نہیں دی ہیں اور قطب الدین کی تخت نشینی کو ۷۱۷ھ میں بتایا ہے۔(۹۲) مگر موخر الذکر تاریخ بالکل غلط ہے۔ امیر خسرو نے نہ سپہر میں اس کی تخت نشینی کی قطعی تاریخ ۲۴رمحرم ۷۱۶ھ/۱۸راپریل ۱۳۱۶ء دینے کے علاوہ اس کی ساعت اور زائچہ بھی دیا ہے۔(۹۳) یہ تاریخ برنی کی مذکورہ بالا دنوں کی تعداد کی شہادت سے بھی صحیح ثابت ہوتی ہے اور مزید تصدیق سکّوں کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ یحیٰ سرہندی کی بیان کردہ ۲۰رمحرم ۷۱۶ھ تاریخ جلوس(۹۴) امیر خسرو کے مقابلے میں قابل قبول نہیں ہے اور کے ایس لال نے اس کو غلط ترجیح دی ہے۔(۹۵) اسی طرح کے ایس لال نے قطب الدین خلجی کے قتل کی تاریخ یحیٰ سرہندی سے لی ہے جو ۵رربیع الاول ۷۲۰ھ/۲۶راپریل ۱۳۲۰ء ہے(۹۶) اور اس کو امیر خسرو کی بیان کردہ تاریخ یکم جمادی الثانیہ ۷۲۰ھ/ جولائی ۱۳۲۰ء پر ترجیح دی ہے۔(۹۷) مورخ موصوف کی وجہ ترجیح صحیح نہیں ہے کیونکہ تقریباً تمام معاصر مورخین اور تذکروں کا اتفاق ہے کہ سلطان کا قتل چاند کی پہلی رات کو ہوا تھا۔ تغلق نامہ کی قطعی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر الدین خسرو خاں کی کل مدّتِ حکومت صرف دو ماہ رہی تھی یعنی ار جمادی الآخرہ ۷۲۰ھ/ جولائی ۱۳۲۰ء تا ۳۰ررجب ۷۲۰ھ/۵رستمبر ۱۳۲۰ء تک۔ جمعہ ۳۰ررجب ۷۲۰ھ کو تغلق شاہ نے خسرو خاں کے لشکر کو آخری ہزیمت دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا تھا اور دوسرے دن یکم شعبان ۷۲۰ھ/۶رستمبر ۱۳۲۰ء کو غازی ملک سلطان غیاث الدین تغلق شاہ کے لقب سے مسندِ حکومت پر رونق افروز ہوا تھا۔(۹۸) تغلق خاندان کی حکومت کے آغاز پر ہی تغلق نامہ کا خاتمہ ہوتا ہے۔

امیر خسرو اگرچہ اپنے پیشہ اور طبع و مزاج کے اعتبار سے مورخ نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے دہلی سلطنت کی کوئی مسلسل اور مربوط تاریخ لکھی تاہم ان میں تاریخی شعور کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ وہ اصلاً شاعر تھے اور تصوف کے خمخانہ کے ایک ساقی و سرمست بھی۔ لیکن بایں ہمہ وہ ایک درباری اور سلطنت کے امیر و عہدہ دار تھے۔ ان کی اسی درباری اور

منصبی حیثیت نے ان کو تاریخی واقعات کو جانچنا پرکھنا اور پھر نظم کرنا سکھایا تھا چونکہ وہ تاریخی واقعات کو نظم کر رہے تھے اور ان میں سے بہت سے واقعات کے وہ عملاً شاہد اور شریک تھے اس لیے متعین تاریخوں کا نظم میں آجانا ایک لازمی اور ناگزیر امر تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی پیشہ ورانہ تربیت نے بھی ان کو مدد دی تھی۔ چنانچہ سیاسی واقعات کو نظم کرنے میں تاریخ اور توقیت کے اس مصمم التزام سے ان کے تاریخی شعور کا پختہ ثبوت فراہم ہوتا ہے وہ جتنی اور جیسی بھی تاریخیں بیان کرتے ہیں وہ سب کی سب قطعی، حتمی اور صحیح ہوتی ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ پیشہ ور مورخ وسلطانی ندیم برنی کے مقابلے میں ان کی تاریخیں زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ برنی نے اپنی تاریخ بڑھاپے میں درون زنداں لکھی تھی جب اس کے اپنے حواس مختل، طبیعت پریشان اور یادداشت کمزور تھی۔ مزید برآں تصنیف کے وقت اس کے پاس کوئی دستاویزی تحریر نہ تھی جبکہ امیر خسرو نے بروقت تصنیف کی تھی جب یادداشت بھی تازہ اور قابلِ اعتماد تھی اور سند کے لیے تحریری اور تقریری مواد بھی دستیاب تھا۔ اسی بنا پر مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جب برنی اور امیر خسرو کی تاریخوں میں تصادم نظر آئے تو آنکھ موند کر شاعر صفت مورخ کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ مورخ برنی کی اکثر تاریخیں غلط اور مشتبہ ہونے کے سبب ناقابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ امیر خسرو کا صرف یہی کارنامہ نہیں ہے کہ وہ بہت سے سیاسی اور سماجی واقعات کی قطعی اور حتمی تاریخیں فراہم کرتے ہیں بلکہ وہ بہت سے غیر مورخہ واقعات کی توقیت مرتب کرنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔ امیر خسرو دہلی سلطنت کے مورخ نہ سہی مگر وہ اس کے ناگزیر ماخذ ہیں کیونکہ اس کی تاریخ ان کے بغیر مرتب نہیں کی جاسکتی۔

☆☆

دہلی سلطنت کی توقیت اور امیر خسرو

(الف) عہدِ کیقبادی

۱۔ جلوس کیقباد	۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء	قران السعدین، ۳۵
۲۔ خانہ دولت سے روانگی اور سیری میں نزول و قیام	دوشنبہ ۲۶ر ذی الحجہ ۶۸۶ھ ۳ر فروری ۱۲۸۸ء	قران السعدین ۴۸،۵۱
۳۔ دوسری صبح قصر کیلوگھڑی آمد و قیام	سہ شنبہ ۲۷ر ذی الحجہ ۶۸۶ھ ۳ر فروری ۱۲۸۸ء	قران السعدین ۵۲،۵۴
۴۔ منگول حملہ: ملتان میں۔ ان کے مقابلے کے لیے خاں جہاں شاہک کی تیس ہزار فوج کے ساتھ روانگی اور فتح اور فاتح لشکر کی واپسی	محرم ۶۸۷ھ/ ۶ر فروری ۱۲۸۸ء تا ربیع الاول ۶۸۷ھ ۱۵ر اپریل ۱۲۸۸ء	قران السعدین ۶۴،۶۵ قران السعدین ۹۰،۹۱ قران السعدین ۹۴،۹۶

۵۔ مشرق (ہندوستان) کو			
کیقباد کی روانگی شہر تو سے	وسط ماہ ربیع الاوّل ۶۸۷ھ		
	۳۰/اپریل ۱۲۸۸ء	قران السعدین	۸۸۔۹
۶۔ پیغام رسانی درمیان پدر پسر	سخت گرمی/خربوزہ کا موسم/ جون	قران السعدین	۱۰۶،۹
۷۔ ملاقات میان کیقباد و بغرا خاں	سخت گرمی/خرپوزہ کا موسم/ جون		
۸۔ واپسی کیقباد از اودھ تا دہلی	برسات کا موسم		
۹۔ خسرو کی اودھ سے دہلی واپسی	ذی قعدہ ۶۸۷ھ		
	۲۷/نومبر ۱۲۸۸ء تا ۲۶/دسمبر ۱۲۸۸ء		
۱۰۔ دہلی آمد کے دو دن بعد دربار	ذی قعدہ ۶۸۷ھ		
میں خسرو کی طلبی اور ملاقات	۲۷/نومبر ۱۲۸۸ء تا	قران السعدین	۲۲۳
کے قصہ کو نظم کرنے کا حکم	۲۶/دسمبر ۱۲۸۸ء	قران السعدین	۲۲۴
۱۱۔ تین ماہ میں مثنوی لکھی اور پھر			
چھ ماہ میں اس کی تہذیب کی			
۱۲۔ تکمیل و پیش کش مثنوی	رمضان ۶۸۸ھ/ ۱۸/ستمبر تا		
	۱۷/اکتوبر ۱۲۸۹ء	قران السعدین	۲۳۰

(ب) عہد جلالی

۱۔ تخت نشینی جلال الدین	سہ شنبہ ۳/جمادی الثانیہ ۶۸۹ھ		
فیروز خلجی	۱۳/جون ۱۲۹۰ء	مفتاح الفتوح	۷۔۶
۲۔ ملک چھجو سے مقابلہ کے لیے	سہ شنبہ ۶/رمضان ۶۸۹ھ		
سلطان کی روانگی	۱۲/ستمبر ۱۲۹۰ء	مفتاح الفتوح	۸۔۹،۱۱
۳۔ سلطان کی مہم چھجو سے	دوشنبہ آخر محرم ۶۹۰ھ		
دہلی واپسی	۲/فروری ۱۲۹۱ء	مفتاح الفتوح	۲۳

۴۔	سلطان فیروز خلجی کا سیری میں مقام	ماہِ صفر ۶۹۰ھ/ ۴؍جنوری ۱۲۹۱ء تا ۲؍فروری ۱۲۹۱ء	مفتاح الفتوح	۲۳۔۴
۵۔	دربارِ عام۔ شہزادگان و امراء کو انعامات کی تقسیم	پنجشنبہ[۱] ۱۸؍ربیع الاوّل ۶۹۰ھ ۲۱؍مارچ ۱۲۹۱ء	مفتاح الفتوح	۲۴
۶۔	رنتھمبور کی مہم کے لیے روانگی	پنجشنبہ[۱] ۱۸؍ربیع الاوّل ۶۹۰ھ ۲۱؍مارچ ۱۲۹۱ء	مفتاح الفتوح	۲۵
۷۔	سیری سے لہراوت، چنداول ریواڑی، نارنول ہوتا اور دو ہفتہ میں کوہستان کو قطع کر کے حدودِ رنتھمبور میں پہنچا اور جھائن میں مقیم ہوا۔		مفتاح الفتوح	۲۵،۲۶
۸۔	مالوہ اور گجرات وغیرہ کے علاقے میں مہمیں بھیجی گئیں جو لوٹ مار کر کے واپس آئیں	ان مہموں میں کل دو ماہ چودہ روز لگے صفحہ ۳۵	مفتاح الفتوح	۲۸،۹،۳۱
۹۔	جھائن میں رنتھمبور کے جنرل پر شاہی فتح اور رانا رنتھمبور کا پہاڑوں میں فرار		مفتاح الفتوح	۳۰
۱۰۔	متعدد لشکروں کا مالوہ میں فتح حاصل کرنا		مفتاح الفتوح	۳۴،۵
۱۱۔	سلطان کی دہلی واپسی	شنبہ ۳؍جمادی الآخرہ ۶۹۰ھ ۲؍جون ۱۲۹۱ء	مفتاح الفتوح	۳۵
۱۲۔	مثنوی مفتاح الفتوح کی تکمیل	چہارشنبہ ۲۰؍جمادی الآخرہ ۶۹۰ھ ۲۰؍جون ۱۲۹۱ء	مفتاح الفتوح	۴۰

۱۔ ۱۸؍ربیع الاوّل ۶۹۰ھ کو چہارشنبہ پڑتا ہے۔

(ج) علائی

۱۔	دیوگیر پر علائی حملہ اوّل کے لیے کڑہ سے روانگی	شنبہ ۱۹ ربیع الآخر ۶۹۵ھ ۲۵ فروری ۱۲۹۶ء	مفتاح الفتوح ترجمہ حبیب	۸ ۱۵۲
۲۔	دیوگیر سے علاء الدین خلجی کی کڑہ مانکپور واپسی	جمعہ ۲۸ رجب ۶۹۵ھ ۱ جون ۱۲۹۶ء	ترجمہ حبیب	۹/۱۵۳
۳۔	کڑہ میں علاء الدین کی پہلی تخت نشینی (بعد از قتل جلال الدین خلجی)	چہار شنبہ ۱۶ رمضان ۶۹۵ھ ۱۸ جولائی ۱۲۹۶ء	ترجمہ حبیب دولرانی خضر خاں	۱۱ / ۱۵۳ ۵۵
۴۔	دہلی میں علائی آمد اور جلوس دوم	دوشنبہ ۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ ۲۰ اکتوبر ۱۲۹۶ء	دولرانی خضر خاں	۱۵۴/۱۲ ۵۸
۵۔	جارن منجور کی جنگ منگول کدر کا حملہ	پنجشنبہ ۲۲ ربیع الآخر ۶۹۷ھ ۶ فروری ۱۲۹۸ء		۱۶۸/۳۴
۶۔	امروہہ میں علی بیگ اور ترتاق کا حملہ	پنجشنبہ ۱۲ جمادی الآخرہ ۷۰۵ھ ۳۰ دسمبر ۱۳۰۵ء		۱۷۰/۳۸
۷۔	اجراء حکم سلطانی بارے فتح گجرات	چہار شنبہ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۶۹۸ھ ۲۳ فروری ۱۲۹۹ء		۱۸۱/۴۷
۸۔	گجرات میں قیام لشکر سلطانی انہل واڑہ کا محاصرہ	رجب تا ذوالقعدہ ۶۹۸ھ/ ۴ اپریل تا ۲۹ اگست ۱۲۹۹ء		۱۸۳
۹۔	انہل واڑہ کا سقوط/ سومنات، کھنبایت وغیرہ کا سقوط	شعبان ۶۹۸ھ/ ۴ مئی ۱ جون ۱۲۹۹ء	خزائن الفتوح ۹، ۴۸ ترجمہ حبیب	۱۸۴/
۱۰۔	فتح رنتھمبور	سہ شنبہ ۳ ذوالقعدہ ۷۰۰ھ/ ۱۱ جولائی ۱۳۰۱ء		۱۸۴/۵۴

۱۱۔ چتوڑ کے لیے روانگی	سہ شنبہ ۸ رجمادی الآخرہ ۷۰۲ھ	
	۲۸ رجنوری ۱۳۰۳ء	۱۸۸/۶۰
۱۲۔ فتح قلعہ چتوڑ	سہ شنبہ ۱۱ رمحرم ۷۰۳ھ/ ۲۶ راگست ۱۳۰۳ء	۱۸۸/۶۲
۱۳۔ فتح قلعہ مانڈو/ مالوہ	پنجشنبہ ۵ رجمادی الآخرہ ۷۰۵ھ/ ۲۳ رنومبر ۱۳۰۵ء	۱۸۷/۵۹
۱۴۔ دوم فتح دیوگیر	شنبہ ۱۹ ررمضان ۷۰۶ھ/ ۲۴ رمارچ ۱۳۰۷ء	۱۹۰/۶۵
۱۵۔ سیوانا کی مہم کے لیے روانگی	چہار شنبہ ۱۳ رمحرم ۷۰۸ھ/ ۳ رجولائی ۱۳۰۸ء	۱۹۱/۶۹
۱۶۔ سیوانا کی فتح	سہ شنبہ ۲۳ رربیع الاول ۷۰۸ھ/ ۱۰ ستمبر ۱۳۰۸ء	۱۹۳/۷۲
۱۷۔ وارنگل کی مہم		
— مہم کی تیاری کا حکم	جمعہ ۲۵ رجمادی الاولیٰ ۷۰۹ھ/ ۳۱ راکتوبر ۱۳۰۹ء	۲۰۲/۷۳
— دہلی سے روانگی	جمعہ ۲۵ رجمادی الاولیٰ ۷۰۹ھ/ ۳۱ راکتوبر ۱۳۰۹ء	۲۰۲/۷۳
— مسعود پور آمد	شنبہ ۴ رجمادی الآخرہ ۷۰۹ھ/ ۹ رنومبر ۱۳۰۹ء	۲۰۲/۷۴
— مسعود پور میں قیام	شنبہ تا سہ شنبہ ۴۔۶ جمادی الآخرہ ۷۰۹ھ/ ۹ رنومبر ۱۳۰۹ء	۲۰۲/۷۴
— مسعود پور سے روانگی	سہ شنبہ ۶ رجمادی الآخرہ ۷۰۹ھ/ ۱۱ رنومبر ۱۳۰۹ء	۲۰۲/۷۴
— ایرج پور (سلطان پور) آمد	۱۵ رجمادی الآخرہ ۷۰۹ھ/ ۲۱ رنومبر ۱۳۰۹ء	۲۰۲/۷۵
— ایرج پور 〃 میں قیام	۱۵/۹ر 〃 〃 /۲۱۔۲۵ 〃	〃 / 〃
— 〃 〃 سے روانگی	۱۹ر 〃 〃 /۲۵ ر 〃	
تیرہ دن کے سفر کے بعد		
— کھنتا میں آمد	جمعہ ۱ ررجب ۷۰۹ھ/ ۵ ردسمبر ۱۳۰۹ء	۲۰۳/۷۶
— کھنتا میں قیام اور شب برات منانا		
	۱۴ ررجب ۷۰۹ھ/ ۱۸ ردسمبر ۱۳۰۹ء	۲۰۳/۷۶
— نیلکنٹھ میں آمد اور قیام	آٹھ دن بعد ۲۲ رجب ۷۰۹ھ/ ۲۶ ردسمبر ۱۳۰۹ء	۲۰۴/۷۸
— نیلکنٹھ سے روانگی	سہ شنبہ ۲۶ ررجب/ ۳۰ ردسمبر ۱۳۰۹ء	۲۰۴/۷۸
— سبرا سربر کے قلعہ کا محاصرہ		۲۰۵/۸۰۔۲
— سربر سے روانگی	شنبہ ۱۰ رشعبان/ ۱۳ رجنوری ۱۳۱۰ء	۲۰۶/۸۳

— کنربال میں آمد	۱۵رشعبان؟ ۱۸رجنوری	خزائن	۲۰۶/۸۳
—وارنگل میں آمد اور محاصرہ	〃 〃		۲۰۷/۸۵-۹۰
—قلعہ وارنگل کے بیرونی حصہ پر حملہ			
	شب منگل ۱۱ررمضان/ ۱۲رفروری ۱۳۱۰ء		۲۱۰/۹۱
—بیرونی قلعہ پر قبضہ اور	۴ دن میں چہارشنبہ ۱۲-۱۶ رمضان		
سنگین قلعہ کا محاصرہ	۱۳-۱۷رفروری ۱۳۱۰ء		۲۱۲/۹۵-۶
— صلح پرتاپ رودردیو	(شوال کے آغاز میں/ وسط مارچ)		/۹۸-۱۰۴
—دہلی کے لیے واپسی کا آغاز	۱۵رشوال/ ۱۸رمارچ ۱۳۱۰ء		۲۱۹/۱۱۰-۱۱
—دہلی آمد	۱۱رمحرم ۷۱۰ھ/ ۱۰رجون ۱۳۱۰ء		۲۲۰/۱۱۳
—بارعام چبوترہ ناصری	سہ شنبہ ۲۴رمحرم ۷۱۰ھ/ ۲۳رجون ۱۳۱۰ء		۲۲۰/۱۳
۱۸- مہم دوارسمدر			
—دہلی سے روانگی	سہ شنبہ ۲۱رجمادی الآخرہ ۷۱۰ھ/ ۲۲رنومبر ۱۳۱۰ء		۲۲۵/-
	۲۴ر 〃 ۳۰ر 〃		/۱۱۶
—منکل میں آمد	۲۶ر 〃 ۲۲ر 〃		
—منکل میں قیام اور عرض لشکر	۱۴ دن		۲۲۵/۱۱۸
—منکل سے روانگی	۹ررجب ۷۱۰ھ/ ۲ردسمبر ۱۳۱۰ء		۲۲۵/۱۱۷
	۱۷ دن کا سفر		
— کھرگاؤں آمد	۱۷رشعبان/ ۹رجنوری ۱۳۱۱ء		۲۲۶/۱۱۸
— کھرگاؤں میں قیام	بیس دن قیام ۱۷رشعبان تا ۳ررمضان/ ۹، ۲۴ جنوری		〃/ ۱۲۰
— کھرگاؤں سے روانگی	جمعہ ۷ررمضان/ ۲۸رجنوری ۱۳۱۱ء		۲۲۷/۱۲۱
—یا دریائے تاپتی کے کنارے آمد 〃	〃 〃		〃 〃
—دیوگیر میں آمد	پنجشنبہ ۱۳ررمضان/ ۳رفروری ۱۳۱۱ء		۲۲۷/۱۲۲
—دیوگیر میں قیام	تین روزہ ۱۳رتا ۱۶ررمضان...... ۳، ۶رفروری		〃 /۱۲۵
—دیوگیر سے روانگی	سہ شنبہ ۱۷ررمضان/ ۷رفروری ۱۳۱۱ء		〃 /۱۲۵

—بندری جاگیر دلوی میں آمد پانچ دن بعد ۲۳ ررمضان/ ۱۳ رفروری ۱۳۱۱ء ۲۲۹/۱۲۶

—بندری سے روانگی یکشنبہ ۲۳ ررمضان/ ۱۳ رفروری ۱۳۱۱ء ۲۲۹/۱۲۸

بارہ دن مسلسل سفر خزائن ۲۲۹/۱۲۸

دوار سمدر میں آمد اور قلعہ کا محاصرہ۔ پنجشنبہ ۵ رشوال/ ۲۵ رفروری ۱۳۱۱ء خزائن ۲۳۰/۱۲۹

سفراء بلال دیو کی آمد

اور اطاعت کی شرائط جمعہ ۶ رشوال/ ۲۶ رفروری ۱۳۱۱ء ۲۳۴/۱۳۳-۷

دوار سمدر میں قیام بارہ دن ۵-۱۷ رشوال

۲۵ رفروری تا ۹ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۵/۱۴۱

۱۹۔ مہم معبر

—دوار سمدر سے روانگی چہار شنبہ ۱۸ رشوال ۷۱۰/ ۱۰ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۶/۱۴۲

—حدود معبر میں آمد پانچ دن ۲۳ رشوال/ ۱۵ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۶/۱۴۳

—مروی (مدورا) کی فتح " ۲۳۶-۷/۱۴۴

—کاویری کے کنارے قیام " ۲۳۷/۱۴۴

—کاویری سے سردھول روانگی پنجشنبہ ۵ رذی قعدہ/ ۲۶ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۷/۱۴۴-۵

—ویر پانڈیہ کا کمم کو فرار اور وہاں سے کندور کو

پنجشنبہ ۵ رذی قعدہ/ ۲۶ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۷/۱۴۸

—کندور پر حملہ/ ویر پانڈیہ کا تعاقب

پنجشنبہ ۵ رذی قعدہ/ ۲۶ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۷-۴۲/۱۴۸-۵۲

—جال کوٹہ جلکوٹ روانگی اور واپسی طرف کندو

پنجشنبہ ۵ رذی قعدہ/ ۲۶ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۷/۱۵۲-۵

—سرمت پر حملہ اور مندر کی تباہی

پنجشنبہ ۵ رذی قعدہ/ ۲۶ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۷/۱۵۶-۹

—مختلف مقامات کو پنجشنبہ ۵ رذی قعدہ/ ۲۶ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۷-۴۲/"

—شاہی دستوں کی روانگی پنجشنبہ ۵ رذی قعدہ/ ۲۶ رمارچ ۱۳۱۱ء ۲۳۷-۴۳/۹

—شاہی دستوں کی واپسی بیر دھول میں			
	یکشنبہ ۱۳/ ذی قعدہ/ ۳/ اپریل ۱۳۱۱ء		۶۰-۱۵۹/ ۲۴۳
—شاہی فوج کی بیر دھول سے روانگی			
	دو دن بعد ۱۵/ ذیقعدہ/ ۵/ اپریل		۱۶۰/ ۲۴۳
—شاہی فوج کی شہر کنم میں آمد	۱۷/ ذی قعدہ/ ۷/ اپریل		۱۶۰/ ۲۴۳
—(متھرہ) مدورا میں آمد	پانچ دن بعد ۲۰/ ذیقعدہ/ ۱۰ یا ۱۲/ اپریل		۱۶۰/ ۲۴۳
—دہلی کے لیے واپسی	شب یکشنبہ ۴/ ذی الحجہ ۷۱۰ھ/ ۲۴/ اپریل ۱۳۱۱ء		۶۶/ ۲۴۶
—دہلی آمد	؟		۲۴۶
—بار عام	دوشنبہ ۱۴/ جمادی الآخرہ ۷۱۱ھ/ ۲۸/ اکتوبر ۱۳۱۱ء		،، / ۲۴۶
	(وحید مرزا) ۴/ جمادی الآخرہ ۷۱۱ھ/ ۱۸/ اکتوبر ۱۳۱۱ء		
	(زیادہ صحیح۔ لال ۲۷۵)		۸-۱۶۸/ ۰
۲۱۔ رخصتی وشب زفاف دختر الپ خاں	دوشنبہ ۱/ ذی الحجہ ۷۱۱ھ ۱۹/ اپریل ۱۳۱۲ء	دولرانی خضر خاں	۱۶۷
۲۲۔ تاریخ وفات علاء الدین خلجی	۷/ شوال ۷۱۵ھ/ ۴/ جنوری ۱۳۱۶ء	دولرانی خضر خان	۲۵۹
	۸/ شوال ۷۱۵ھ/ ۵/ جنوری ۱۳۱۶ء	بقیہ نقیہ	

(۵) عہد قطبی

۱۔ قطب الدین مبارک خلجی کی تخت نشینی	۲۴/ محرم ۷۱۶ھ ۱۸/ اپریل ۱۳۱۶ء	مہ سپہر/ وحید مرزا	۸/ ۲۷
۲۔ قطب الدین مبارک خلجی کا قتل	(چہار شنبہ) غرہ جمادی الثانیہ ۷۲۰ھ ۹/ جولائی ۱۳۲۰ء	تغلق نامہ	۱۹

(س) عہد خسرو خاں

۱۔ تخت نشینی خسرو خاں		تغلق نامہ	۳۶

٢۔	غازی تغلق اور خسرو خاں کی جنگ	جمعہ غرہ ١ر شعبان ٧٢٠ھ ٥۔٦ر ستمبر ١٣٢٠ء	تغلق نامہ	١٣٢۔٣
٣۔	غازی تغلق کا قصر سلطانی میں داخلہ	شنبہ ١ر شعبان ٧٢٠ھ ٦ر ستمبر ١٣٢٠ء	تغلق نامہ	١٣٥

(ش) عہد تغلق

١۔	جلوس تغلق شاہ	شنبہ ١ر شعبان ٧٢٠ھ/٦ر ستمبر ١٣٢٠ء	تغلق نامہ	١٣٤
٢۔	گرفتاری وقتل خسرو خاں	″ ″ ″ ″	تغلق نامہ	١٣٨۔٩

☆☆

حواشی و تعلیقات

۱۔ اس بحث کے لیے ملاحظہ کیجیے پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) Historians of Medieval India: لندن ۱۹۶۶، ص ۹۲۔۶۹، سید حسن عسکری۔
Historians "Amir Khusrau" as a Historian of Medieval India مرتبہ محب الحسن خاں، میرٹھ ۱۹۶۸ء، ص ۳۶۔۲۲۔
ایضاً " Historical Matters in Ejaz-e-Khusravi "
روئداد انڈین ہسٹری کانگریس، ۱۹۷۴ء، حصہ دوم، علی گڑھ ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۔۱۱،
ایضاً " Material of Historical Interest in Ejaz-e-Khusravi "
Medieval India - a Miscellany، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۸، ص ۲۱۔۱،
ایضاً " Khusrau's Works as Sources of Social History " Amir Khusrau، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومتِ ہند، اکتوبر ۱۹۷۵ء، ص ۶۲۔۱۴۳،
عمیق حنفی، "The Historian in Khusrau"، مذکورہ بالا کتاب، ص ۸۴۔۱۶۳،
محمد یاسین مظہر صدیقی، "Some Literary and Historical Aspects of the Ijaz-e-Khusravi" امیر خسرو، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد ۱۹۷۶ء، ص ۳۶۔۲۴
نیز ملاحظہ کیجیے:
محمد حبیب، حضرت امیر خسرو آف دہلی، علی گڑھ ۱۹۲۷ء، اور مکمل تصانیف پروفیسر حبیب، مرتبہ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ ۱۹۷۴ء، ج ۱، ص ۳۵۵۔۲۹۱،

وحید مرزا The Life and Works of Amir Khusrau ادارہ ادبیات دلّی ۱۹۷۴ء ، بالخصوص، ص ۲۲۶۔ ۱۴۰،

ایس ،بی، نگم، Historiography in the Prose- Works of Ameer Khusrau،

Life, Times and Works of Amir Khusrau Dehlavi the Centenary, National Amir Khusrau Society نئی دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۷۹۔ ۷۴،خسروشناسی ،مرتبہ ظ انصاری اورابوالفیض سحر، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔نئی دہلی ۱۹۷۵ء۔

۲۔ امیر خسرو کی امرا کی درباری زندگی کے لیے ملاحظہ ہو وحید مرزا، مذکورہ بالا، ص ۷۳۔ ۳۶،محمد حبیب، مذکورہ بالا، مجموعۂ تصانیف جلد اوّل، ص ۳۰۲ ۔ ۲۹۷، سید محی الدین اظہر، امیر خسرو اور علی گڑھ، علی گڑھ ۱۹۸۱ء، ص ۴۳۔ ۲۵، نیز محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مضمون امیر خسرو اور دہلی دربار" (انگریزی) جو امیر خسرو ہفت صد سالہ تقریبات منعقدہ وگیان بھون دہلی ۲۳ر جنوری ۱۹۷۶ء کو پڑھا گیا، خسروشناسی، ص ۳۴۔۹۔

۳۔ امیر خسرو کی درباری زندگی (دہلی سلطان کے دربار سے وابستگی) معزالدین کیقباد کے جلوس کے سال دوم کے اواخر میں شروع ہوئی تھی یعنی ذیقعدہ ۶۸۷ھ/دسمبر ۱۲۸۸ء سے اوران کی حیات کے آخری لمحے ۱۸رشوال ۷۲۵ھ/۲۷ر ستمبر ۱۳۲۵ء، تک جاری رہی ۔آغاز کے لیے ملاحظہ ہو قران السعدین، مرتبہ محمد اسمٰعیل میرٹھی اور سید حسن برنی، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، علی گڑھ ۱۹۱۸ء، ص ۲۲۳۔

۴۔ تکمیل وپیشکش مثنوی قران السعدین، رمضان ۶۸۸ھ/ستمبر۔اکتوبر ۱۲۸۹ء۔ قران السعدین، ص ۲۳۰۔ مثنوی کے آغاز کی تاریخ پر بحث کے لیے ملاحظہ ہو سید حسن برنی کی تمہید، ص ۵۲۔

۵۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ا۔

۶۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو سیّد حسن برنی کی تمہید مثنوی قران السعدین، ص ۵۵۔۵۱، محمد حبیب، حضرت امیر خسرو آف دہلی، مذکورہ بالا، ص ۳۵۲، کے ایس لال، ہسٹری

آف دی خلجیز اُردو ترجمہ، خلجی خاندان از محمد یٰسین مظہر صدیقی، ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۸۰ء، ص ۳۹۱۔

۷۔ قِران السعدین ص ۳۵۔

۸۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مرتبہ سر سیّد احمد خاں، ببلوتھکا انڈکا، کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۱۲۷۔

۹۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، مرتبہ محمد ہدایت حسین، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۵۹، نیز ملاحظہ ہو خلجی خاندان۔ ص ۷، حاشیہ اوّل۔

۱۰۔ خلجی خاندان، مذکورہ بالا، خسرو شناسی، ص ۳۵۳ (سوانحی جدول)۔ نیز ملاحظہ ہو عزیز احمد Political History and Institutions of the Early Turdish Empire of Delhi. لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۲۹۴، حاشیہ ۲۔

۱۱۔ مذکورہ بالا۔

۱۲۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۰-۱۳۹۔

۱۳۔ قِران السعدین، ص ۷-۴۴ و آئندہ۔

۱۴۔ قِران السعدین، ص ۴۸، ۵۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۲، ۵۴۔

۱۶۔ ایضاً ص ۵-۶۲، ۹۱-۹۰، ۶-۹۴۔

۱۷۔ سید حسن برنی، تمہید، ص ۸-۲۷ وغیرہ، مقدمہ محمد اسمٰعیل میرٹھی، ص ۱۷-۱۱۔

۱۸۔ ایضاً ص ۶۵-۶۲، ۹۶-۹۰۔

۱۹۔ تاریخ مبارک شاہی، ص ۵۴۔

۲۰۔ قِران السعدین، ص ۹-۸۸۔

۲۱۔ غرۃ الکمال بحوالہ تمہید سید حسن: ص ۱۰ و ۱۳۔

۲۲۔ قِران السعدین، ص ۹-۸۰۔

۲۳۔ تمہید مذکورہ بالا، ص ۵۵

۲۴۔ وحید مرزا، مذکورہ بالا، ص ۱۷۵، احمد حبیب، مذکورہ بالا، ص ۳۲۰۔

۲۵۔ قران السعدین، ص ۲۷۔۱۶۴ مثلاً قران السعدین کے خاص واقعہ کے لیے۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۰۔۲۱۶

۲۷۔ اعجاز خسروی، رسالہ پنجم، بحوالہ تمہید سید حسن برنی، ص ۱۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۔۲۲۲۔

۲۹۔ عام خیال ہے کہ سلطان کیقباد کی فرمائش پر چھ ماہ کی مدت میں مثنوی کی تکمیل ہوئی جیسا کہ سید حسن برنی کی تمہید ص ۵۲ اور مقدمہ محمد اسمٰعیل میرٹھی ص ۵۷ میں خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ وحید مرزا، مذکورہ بالا، ص ۱۷۴ کا خیال ہے کہ تین ماہ کی مدت کے بعد لکھی گئی تھی۔ محمد حبیب مذکورہ بالا، ص ۳۰۲ نے بھی چھ ماہ کی مدّت بیان کی ہے لیکن تکمیل کا مہینہ شوال دیا ہے جو غلط ہے۔ کیونکہ خسرو نے بصراحت رمضان ۶۸۸ھ کہا ہے۔ سید محی الدین اظہر، مذکورہ بالا، ص ۷۴ نے بھی چھ ماہ کی مدّت تسلیم کی ہے۔ لیکن امیر خسرو کے اپنے بیان سے مثنوی کے آغاز اور تکمیل کی درمیانی مدت نو ماہ معلوم ہوتی ہے ملاحظہ ہو قران السعدین ص ۲۳۰ جہاں انھوں نے تین ماہ اور چھ ماہ کی دو الگ الگ مدّتوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ توقیتی اعتبار سے بھی یہ مدّت نو ماہ یا اس سے زیادہ بنتی ہے۔ یہ مسلم ہے کہ سلطان نے ان سے فرمائش ذیقعدہ ۶۸۷ھ میں کی تھی اور امیر خسرو کا حتمی بیان ہے کہ انھوں نے مثنوی رمضان ۶۸۸ھ میں مکمل کی۔ ظاہر ہے کہ فرمائش سلطانی کے بعد ہی اُنھوں نے اس کا آغاز کر دیا۔ تین ماہ کی سخت محنت کے بعد اس کا اوّل مسودہ تیار ہوا اور پھر چھ ماہ مزید کی تنقیح و تہذیب کے بعد وہ پوری طرح مکمل مثنوی کی مدت سمجھی ہے انھوں نے پہلی مدّت کو دوسری مدت کا ایک جزو سمجھا ہے حالانکہ امیر خسرو نے اپنی محنت اور کاوش کی دو مدّتیں بیان کی ہیں جن کا میزان نو ماہ آتا ہے۔

۳۰۔ مفتاح الفتوح، مرتبہ شیخ عبدالرشید شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۴ء، ص ۷۔۶۔

۳۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۷۵، نیز ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی، ص ۲۔۶۱ جس کے مطابق جلوس جلالی ۶۸۹ھ کے ماہ ربیع الآخر میں کسی وقت ہوا تھا۔ بدایونی، فرشتہ

اور بعد کے دوسرے مورخوں نے بھی غلط تاریخ بیان کی ہے۔ملاحظہ ہو خلجی خاندان، ص ۲۳، حاشیہ ا۔

۳۲۔ سکوں کی شہادت کے لیے ملاحظہ ہو، نیلسن رائٹ (Nelson Wright)۔ The Sultans of Delhi, Their Comage and Metrology دہلی، ۱۹۳۰، ص ۸۷، ایڈورڈ تھامس (Edward Thomas) Chronicles of the Pathan Kings of Delhi. کلکتہ، جلد دوم، نمبر ۱۷۵، Lucknow Museum Numismatic Catalogue. نمبر ۱۷۷۔

۳۳۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۸۱، نیز ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی، ص ۶۲، جس کے مطابق ملک چھجو نے شعبان ۶۸۹ھ/اگست۔ستمبر ۱۲۹۰ء میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔

۳۴۔ مفتاح الفتوح، ص ۱۰۔۹۔

۳۵۔ ایضاً ، ص ۲۔۱۲۔

۳۶۔ ایضاً ، ص ۲۔۲۱۔

۳۷۔ ایضاً ، ص ۲۳۰۔

۳۸۔ ایضاً ، ص ۲۲۔۲۳۔

۳۹۔ ایضاً ، ص ۵۔۲۴۔

۴۰۔ ایضاً ، ص ۴۰۔۲۵۔

۴۱۔ ایضاً ، ص ۵۔۳۱۔

۴۲۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۔۲۱۲، نیز ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی، ص ۶۷ جس نے ایک سطر میں اس مہم کو دوسری مہم رنتھمبور بتایا ہے مگر اس کا سنہ نہیں دیا ہے۔

۴۳۔ خلجی خاندان، ص ۳۲ حاشیہ ۲۸۔

۴۴۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۔۲۱۲۔

۴۵۔ مفتاح الفتوح، ص ۴۰، وحید مرزا، مذکورہ بالا ص ۱۷۶ اور غالباً ان کی پیروی میں شیخ رشید نے اپنی تمہید میں مثنوی مفتاح الفتوح کی تکمیل کی تاریخ ۲ رجمادی الثانیہ ۶۹۰ھ دی ہے جبکہ خسرو نے خود "دوم عشر جماد آخریش" کہا ہے۔ظاہر ہے

کہ دونوں مذکورہ بالا مورخین سے اس تاریخ کی تعیین میں تسامح ہوا ہے۔

۴۶۔ خزائن الفتوح، مرتبہ محمد وحید مرزا، کلکتہ ۱۹۵۳ء ص ۹۔۸، انگریزی ترجمہ از محمد حبیب، جلد دوم، ص ۳۔۱۵۲، دولرانی خضر خاں، ص ۵۔۵۴، نیز ملاحظہ ہو خلجی خاندان، ص ۵۲، جس میں کے ایس لال نے ۲۶ رفروری دی ہے مگر اس دن جمعہ تھا، سنیچر نہیں۔

۴۷۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۔۲۲۳ اور ص ۲۲۸۔

۴۸۔ خزائن الفتوح، ص ۱۱، انگریزی ترجمہ، ص ۱۵۳، دولرانی خضر خاں، ص ۵۵۔

۴۹۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۳۵

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۴۶۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۳۹۔

۵۲۔ خزائن الفتوح، ص ۱۲، انگریزی ترجمہ، ص ۱۵۴، نیز ملاحظہ ہو دولرانی خضر خاں، ص ۴۔۵۳، کے ایس لال، مذکورہ بالا، ص ۵۷۔

۵۳۔ خزائن الفتوح ص ۳۳۔۱۲، انگریزی ترجمہ، ص ۶۷۔۱۵۲

۵۴۔ خزائن الفتوح، ص ۳۴، انگریزی ترجمہ، ص ۱۶۸، دولرانی خضر خاں، ص ۶۰، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۵۰ نے اس حملہ کو ۶۹۶ھ/ ۱۲۹۷ء کا واقعہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس مہم میں ظفر خاں نے بھی شرکت کی تھی جبکہ عصامی نے اس حملہ کا ذکر قطعی نہیں کیا ہے۔

۵۵۔ خزائن الفتوح، ص ۳۸، انگریزی ترجمہ، ص ۱۷۰، دولرانی خضر خاں ص ۶۱، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۲۰، عصامی، فتوح السلاطین، ص ۵۔۳۰۱۔ علائی فوج کا سالار ایک ہندو افسر ملک نایک تھا جو آخور بیگ میسرہ کے بلند منصب پر فائز تھا۔ صرف امیر خسرو نے اس افسر کو ہندو بتایا ہے۔

۵۶۔ جدید مورخین کا خیال ہے کہ یہ آخری منگول حملہ تھا جو ۱۳۰۶ء میں کسی وقت ہُوا تھا۔ ملاحظہ ہو محمد حبیب، انگریزی ترجمہ خزائن، ص ۶۔۱۷۴، کے ایس لال، خلجی خاندان، ص ۶۷۔۱۶۲، دولرانی خضر خاں، ص ۲۔۶۱، برنی، تاریخ فیروز شاہی ص ۲۔۳۲۱،

نیز ملاحظہ ہوں پروفیسر حبیب کا ان حملوں پر تبصرہ خزائن میں، ص ۴۔ ۳۲۔ منگول فوج کا سالار اعلیٰ کپک تھا اور دوسرے سالاروں میں اقبال مند اور تا ئبو تھے جبکہ سلطانی لشکر کے قائد الغ خاں تھے۔

۵۷۔ ان حملوں کے لیے ملاحظہ کیجئے برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۵۱۔ ۲۵۰ و ۳۰۲۔ ۳۰۰، تاریخ مبارک شاہی، ص ۷۴۔ ۷۲، محمد حبیب انگریزی ترجمہ ص ۸۱۔ ۱۷۶، خلجی خاندان، ص ۶۰۔ ۱۴۸۔ ان حملوں کے فوجی نقطۂ نظر سے بہترین بیان کے لیے ملاحظہ ہو عصامی، فتوح السلاطین، مرتبہ محمد یوشع، مدراس ۱۹۴۸ء، ص ۷۰۔ ۲۵۹، ص ۶۔ ۲۸۵۔ نیز ملاحظہ ہو دولرانی خضر خاں ص ۵۹۔

۵۸۔ دولرانی خضر خاں، مرتبہ رشید احمد سالم انصاری، علی گڑھ ۱۹۱۷ء، ص ۶۱۔ ۶۰۔ دولرانی خضر خاں میں تاریخی مواد پر بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے: محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مضمون "Historical Material in the Deval Rani Khzar Khan" جو یونیورسٹی آف کلکتہ کے سیمینار برامیر خسرو منعقدہ ۱۰۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۷۷ء میں پڑھا گیا۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۵۴ میں اس کو ۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء کا واقعہ قرار دیا ہے۔ عصامی، فتوح السلاطین، ص ۶۰۔ ۲۵۹ میں بہت مفصل ذکر ملتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی، ص ۶۱۔ ۲۵۴۔ طرغی کے حملہ کے لیے ملاحظہ ہو فیروز شاہی، ص ۲۔ ۳۰۰، فتوح السلاطین، ص ۲۔ ۲۹۱۔ عصامی نے طرغی کے ایک اور حملہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

۵۹۔ خزائن الفتوح، ص ۴۷، انگریزی ترجمہ، ص ۱۸۱۔

۶۱۔ ایضاً۔ دولرانی خضر خاں، ص ۶۴ میں گجرات پر حملہ کی یہی تاریخ دی ہے اور تقریباً یہی تفصیلات ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو عصامی، ص ۴۔ ۲۵۲، وصاف، مذکورہ بالا، ص ۹۔ ۴۴۷، ایس سی مصرا، گجرات میں مسلم طاقت کا عروج، (انگریزی) بڑودہ ۱۹۶۳ء، ص ۴۔ ۶۱، کے ایس لال، ص ۷۱۔ ۶۷، ملکیسر یٹ گجرات کی تاریخ (انگریزی) طبع ہند ۱۹۳۸ء، ص ۴۔ ۲۔

۶۲۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۔ ۲۵۱۔

۶۳۔ خزائن الفتوح، ص ۵۴، انگریزی ترجمہ، ص ۱۸۴، دولرانی خضر خاں، ص ۶۔۶۵، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۸۳۔۲۷۲، عصامی، ص ۳۔۲۷۱، رنتھبور کے رانا ہمیر دیو نے دہلی کے باغیوں کو پناہ دی تھی اس لیے سلطانِ دہلی نے اپنے بھائی الغ خاں کے ماتحت لشکر بھیجا اور پھر خود چڑھائی کی اور قلعہ فتح کر لیا۔

۶۴۔ خزائن الفتوح، ص ۶۲۔۶۰، انگریزی ترجمہ، ص ۱۸۸، دولرانی خضر خاں، ص ۷۔۶۷، عصامی، ص ۸۱۔۲۷۹، برنی، تاریخ فیروز شاہی ۲۹۹، کے ایس لال، ص ۱۰۲۔۹۸۔ قلعہ چتوڑ کی فتح کے بعد اس کی حکومت شہزادہ خضر خاں کو عطا کی گئی تھی اور اس کا نیا نام خضر آباد پڑ گیا تھا۔

۶۵۔ خزائن الفتوح، ص ۵۹، انگریزی ترجمہ، ص ۱۸۷، دولرانی خضر خاں، ص ۹۔۶۷، کے ایس لال، ص ۴۔۱۱۳۔ امیر دہلی عین الملک ملتانی نے مالوہ اور مانڈو پر حملہ کر کے وہاں کے حکمراں کو کا پردھان کو شکست دی اور پورے علاقے کو دہلی سلطنت کا حصہ بنا دیا۔ برنی اور عصامی نے اس سلطانی مہم کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔

۶۶۔ خزائن الفتوح، ص ۶۵۔

۶۷۔ انگریزی ترجمہ، ص ۱۹۰۔ مترجم کو روانگی اور مہم کی دیوگیر میں آمد کے دو جملوں کا مفہوم سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے دہلی سے لشکر کی روانگی کا تو ذکر کیا ہے مگر خسرو کے ایک جملے کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ سلطانی لشکر کے سپاہیوں نے رمضان کے روزے زیادہ تر راستے میں گزارے تھے۔ اس طرح ترجمہ صاف اور مفہوم واضح ہوتا ہے۔

۶۸۔ نُہ سپہر، انگریزی ترجمہ ایلیٹ اور ڈاؤسن، ج ۳، ص ۷۷۔۵

۶۹۔ خزائن الفتوح، ص ۸۔۶۶۔

۷۰۔ خزائن، ص ۲۔۷۶۹، انگریزی ترجمہ، ص ۳۔۱۹۱، دولرانی خضر خاں، ص ۶۹ میں غالباً کاتب کی غلطی سے سیوانا کو سامانہ بنا دیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو کے ایس لال، مذکورہ بالا، ص ۷۔۱۱۶، عصامی، ص ۷۔۳۱۵ نے غالباً اس مہم کے بیان کے لیے مواد دولرانی خضر خاں سے لیا ہے اگرچہ اس پر اضافہ بھی کیا ہے۔

۷۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۷۔۳۲۶۔

۷۲۔ خلجی خاندان، ص ۲۵۳ حاشیہ ۲۴۔ پروفیسر موصوف کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ فرشتہ کا بیان ہے کہ سیوانا اور دیوگیر کی مہم دوم کی تاریخ ہے اور سیوانا کی فتح ۱۳۰۸ء میں ہوئی تھی اس لیے وہ دیوگیر کی مہم کی بھی تاریخ تھی۔ امیر خسرو نے بھی سیوانا کی فتح کو دیوگیر کی مہم کے فوراً بعد بیان کیا ہے۔ یہاں پروفیسر موصوف نے سیوانا کی مہم کے سلسلے میں پروفیسر حبیب کے نسخہ کی تاریخ ۱۳۱۰ء کو قبول کیا ہے حالانکہ وحید مرزا کے مخطوطہ میں ۱۳۰۸ء ہے جس کا ان کو علم ہے لیکن اُنھوں نے نہ جانے کیوں اس کا حوالہ نہیں دیا ورنہ برنی کی تاریخ کو ترجیح دینے کے لیے ان کو اتنی کاوش نہ کرنی پڑتی۔

۷۳۔ خلجی خاندان، ص ۲۔۱۳۱ پر ان کا بیان ہے کہ "سلطان نے ۲ر جولائی ۱۳۰۸ء (۱۳ر محرم ۷۰۸ھ) کو سیوانا کے حکمراں کو سزا دینے کے لیے پیش قدمی کی...... اور ۱۰ر نومبر ۱۳۰۸ء (۲۳ر ربیع الاول ۷۰۸ھ) کو (راناسٹل دیو) کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔" اس بیان کے لیے انھوں نے خزائن کے الہ آباد مخطوطہ، ورق ۳۴ اور ایلیٹ کے مخطوطہ پر بھروسا کیا ہے اور پروفیسر حبیب کے مخطوطہ میں دی گئی تاریخ ۱۱ر محرم ۷۱۰ھ (۱۳۱۰ء) کا بھی حوالہ اپنے حاشیہ ۱۲ میں دیا ہے۔ لیکن صفحہ ۲۵۳ اور حاشیہ ۲۴ پر دیوگیر کے معرکے کے سلسلے میں نہ جانے کیوں پروفیسر کے مخطوطہ کی تاریخ کو ترجیح دی ہ۔ نیز ملاحظہ ہو دولرانی خضر خاں ص ۶۹۔

۷۴۔ خزائن الفتوح، ص ۷۳، انگریزی ترجمہ، ص ۲۰۲۔

۷۵۔ ایضاً

۷۶۔ خزائن الفتوح، ص ۱۱۲۔ ۷۴، انگریزی ترجمہ، ص ۲۴۔ ۲۰۲، نیز ملاحظہ ہو ضمیمہ، دولرانی خضر خاں، ص ۷۰، کے ایس لال، ص ۲۴۲۔

۷۷۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۔۳۲۷، برنی متعین تاریخوں کی بجائے صرف سنہ دیتا ہے۔

۷۸۔ خزائن الفتوح، ص ۴۱۔۱۱۵، انگریزی ترجمہ، ۳۵۔۲۲۵، نیز ملاحظہ ہو ضمیمہ،

دولرانی خضر خاں، ص ۳۔ ۱۷۱، برنی، ص ۳۳۲، عصامی، ص ۸۔ ۲۹۲۔

۷۹۔ خزائن الفتوح، ص ۶۷۔ ۱۴۲، انگریزی ترجمہ، ص ۲۴۶۔ ۲۳۶، دولرانی خضر خاں، ص ۳۔ ۷۲، عصامی ص ۲۹۷، کے ایس لال، ص ۴۔ ۲۵۱۔

۸۰۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۳۴۔

۸۱۔ دولرانی خضر خاں، ص ۵۵ اور ص ۵۸۔ نیز ملاحظہ ہو برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۳۹ اور ص ۶۔ ۲۴۵ جہاں وہ قطعی تاریخیں نہیں دیتا ہے۔ اور اس نے جو پہلی تاریخ دی بھی ہے اس میں سقم ہے۔

۸۲۔ دولرانی خضر خاں، ص ۶۴۔ نیز ملاحظہ ہو خزائن الفتوح، ص ۶۔ ۳۵، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۱۵، عصامی، فتوح السلاطین، ص ۴۔ ۲۵۲، وصاف، تاریخ وصاف حضرت، بمبئی ۱۳۳۸ (ایرانی تقویم) ص ۹۔ ۴۴۷، ایس سی مصرا، "The Rise of Muslim Power in Gujarat" بڑودہ ۱۹۶۳ء، ص ۴۔ ۶۱، کے ایس لال، مذکورہ بالا، ص ۱۷۔ ۶۷، کمیسریٹ A History of Gujarat، جلد اوّل، طبع ہند ۱۹۳۸، ص ۴۔ ۲۔

اگرچہ امیر خسرو نے اس مہم کی قطعی تاریخیں نہیں دی ہیں لیکن ان کے بیانات میں بعض ایسے قرائن ملتے ہیں کہ جن کی بنا پر ممکنہ تاریخیں متعین کی جا سکتی ہیں۔ پہلی مہم کے زمانے میں جب کملا دیوی یعنی رائے کرن کی بیوی گرفتار ہوئی تھی تو اس وقت اس کی شیر خوار بچی دولدی گجرات ہی میں چھوٹ گئی تھی اور اس وقت اس کا سن صرف چھ ماہ تھا۔ دوسری مہم کے دوران جب دولدی کو گرفتار کر کے دہلی لایا گیا تو وہ امیر خسرو کے بیان کے مطابق آٹھ برس کی تھی۔ چنانچہ دوسری مہم کی تاریخ ۱۳۰۸ء ٹھہرتی ہے۔ ملاحظہ ہو دولرانی خضر خاں، ص ۸۲، ص ۵۔ ۸۴ اور ص ۹۳۔ نیز دیکھئے عصامی، ص ۷۔ ۲۸۶ جو دولرانی خضر خاں کی مکمل تصدیق کرتا ہے۔ خزائن الفتوح اور برنی کے ہاں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو ایس سی مصرا، مذکورہ بالا، ص ۶۔ ۶۵، کمیسریٹ، مذکورہ بالا، ص ۵۔ ۴ جو برگس کے ترجمہ تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۶۔ ۳۶۵ پر انحصار کرتا ہے۔

۸۳۔ مکمل بحث کے لیے ملاحظہ ہو دولرانی خضر خاں پر میرا مذکورہ بالا مضمون۔

۸۴۔ دولرانی خضر خاں، ص ۱۶۱ اور ۱۶۷، میرا مضمون مذکورہ بالا۔

۸۵۔ ایضاً، ص ۲۵۹۔

۸۶۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۷۔

۸۷۔ بقیہ نقیہ بحوالہ کے ایس لال، مذکورہ بالا، ص ۲۷۰ حاشیہ ۲۱۔

۸۸۔ یحییٰ سرہندی، مذکورہ بالا، ص ۸۲، نیز ملاحظہ ہو برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۷ اور ص ۴۰۸، کے ایس لال، مذکورہ بالا، ص ۲۷۰۔

۸۹۔ دولرانی خضر خاں، ص ۳۰۷۔

۹۰۔ ایضاً۔ نیز ملاحظہ ہو وحید مرزا، مذکورہ بالا، ص ۸۱۔۱۷۷، محمد حبیب، پالیٹکس اینڈ سوسائٹی، ص ۹۔۳۲۱۔

۹۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۶۔

۹۲۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۷ اور ۴۰۸۔

۹۳۔ نہ سپہر مرتبہ وحید مرزا، اورنگ آباد ۱۹۳۸ء، ص ۸۔۲۷۔

۹۴۔ یحییٰ سرہندی، مذکورہ بالا، ص ۸۲۔

۹۵۔ کے ایس لال، مذکورہ بالا، ص ۲۸۶۔

۹۶۔ کے ایس لال، مذکورہ بالا، ص ۲۸۹۔

۹۷۔ تغلق نامہ مرتبہ ہاشمی فرید آبادی، ص ۱۹۔

۹۸۔ تغلق نامہ، ص ۳۶، ۳۔۱۳۲، ۱۳۵، ۱۴۴ اور ۹۔۱۴۸۔

☆☆

امیر خسرو اور ہندوستان

ڈاکٹر تاراچند

نہ کسی ملک میں، نہ کسی زمانہ میں ایسا ہوا ہے کہ سب لوگ ایک مذہب رکھتے ہوں، ایک نسل سے ہوں، ایک زبان بولتے ہوں، سب کی رسمیں ایک ہوں اور ان کے خیالات میں کوئی فرق نہ ہو۔ ہر ایک ملک کی آبادی بھانت بھانت کی ملتوں اور قسم قسم کے گروہوں سے مل کر بنتی ہے۔ کوئی قوم ایسی نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں تنوع نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ قومیت کا تقاضا ہے کہ نسل، مذہب، تمدن، زبان کی کثرت میں وحدت کا جذبہ جاری اور ساری ہو۔

آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم تمدنی تنوع کو سماجوں کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو بنیاد مان کر ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کے فرق قومیت کے راستے میں حائل ہوں۔ اسی شک و شبہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ خصوصاً عہد وسطیٰ کی تاریخ کو علم کی شفاف روشنی میں نہیں بلکہ جذبوں کے گرد و غبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں۔ چونکہ قومی احساس کے بننے بگڑنے میں تاریخ کا گہرا اثر ہوتا ہے تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہئے غور نہیں کیا۔ تاریخ قوم کی لمبی اور وحدانی سرگذشت کی یاد ہے اسی طرح جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد ہے جو اس کے ذہن میں محفوظ ہیں اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ وحدانی سلسلہ ہے جس سے قوم اپنی نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتی ہے۔ تاریخ دانوں کی غفلت

اور بیراہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے۔ اپنی روایتوں کی غلط تفسیر سماج کے بندھنوں کو کمزور کر سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں اس معاملہ میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے جو ڈگر چلائی اس کے نتیجے ہمارے لئے بدبختی کا باعث ہوئے اور اگر اب بھی ہم نہ جاگے تو آئندہ کے لئے سخت نقصان پہونچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ امیر خسرو کے تعلق سے ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ اپنے اصلی رنگ میں ملک کے سامنے آئے اور غلط فہمیوں کے دروازے بند ہوں۔ امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرھویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملوان جلوان تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور ادیب اس زمانہ میں کیسے جذبے، کیسے خیال رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں پر جن میں اسلامی ملک بھی شامل تھے، ترجیح دیتا تھا، اس کے دل اور دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی فضا کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قومیت کا وہ جذبہ جو آج نظر آتا ہے اس زمانہ میں موجود تھا۔ آج سے چھ سو سال پہلے سماجی یا انفرادی زندگی میں اس کی تلاش الٹی گنگا بہانی ہے۔ منجھلے زمانہ میں سماجوں کا نظام آج سے مختلف تھا، رشتہ بندی کے اصول جدا تھے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت نسب کو دی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی کسی خاص قبیلہ یا ذات سے وابستہ ہوتا تھا اور قبیلہ یا ذات کے لوگوں کا رشتہ کسی (حقیقی یا خیالی) مورثِ اعلیٰ سے جا ملتا تھا، سب فرد اپنے آپ کو اس کی اولاد سمجھتے تھے۔ اس طرح اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان قبیلوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے سیکڑوں قبیلے اور ذاتیں تھیں اور یہی مسلمان کی حالت تھی۔ سیاست کا دارومدار نسبی اصول پر تھا، کل ہندوستان کی کوئی ایک ہندو جماعت تھی نہ کوئی ایک اسلامی۔ ہندوستان کے کچھ شمالی حصوں پر جو خاندان حکومت کرتے تھے وہ توران اور خراسان سے آئے تھے ان کا مذہب اسلام تھا مگر ان کی سیاست کی بنیادیں اسلامی نہیں کہی جا سکتیں۔ ان کے کاموں میں اسلامی وحدت کا جذبہ کارفرما نہ تھا ان کی سیاست خاندانی اور عشایری مفاد پر مبنی تھی اور یہی صورت ہندو راجوں مہاراجوں کی تھی۔ یہ بھی غلط عقیدہ ہے کہ جو فاتح باہر سے آئے وہ

مذہب اسلام پھیلانے کی غرض سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور یہ بھی کہ جن ہندو راجوں نے ان کا مقابلہ کیا وہ ہندو مذہب کی رکھشا کے لئے لڑے۔ دونوں طرف لڑائی زر، زن اور زمین کے واسطے تھی، دونوں طرف مذہب کی دُہائی دینے والے وہ مولوی اور پنڈت تھے جنہیں تلوار اٹھانے سے سروکار نہ تھا۔ تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ پر حملہ کیا۔ اس کے لئے شریعت کی کون سی حجت تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ سندھ میں بدھ مذہب کا خاندان راج کرتا تھا۔ برہمن وزیر نے اس کے خلاف سازش کی اور تخت سے اُتار دیا۔ عربوں کو خانہ جنگی کی خبر ملی، کچھ شکایتیں لے کر لوگ حجاج تک پہونچے۔ لیجئے موقع ہاتھ آیا۔ سمندری ڈاکوؤں کا بہانہ مل گیا۔ داہر سے معاوضہ طلب کیا گیا۔ اور اس کے انکار پر دھاوا بول دیا گیا۔ رعایا نے جو راجوں کے ظلم سے تنگ تھی۔ حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ سندھ کے شہر اور قلعے محمد بن قاسم کے ہاتھ آئے دونوں میں سے ایک کے سامنے بھی نہ کوئی مذہبی مقصد معلوم ہوتا ہے اور نہ اخلاقی۔

محمود غزنوی کے حملوں کو مذہب کے گہرے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ مگر تاریخ بتلاتی ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ سامانی خاندان کے امیر سبکتگین کے دل میں اپنے آقا کے خلاف آگ بھڑکتی ہے، سبکتگین کا لڑکا محمود جو ایک جری سپاہی اور اولوالعزم سپہ سالار تھا، سامانیوں کو خراسان سے نکال کر سلطنت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کے سامنے آل بویہ اور خلیفہ بغداد کا جھگڑا آتا ہے آل بویہ مذہب سے شیعہ تھے خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ خلافت تو خود ہی دم توڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی عمر میں کچھ سال بڑھانے کے لئے محمود کا سہارا ڈھونڈا۔ محمود کو ایران پر تسلّت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مسلم اور غیر مسلم فوج لے کر شمالی ایران کو روندنا شروع کر دیا، ایلخانیوں اور دیلمیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ ادھر مشرق کی سرحد پر ہندوستانی راجے جنہیں سبکتگین نے افغانستان سے باہر کر دیا تھا اس تاک میں تھے کہ کھوئے ہوئے ملک کو پھر لے لیں۔ محمود نے دوکھی لشکر کشی شروع کر دی، ایک مرتبہ ہندوستان پر حملہ کرتا تھا اور دوسری بار وسط ایشیا یا ایران پر، نہ مسلمان ریاستوں نے اس کا مقابلہ کیا نہ ہندو راجوں نے۔

ادھر اس نے اسلامی علاقوں پر قبضہ کیا ادھر مندروں کو گرایا اور مال و دولت کو لوٹا،

نہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کی نہ ہندوؤں کو چھوڑا۔ درباری شاعروں نے تعریف کے پُل باندھ دیے، خلیفہ نے یمین الدولہ اور امین الملّت کے خطابوں سے نوازا۔ کوئی پوچھے جس شخص نے ایران کے مسلمان حاکم خاندانوں کو تباہ کر دیا اور خلافت کو اپنی قسمت پر چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چنگیز اور ہلاکو غیر مسلم سرداروں نے اسلامی مملکتوں اور عباسی خلافت کو خاک میں ملا دیا اسے کس طرح اسلامی دولت کا بایاں ہاتھ اور اسلامی ملّت کا بھروسہ سمجھا جائے۔ پھر محمود آتا ہے، متھرا کو، نگرکوٹ کو، قنوج کو، سومنات کو تہہ و بالا کر دیتا ہے، کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ کسی ہندو سنگھٹن نے ان پوتر استھانوں کی حفاظت کے لئے کوشش کی۔ غزنی سے پاٹن اور غزنی سے کالنجر تک دھاوے ہوتے ہیں، سوائے مقامی راجوں کے کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ کیسا تعجب ہے کہ ان نیم وحشیانہ خون ریزیوں کو ہندو دھرم اور اسلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا کیا جواب ہے؟ کیوں محمود نے اپنی فوج میں ہزاروں ہندو سپاہی بھرتی کر رکھے تھے کس طرح محمود نے ہندو سرداروں سندر، تلک، سیوندرائے پر اعتماد کیا۔ احمد نیا تگین ہندوستان کا حاکم مقرر ہوتا ہے، بغاوت کا جھنڈا اٹھاتا ہے، محمود تلک کو اس کی سرکوبی کے لئے ہندوستان بھیجتا ہے تلک اور ہندو جاٹ مل کر احمد نیا تگین کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ کرمان میں جنگ ہوتی ہے۔ محمود کی فوج کا سردار نوشی تگین دو ہزار ہندو اور ایک ہزار ترک اور ایک ہزار کرد اور عرب سپاہیوں کو لے کر لڑنے جاتا ہے دشمنوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر فوج تتر بتر ہو جاتی ہے ہندوستانی افسر بھاگ کر غزنی پہونچتے ہیں۔ محمود انہیں برخاست کرتا ہے۔ چھ ہندو افسر اتنے شرمندہ ہوتے ہیں کہ جگر میں خنجر بھونک لیتے ہیں اور جان قربان کر دیتے ہیں۔ وسط ایشیا میں مرو کے مقام پر محمود کے ہندو سپاہی لڑتے نظر آتے ہیں۔ شابورگان میں ہندو فوجی خیموں کی نگہبانی کرتے ہیں۔ ہندو فیلبان محمود کے جنگلی ہاتھیوں کی فیلبانی کرتے ہیں۔ بلخ کے نزدیک فوج کا خیمہ ہے اور اس جگہ کا نام کافرون کا حصار ہے۔ ان واقعات کی کیا تشریح ہے؟ بُت شکن بادشاہ اور بُت پرست سپاہیوں کا کیا رشتہ تھا؟ ہندو افسر کیوں مسلمان امیر کے لئے جان دیتے تھے، مسلمان امیر کیوں ہندو افسر پر بھروسہ کرتا تھا؟

محمود کی اولاد قریب ایک سو پچاس برس تک پنجاب پر حکومت کرتی ہے۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں کہیں ہل چل نہیں ہوتی ہندو سماج میں کوئی ایسا من چلا نہیں نکلتا جو

مذہب کے نام پر راجاؤں کو جمع کرے۔ اور دشمنوں سے پوچھ گچھ کرے، لیکن غزنویوں سے اگر کوئی پنجاب کو خالی کراتا ہے تو وہ غوریوں کا خاندان ہے۔ انہیں کے معرکوں سے ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، پہلے شمالی ہندوستان اور پھر دکن میں ترکوں کی حکومت قایم ہوتی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا خاندان تاج وتخت کا مالک بنتا ہے لیکن کسی بھی خاندان کی سلطنت سو برس سے زیادہ نہیں چلتی۔

التمش، بلبن، علاؤالدین خلجی، محمد بن تغلق نے بڑے دبدبے کے ساتھ حکومت کی لیکن ان کی کامیابی ان کی ذات تک محدود رہی ان کے مرنے کے ساتھ طوایف الملو کی پھیلی۔ نہ کوئی ایسی ملت قائیم ہوئی جو ان میں سے کسی خاندان کی پشت وپناہ ہوتی اور نہ کوئی ایسا سماجی طبقہ بنا جو انہیں سنبھالے رکھتا۔ اگر ہندوؤں نے ان سے طاقت چھیننے کی کوشش نہیں کی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے قبیلوں اور خاندانوں میں کوئی ایکتا نہیں تھی، مذہبی اور سماجی زندگی کو سیاست کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں تھا، اسلامی ملت اور ہندو سماج کے تصوّر، حقیقت سے کوسوں دور تھے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے مذہبی جنگ وجدل ایک فسانہ ہے۔ جسے انیسویں صدی کے فرنگی تاریخ دانوں نے گھڑا۔ ممکن ہے اسے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح سمجھتے ہوں، ممکن ہے انہیں سچ مچ یقین ہو کہ واقعات کی نوعیت یہی ہے، لیکن کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تاریخ کے ان گلے سڑے غلافوں کو اتارا جائے اور ان کی فرضی نظریوں کی سختی کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے، تاریخ کو مذہب نہیں علم کی روشنی میں پرکھا جائے۔

اس زمانہ کے ہندوستان میں دو مذہب اہمیت رکھتے تھے دونوں مذہب انتہائی لطیف اور پاکیزہ خاصیتوں کے حامل تھے، دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ قدروں کے پشت وپناہ تھے۔ ان کے وسیلہ سے انسان حقیقت میں انسان بنتا ہے، اپنی سفلی خصلتوں اور حیوانی خواہشوں پر غلبہ پاتا ہے لالچ، غصّہ، حسد، شہوت، بے رحمی اور تنگ نظری کی غلاظتوں سے دل کو صاف اور دماغ کی کدورتوں کو دور کرتا ہے۔ دونوں وجدان اور نفس میں ہم آہنگی پیدا کرتے اور انصاف اور حق، انسانی محبت اور خلق کی خدمت کی دعوت دیتے ہیں۔ کس طرح ان مذہبوں کو قتل و غارت، دشمنی اور آزار کا جواز مان لیا جائے۔ بات یہ ہے جنگ اور جدل کی وحشیانہ حرکت کے لئے ہر زمانہ میں لوگ عذر ڈھونڈتے رہتے ہیں اپنے بہیمانہ اعمال کو مذہب کے سر تھوپتے

ہیں بیسویں صدی میں یورپ کی دونوں لڑائیوں میں دونوں طرف کے عیسائی پادری اپنی قوم کو حق بجانب اور دوسری کو شیطان کا پیروکار مانتے تھے۔ خدا اور پیغمبر سے دعا مانگتے تھے کہ مذہب کے دشمنوں کو شکست نصیب ہو۔ ایسی ہی کچھ کیفیت ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تھی۔ سچ پوچھئے تو مذہب اور دھرم کی ٹٹی کے پیچھے ملک اور دولت کے لالچی شکار کھیلتے تھے ملت اور سماج کا جو تصور آج ہے اس وقت کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ تاریخ دانوں کی قطعی غیر واجب اور غیر تاریخی کوشش ہے جو اس زمانہ کے کارناموں میں آج کل کے محرکات کو کارفرما سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ تاریخ کی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ایک طرف امن اور شانتی کا نظارہ ہے، اس میں انسانیت کے ارتقا، ہمدردی اور ہمکاری کی توسیع اور مانو پریم کے پھیلاؤ کی جھانکی ہے، دوسرا رُخ لال خون سے رنگا ہوا ہے، اس زمین میں انسانی خون کے پیاسے۔ جاہ و دولت کے لالچی اور زبردستی کے دیوانے گھمنڈ کے گھوڑوں پر سوار اِدھر اُدھر دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذہب کا پہلے رُخ سے واسطہ ہے اسے تاریخ کے دوسرے رخ سے وابستہ کرنا مذہب کی توہین ہے، انسانیت اور اخلاق کا منہ چڑھانا ہے۔

مجھے اس لمبی تمہید کی ضرورت اس لئے معلوم ہوئی کہ امیر خسرو کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ جس زمانہ میں امیر خسرو نے زندگی بسر کی اس زمانہ کے ذہنی ماحول کا اثر ان پر ناگزیر تھا، ان کے قلم سے بھی کبھی کبھی ایسے فقرے نکل جاتے ہیں، جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ اسلام کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں اور دوسرے مذہبوں پر اس کی برتری کے قایل ہیں کبھی ایسے لفظ بھی استعمال کرتے ہیں جو رواداری کی نزاکتوں کو ٹھیس لگاتے ہیں۔ باوجود اس کے گہری نظر سے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کس قدر ان کا دل اور دماغ ہندوستانیت سے لبریز تھا۔

اصل یہ ہے کہ خسرو کی ذات قرآن السعدین تھی، جس میں دو تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ ان کے والد لاچین قبیلہ کے ترک تھے ماں نسل سے ہندوستانی اور عماد الملک راوتِ عرض کی بیٹی تھی۔ خسرو اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں "زنسل عارض آسود منم" یعنی نانا رنگ کے سانولے تھے۔ باپ بے پڑھے تھے لیکن امیر آدمی تھے پیشہ سپاہی کا تھا۔ مگر خسرو آٹھ برس کے ہوئے تو سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا، بوڑھے نانا کی سرپرستی میں دہلی میں تعلیم ہوئی۔

مہربان ماں کی لاڈلی گود میں پلے اور بڑے ہوئے لیکن مکتبوں اور استادوں کی شاگردی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ خسرو تلمیذ الرحمٰن تھے، قدرت نے ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، شاعری کو طبیعت سے فطری مناسبت تھی، ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے تھے کہ شعر کہنا شروع کردیا۔ کہتے ہیں ''دراں صغرسن کہ دنداں میافتاد سخن میگفتم۔'' خواجہ عزالدین سے جو بڑے عالم تھے۔ خسروِ سخن کا لقب ملا، انیسویں سال میں اپنے بچپن کے کلام کا دیوان ''تحفۃ اصغر'' تیار کردیا۔ امیر خاندان کے تھے شروع ہی سے امیروں کے درباروں سے تعلق ہوگیا۔ خسرو نے اپنی بہتر برس کی عمر میں سات سلطانوں کا زمانہ دیکھا۔ اکثر نے ان پر عنایت کی اپنے خاص ندیموں میں جگہ دی، عزت و اکرام کی نگاہ سے پرورش کی۔ کچھ حاسدوں کو یہ پسند نہ آیا لیکن ان کی دشمنی سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خسرو کو ابتدائی جوانی میں محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت کا فیضان حاصل ہوا۔ ان کی صحبت میں دنیا کے علائق سے تیاگ، قناعت کی برکت ملی اور بے نیازی سیکھی اقرار کرتے ہیں :

نیت آں دارم از یں پس بہ راز
کز درشہ نیز شوم بے نیاز

اس کے بعد سے خفیہ طور پر میری یہ نیت ہوگئی ہے کہ میں شاہی دربار سے بھی بے نیاز ہوجاؤں۔

پشت نہ جویم نہ پناہی زکس
چوں بہ خداوند کنم روی وبس

(قرآن السعدین)

نہ مجھے کسی کی پشت پناہی کی ضرورت ہے نہ اماں کی۔ بس میں نے تو اپنے آقا اور مالک کی طرف اپنا رجحان کرلیا ہے۔

استغنا کا یہ عالم تھا :

من کہ نہادم زسخن گنج پاک
گنج زر اندر نظرم چیست خاک

(قرآن السعدین)

میں نے شاعری کی دولت اور خزانہ جمع کیا ہے روپے کا خزانہ میری نظر میں ہیچ ہے ان کے کردار پر صائب کا یہ شعر صادق آتا ہے :

دستِ طمع پیش کناں چوں میکنی دراز
پل بستۂ تابگوری از آبروئے خویش

اگر حرص اور لالچ کا ہاتھ تو نے کسی کے سامنے پھیلایا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ تو نے ایک پُل باندھ لیا ہے، جس پر ہو کر تو اپنی عزت و آبرو سے گذر جاتا ہے یعنی اپنی عزت کھو بیٹھتا ہے۔

خسرو صوفی منش درویش انسان تھے ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت تھی۔ ان کی شاعری بھی ان صفتوں کی حامل ہے۔ شاعروں میں ان کا پایہ اونچا ہے ہندوستان میں کوئی ان کا مثل پیدا نہیں ہوا، زندگی میں خراسان اور ایران سے خراج تحسین حاصل کیا اور آج بھی ایران میں چوٹی کے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔

شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ خسرو اس قول کے بہترین نمونوں میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں تیرہویں اور چودہویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا سنہرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاسیات کی روشن تصویریں ہیں، اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگارنگ جھلکیاں ہیں، شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے۔ راہ عشق کے پیچ و خم محبت کے مستانوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں، آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے، اور ناکامیوں کا المیہ پند و نصیحت، حکمت و تدبیر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے جو خسرو سخن کی قلمرو کے باہر ہے۔

کلام کا حجم اتنا ہے کہ ایک مقالہ میں اس کا احاطہ غیر ممکن ہے۔ میں آج اس کے صرف چند پہلوؤں کی طرف آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ میرے مضمون کا پہلا عنوان ہے ''خسرو اور ہندوستان۔'' پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان دنیا کے تمام ملکوں سے بہتر اور برتر ہے۔ کہتے ہیں ''کشور ہند است بہشتی ......'' اور اس کے ثبوت میں ایک نہیں سات حجتیں پیش کرتے ہیں۔ حجتوں کو جانے دیجئے۔ ان کے پیچھے جو جذبہ ہے دیکھئے کہتے ہیں اس وجہ سے ہند کو ترجیح دیتا ہوں:

آنست یکی کین زمین از دور زمن
ہست مرا مولد و ماوئی و وطن

ان میں سے ایک یہ ہے کہ اتفاق زمانہ سے یہ ملک میری پیدائش کی جگہ اور پرورش پانے کا مقام اور وطن ہے :

دین زرسول آمدہ کائی زمرہ دین
حب وطن ہست زایماں بہ یقین

(حب الوطن من الایمان)

اور یہ رسول اللہ کی حدیث ہے کہ اے دین والو وطن سے الفت رکھنا ایمان کا یقیناً جز ہے۔

پھر دس دلیلیں اس بات کی دیتے ہیں کہ کیوں ہند کو روم، عراق، خراسان اور قندھار پر فوقیت حاصل ہے۔ کئی دلیلیں اس بات کی دی ہیں کہ ہندوستان کی ہوا خراسان سے بہتر ہے :

نی چو خراسان کہ تن از برف فزون
سرد پیاز یست بدہ شقہ درون

وہ خراسان کی طرح نہیں ہے جہاں جسم سردی کی زیادتی کی وجہ سے ٹھنڈا اور اندر پیاز کی طرح دس خولوں والا ہو جاتا ہے۔

پھر کہا ہے :

چارم شاں کیں طرف از سبزہ وگل
ہست ہمہ سال بہار و گل و مل

چوتھی دلیل ہندوستان کی خوبی کی یہ ہے کہ اس کے اردگرد چاروں طرف سبزہ اور پھولوں کی فراوانی کی وجہ سے پورے سال بہار اور کھلے ہوئے پھولوں اور شراب کا منظر دکھاتی دیتا ہے۔

اور ہندوستان کے خوشبودار پھولوں، قسم قسم کے میووں، بے گٹھلی کیلے اور پان کی تعریف میں شعر کہتے ہیں، پان کا ذکر یوں کرتے ہیں :

ہست دھم من کہ چو تنبول گزین
میوہ نباشد بہ ہمہ روی زمین

دسویں یہ کہ پان جیسا منتخب میوہ ساری دنیا میں نہیں ملتا۔

آم اور انجیر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ان لوگوں کو جو انجیر کے سامنے آم کی کم قدر کرتے ہیں لاف زد کا لقب دیتے ہیں۔پھولوں پر اس قدر گرویدہ ہیں کہ ایک ایک کا نام لیکر تعریف کرتے ہیں۔گل کوزہ، صد برگ، بیل جوہی، کیوڑا رائے چمپا، مولسری، دونہ، کرنا، سیوتی، سب کا بیان کرنے کے بعد خراسانی پھولوں سے برتری کا سبب بتاتے ہیں :

چو بینی ارغوان ولالہ خندان
کہ رنگی ہست بوئے نیست چندان

اگر ارغوانی لالہ کو ہنستا ہوا تو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ ان کے رنگ تو خوب ہیں لیکن خوشبو نام کو بھی نہیں۔

گل مارا بہ ہندی نام زشت است
وگرنہ ہرگلی باغ بہشت است

مارے پھولوں کے نام ہندی ہونے کی وجہ سے خراب ہیں ورنہ حقیقت میں ہمارے باغ کا ہر پھول باغ جنت کی طرح ہے۔

گر این گل خاستے در روم و شام
کہ بودے پارسی یا تازیش نام

اگر یہ پھول روم اور شام میں اُگتا تو اس کو پارسی یا عربی نام ملتا۔

شدے معلوم تامرغان ان بوم
چسان غلغل زدندے در رو روم

اور جب اس سرزمین کے پرندوں کو پتہ چلتا تو وہ رے اور روم کے شہروں میں اس طرح غلغلہ مچاتے۔

کہ ایں گل چنیں باشد کہ سالے
دہد بود در ماندہ از نہالے

کہ یہ پھول اس سال اس طرح کا ہوگیا ہے کہ درخت سے دور دور تک خوشبو پھیلاتا ہے۔

کپڑوں کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

نکو دانند خوبان پری کیش
کہ لطف دیوگیری از کتاں بیش

پریوں جیسی خصلت رکھنے والے حسین اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوگیری کا کپڑا بڑا باریک ہوتا ہے۔

زلطف آں جامہ گوئی آفتابیست
دیا خود سایہ یا ماہتابیست

لطافت میں جو کپڑا آفتاب کی طرح معلوم ہوتا ہے اور یہ کہئے کہ وہ خود ہی سایہ ہے یا چاند ہے۔

ورنگل سے جو تحفے آتے ہیں ان میں ایک قسم کا کپڑا ہے۔

مہین جامہ ابریشمین ہندوانہ
کہ یک گز شود دہ کشندار دوانہ

ہندوستان کے ریشم کا بُنا ہوا کپڑا اتنا مہین اور باریک ہوتا ہے کہ ظاہرا طور پر تو وہ ایک گز معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے دس خیمے ایستادہ کئے جاسکتے ہیں۔

زبس لطف دہ گز بدیدہ بگنجد
کہ دیدہ زگنجیدن ان نرنجد

اس کا دس گز کپڑا آنکھوں میں سما سکتا ہے اور اس کے سما جانے سے آنکھوں کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔

نہ زو بگذرد دہم نہ آبے نہ چربی
نہ چوں قطرۂ آب پیکان حربی

نہ اس میں سے پانی نکل سکتا اور نہ کسی طرح کی چکنائی گذر سکتی ہے۔

اور نہ جنگی تیر اس طرح پار ہو سکتا ہے جس طرح پانی کا قطرہ نہیں نکل سکتا۔

اور ایک کپڑے کے بارے میں کہتے ہیں۔

جامہ ہندی کہ ندانند نام
از تنگی تن بنماید تمام

ہندوستان کا ایک کپڑا ہے جس کا نام لوگ نہیں جانتے وہ اتنا باریک ہوتا ہے، کہ اگر اسے کوئی پہنے تو سارا جسم نظر آتا ہے۔

مانند پیچیدہ بناخن نہان
باز کشائیش بپوشد جہان

اگر اس کو ناخن میں بھی لپیٹ لیا جائے تو پوشیدہ ہی رہے حالانکہ اگر اس کو کھولیں تو ساری دنیا ڈھانپ لے۔

یہ ڈھاکہ کا ''آب رواں'' تو نہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پورا تھان ایک انگوٹھی کے حلقہ میں سے نکل جاتا تھا؟

ہندوستان کے پرندوں کا بیان بھی سن لیجئے۔ طوطے کے بارے میں کہتے ہیں۔ جانور نہیں آدمی ہے۔

فاتحہ و اخلاص و دعا در دہنش!
با من و تو ہم چو من و تو سخنش

اس کی زبان پر سورۂ فاتحہ واخلاص اور دعاؤں کا ورد رہتا ہے اور ہمارے تمہارے ساتھ تمہاری ہماری طرح باتیں کرتا ہے۔

پھر شارک کا ذکر کرتے ہیں کہ ویسا پرندہ نہ عجم میں ہے نہ عرب میں۔ کوّے کی کائیں کائیں میں بھی خاص اثر ہے اس کی بولیوں سے شگون لیتے ہیں اور چڑیا تو پنہاں راز کی خبر دیتی ہے۔ لیکن مور کے لئے تعریفوں کے دریا بہا دیئے ہیں پوچھتے ہیں۔

گرنہ بہشت اس ہمیں ہند چرا
از پے طاؤس جناں گشت مرا

اگر ہندوستان بہشت نہیں ہے تو پھر مور کی وجہ سے میرے لئے جنت بن گیا ہے۔

کہیں اسے طائر فردوسی کہا ہے، کہیں بتایا ہے کہ ہُد ہُد جو مرغ سلیماں ہے، اس کے زرّیں تاج کو دیکھ کر انگلی کاٹتا ہے اور آخری میں فیصلہ دے دیا ہے۔

همه دانند که پیدا و نہاں
نیست چنیں مرغ در اطراف جہاں

پوشیدہ اور ظاہر اطور پر سب جانتے ہیں کہ اطراف عالم میں اس طرح کا پرندہ کوئی نہیں۔ جانوروں میں ہرن کی چال، گیدڑ کے زیر و بم، گھوڑے کے ناچ، بندر کی عقل، بکرے کا لکڑی پر چاروں طرف سُم رکھ کر تھر کنا اور ہاتھی کا آدمیوں کے سے کام کرنا بہت مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ لیکن ہندی حسینوں کو دیکھ کر تو بے تاب ہو جاتے ہیں۔ سو ملک چین بھی ہندوستان کے ایک بال کے برابر نہیں، یغما اور یغما اور بلخ کے خوبریوں کی آنکھیں ضرور چمکتی ہیں لیکن چہروں پر ترشی ہوتی ہے، خراسانی سُرخ وسفید ہیں لیکن خراسانی پھولوں کی طرح بے بو ہیں، روم اور روس کا حال مت پوچھئے۔

سپید وسرد هم چو کنده یخ
کزیشان دم خورد خاتون دوزخ

برف کی سلّی کی طرح سفید اور ٹھنڈے ہوتے ہیں، جن کو دیکھ کر دوزخی عورتوں کی سانس اکھڑ جائے۔

تاتاریوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ختن والیوں میں ملاحت نہیں، سمرقندی اور قندھاریوں میں شیرینی کی کمی ہے تو مصریوں میں چستی اور چالاکی کی۔ غرض کہیں بھی وہ خوبروئی اور دلربائی نہیں جو ہند کی حسیناؤں میں ہے۔

ہندوستان میں جو جگہ سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہی آپ کا شہر دہلی ہے کہتے ہیں۔

شہرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است که آباد آباد

دہلی کے دین اور انصاف کی شہرت اطراف میں پھیلی ہوئی ہے یہ

عدن کی جنت ہے۔ خدا اس کو آباد رکھے۔

ہست چون ذات ارم اندر صفات
حرسہا اللہ عن الحادثات

یہ اپنی صفات اور خصوصیات کی بنا پر باغ ارم کی طرح ہے خدا اس کو زمانے کے حوادث سے محفوظ رکھے۔

پھر اس کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے ثبات کو فلک ثانیہ کا نمونہ بتاتے ہیں، جامع مسجد کو کعبہ سے ملا دیتے ہیں، قطب مینار کو آسمان تک پہونچانے والی سیڑھی اور آسمان کو سنبھالنے والے ستون سے، حوض خاص کے پانی کو نور سے، جس میں آسمان کا عکس نظر آتا ہے جس کی تہ میں ریت کے دانوں کو اندھا آدمی رات کی اندھیاری میں گن سکتا ہے۔ دہلی بلند مرتبہ تاجداروں کا پایۂ تخت ہے جہاں اہلِ جنت کی مانند خوش دل اور خوش خو ہیں۔ صنعت میں علم وادب میں گانے بجانے اور کرتبوں میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں۔

ہند کے موسموں کا بیان کس آب وتاب کے ساتھ کرتے ہیں! جاڑا آتا ہے تو ہندوستان جنت نشان ہو جاتا ہے گھر اور باہر، باغ اور میدان سبزہ زار بن جاتے ہیں۔ بہار میں پھول ہنستے ہیں، بلبلیں گاتی ہیں، عاشق اور معشوق گھروں سے باہر سیر کو نکل آتے ہیں دنیا نوروز کا جشن مناتی ہے۔ گرمی تو اس ملک کا خاصہ ہے لیکن یہ اس لئے ہے کہ :

مہر فلک گرم شد اندر وفاش
گرم ازاں گشتہ جہاں را ہواش

اس سے وفاداری کے عشق میں آسمانی سورج گرم ہو گیا ہے یعنی اس میں گرمی ہندوستان سے عشق کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور پھر اس سے سارے عالم کی ہوا گرم ہوئی ہے۔

برسات کا موسم آیا تو آسمان پر بادلوں کا شامیانہ چھا گیا، جنگل میں ہر طرف سبزہ کی صفیں تیار ہو گئیں، دھان کے پودوں کے سر پانی میں ڈوب گئے، باغوں میں پھلوں کے درخت میووں سے لد گئے، نالے اور ندی چڑھ گئے بطخیں اٹھلاتی ہوئی گھومنے لگیں۔ پھر خزاں کی فصل نے ہوا کے بچھڑوں کو گلشنوں کی بربادی کے لئے چھوڑ دیا، چنبیلی سوکھ کر پیلی

پڑ گئیں، بنفشہ نے نیلا لباس پہن لیا۔ سوسن، صد برگ، سیوتی کے پھولوں کی پتیاں گر گئیں اور درخت ننگے ہو گئے بلبل غمگین اور طوطے گونگے ہو گئے۔

اپنے دیش کے چرندوں، پرندوں، ہوا، پانی، نگر اور جنگل، مرد و عورتوں کے رنگ و روپ سے خسرو اس قدر متاثر تھے کہ بار بار ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے گن گاتے تھکتے نہیں۔ لیکن یہ تو پھر بھی سطحی چیزیں ہیں اور شاعروں کا بھی دھیان اس طرف گیا ہے جو بات کم ملتی ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ جس طرز سے خسرو نے ان پر گہری نظر ڈالی ہے اور ایک بے لاگ مگر ہمدردی سے بھری ہوئی تنقید کی ہے اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔

زبان کا مسئلہ آج بیسویں صدی میں جھگڑوں کی جڑ ہے، ایک تیرہویں صدی کا وطن پرست شاعر زبانوں کا کس طریقہ سے مقابلہ کرتا ہے، دیکھنے کے قابل ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو ہندوستان کی سب عوامی بولیوں سے واقف تھے، کم سے کم نام کی حد تک۔ گو ان کے اپنے لفظ یہ ہیں۔

من بہ زبانہا کساں بیشتری
کردہ ام از طبع شناسا گذری

میں لوگوں کی اکثر زبانوں سے واقفیت رکھتا ہوں اور اپنی سمجھنے والی طبیعت کے ذریعہ ان سے واقفیت حاصل کی ہے۔

دانم و دریافتہ وگفتہ ہم
جستہ و روشن شدہ زاں بیش وکم

ان میں سے کچھ کو جانتا ہوں، کچھ سے یوں ہی آگاہ ہوں کچھ میں شاعری کرتا ہوں اور ان میں سے اکثر و بیشتر سے مجھ کو روشنی اور دانش حاصل ہوئی ہے۔

پھر سندھی، لاہوری (پنجابی) کشمیری، کبری (کنبر) دوار سمندر (تامل) معبری (اندھرا) گوری (بہاری)، بنگالی و دہلوی کے نام گناتے ہیں، یہ زبانیں آج بھی رائج ہیں اور ہندوستان کے آئین میں درج ہیں۔ مگر ہندوستان کی ان بولیوں کے علاوہ سنسکرت

زبان ہے جو پُرانے زمانے سے برہمنوں کے نزدیک منتخب ہے لیکن عوام کو اس کی خبر نہیں اور ہر ایک برہمن بھی اس کی حدوں سے واقف نہیں۔ اس زبان میں چار وید ہیں، علم و دانش کے آئین ہیں اور قصے اور افسانے۔ سنسکرت، ادب کا سبق پڑھاتی ہے، اور فنون کو سکھلاتی ہے صَرف و نحو و علم و ادب میں سنسکرت، عربی کے مشابہ ہے اور فارسی سے برتر۔ یہ خسرو کا تجزیہ ہے۔

فارسی اور عربی کا مقابلہ خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں کیا ہے اور فیصلہ یہ دیا ہے۔ ''پس از روی حجت معقول ضرورت است کہ پارسی بر عربی راجح باشد۔'' ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ رائے پسند نہ ہو اس شعر سے حجت ختم کر دی ہے۔

مرا ہر حجتی کامد زسوی خویشتن گفتن
توہم گر حجتی داری زسوی بیرون کش

میں جو بھی دلیل پیش کرتا ہوں وہ میری اپنی ہے تیرے پاس بھی اگر کوئی دلیل ہے تو بھی اس کو سامنے لا۔

زیادہ حجتیں اس لئے نہیں دیں کہ ''سفیہاں پر غضب و تعصب بیرون خواہند آمد۔'' فارسی اور عربی کی بحث میں یہ مانا ہے کہ عربی کی فضیلت محض شرعی ہے اس لئے کہ اس کے اشعار میں قرآن سے استشہار کیا ہے لیکن شعری نہیں۔ ثابت کیا ہے کہ تین وجہوں سے فارسی عربی پر سبقت لے جاتی ہے۔ اوّل میزان فارسی، میزان عربی سے بہتر ہے دوم عربی میں لفظوں کے معنی کئی کئی ہیں اور ایک معنی میں کئی کئی لفظ ایسا فارسی میں نہیں۔ تیسرے عربی میں صرف قافیہ ہے اور فارسی میں قافیہ بھی ہے ردیف بھی، کہتے ہیں،

''پس چوں شعر فارسی بہ حسن وزن و لطافت معنی و از دیار ردیف از مادر طبع زاید زاید ایں حسن مادر زادہ را کجا اندازہ باشد۔''

پس فارسی عربی سے سخن و شعر کے نقطہ نظر سے بہتر ہے اور سنسکرت ''برتر ز دری۔'' ''نہ سپہر'' میں کہتے ہیں ''اگر چہ دری شیریں و شکرین ہے لیکن سنسکرت میں ذوق عبارت اس سے کم نہیں۔'' زبانوں کے موازنہ میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں عربی، فارسی اور ترکی کے دنیا میں پھیلنے کا سبب بیان کرتے ہیں۔

وین روش ہست کہن کان سخنی
کش بود از تا جوران کن مکنی

یہی پرانا قاعدہ چلا آرہا ہے کہ بادشاہوں کے فرمانوں کے جاری
کرنے یا ان کی امرونہی کی وجہ سے زبان پھیلتی ہے۔

چوبہ کہ دمہ رسد از گفت شہان
عام شود درہمہ اطراف جہاں

جب وہ بادشاہوں کی گفتگو سے ہوکر چھوٹے چھوٹے لوگوں تک
پہونچتی ہے تو پھر ساری دنیا میں عام ہو جاتی ہے۔

مثالیں دی ہیں جب خلافت بغداد پہونچی تو پارسیوں کا زور ہوااور سب عرب آئین پارسی ہو گئے۔غوری اور ترک جن کی زبان فارسی تھی ہندوستان میں نمودار ہوئے تو ہم نے فارسی سیکھ لی۔ چونکہ عربی قرآن کے لئے چن لی گئی تھی اس لئے اس کی جگہ فصاحت کی دنیا میں نادر ہوئی۔ اصل یہ ہے زبانیں بہت ہیں اور ہر ایک زبان میں اپنا نمک ہے۔ پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ شوروغل کہ میری زبان اوروں سے بہتر ہے یا یہ کہ ایک شربت قند ہے اور دوسری سرکہ، بیہودہ گفتگو ہے۔

زبانوں کے ساتھ علم بھی آجاتا ہے۔ جب یہ ثابت کر چکتے ہیں کہ ہند کی ہوا تمام دنیا سے بہتر ہے اور صرف باغ جنت سے ایک درجہ کم تو ہند کی حکمت ودانش کا جائزہ لیتے ہیں خسرو کے نزدیک یونان کا فلسفہ مشہور ہے لیکن ہندوستان بھی صرف تہی مایہ نہیں بلکہ ہر علم میں بہتر فکر کامال ہے۔ یہاں منطق ہے نجوم ہے اور معقولات میں برہمنوں نے ارسطو کے دفتر قانون کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ علم طبیعی، ریاضی، ہیئت، سب ہی ان کے یہاں ہیں مثلاً ابو معشر جو دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ستارہ شناس تھا دس برس ہند میں رہا اور اس نے بنارس میں علم نجوم سیکھا۔ وہ خود قبول کرتا ہے جو کچھ اس نے سیکھا وہ سب ہند کی سیاحی کی بدولت تھا۔ ہندسہ کا علم بھی ہندوؤں کا وضع کیا ہوا ہے۔ صرف ان کی ایک صفر کی ایجاد سے ریاضی بنی اقلیدس علم کے درجے پر پہنچے۔ صفر کی رقم دریافت کرنے کا سہرا آسانامی عالم کے سر پر ہے اور اس کے نام کے ساتھ ہند جوڑ دینے سے ہندسہ کی اصطلاح بنی ہے۔ یونانی اور

دوسرے حکماء آسا ہی کے شاگرد ہیں۔

ہندوستان کی برتری یہاں ختم نہیں ہوجاتی ،کلیلہ ودمنہ کی کتاب جو بہترین حکمت کی کتاب ہے۔یہیں کی پیداوار ہے۔پھر شطرنج کا کھیل ہے جو ہند ہی کی ایجاد ہے۔جس سے طبیعت بہلتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی قوت بڑھتی ہے۔

زوحد و اندازہ بجستند کسی
غایت و پایانش ندانست کسی

حد اور انداز سے بڑھ کر اس کی حقیقت کو پانے کی کوشش کی لیکن کوئی
بھی اس کی غایت اور انتہا کو نہ سمجھ سکا۔

ہند کا سنگیت سارے جہاں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ،دنیا بھر کے لوگوں نے اسے یہاں سے سیکھا ہے لیکن یہ ہنر ایسا ہے کہ تیس چالیس سال ریاضت کرنے پر بھی اس کی سبک آواز کو ادا کرنا مشکل ہے۔اس سنگیت میں ایسی کشش ہے کہ ہرن سن کر بے ہوش ہوجاتا ہے، بے تیر وکمان کے سنگیت کا طنطلہ اس کے دل میں پیوست ہوجاتا ہے۔اور بے چارہ جان دے دیتا ہے۔فرق دیکھئے۔عرب کا اونٹ حدی خواں کی آواز سنتا ہے تو اور تیز تیز چلتا ہے لیکن ہرن ہندی گانے سے ایسے حواس کھوتا ہے کہ مرنے کی نوبت آجاتی ہے۔

ہندوستان کے علم وفن سے مذہب کی طرف آتے ہیں۔کہتے ہیں یہ تو ٹھیک ہے ہندو ہماری طرح دیندار نہیں ہیں پھر بھی ہمارے اکثر مسلکوں کا اقرار کرتے ہیں۔جن اصولوں پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں۔وحدت، ہستی ،قدامت ،عدم سے ایجاد کی قدرت ،رزق دینے والے کا وجود جو ہنرور اور بے ہنر کو رزق دیتا ہے، ہر بے جان کو جان دیتا ہے اور واپس لیتا ہے وہ خالق ہے اور اس کی حکمت اور حکم ازلی اور ابدی ہے وہ اپنے کاموں پر اختیار رکھتا ہے اور عملوں کے کرنے نہ کرنے کا مجاز۔

ہندو مذہب کا اور فرقوں سے موازنہ یوں کرتے ہیں۔ایک طرف وہ لوگ ہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتے ،ہندو ان سے کہیں بہتر اور نیک تر ہیں ،دوسرے وہ ہیں جو وجود کی ہستی کے قایل نہیں ،لیکن برہمن اس کی ہستی کا یقین رکھتے ہیں ،تیسرے دوئی میں یقین رکھنے والے ہیں لیکن ہندوؤں کو اس قسم کے نظریوں سے کوئی تعلق نہیں ،پھر ایک فرقہ جسم کو

حقیقی سمجھتا ہے مگر برہمن ان کا ساتھ نہیں دیتے، آخری فرقہ سات خداؤ کو مانتا ہے لیکن ہندو توحید کا قایل ہے اور سات سے انکار کرتا ہے، عنصری فرقہ چار خداؤں کا گمان رکھتا ہے مگر ہندو کہتا ہے ایک حق ہے اور اس پر قایم ہے مشبھوں کا فرقہ تشبیہ کی طرف مائل ہے۔ ہندو تنزیہ کی طرف ایک فرقہ نور اور تاریکی کی تخلیق میں اٹھا ہے، لیکن ہندوؤں کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں برہمن اعتراف کرتا ہے کہ اس کا معبود ایسا ہے کہ اس کا مثل ممکن نہیں کچھ ہندو پتھروں اور جانوروں، سورج اور درختوں کو پوجتے ہیں تو وہ ان کو مخلوق سمجھتے ہیں اور دیو یا دیو صورت مان کر پرستش کرتے ہیں لیکن ان کی پرستش اپنے پرکھوں کی تقلید ہے، جسے وہ آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر میں اس شعر پر بحث ختم کر دیتے ہیں۔

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

ہر ایک قوم کا ایک مسلک اور مذہب اور قبلہ ہوتا ہے لہذا میں نے بھی اپنا قبلہ ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف سیدھا کر دیا ہے (مراد معشوق یا مرشد سے ہے) اپنے ذاتی مذہب کے بارے میں صاف صاف بتا دیتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجت زُنار نیست

میں تو عشق کا کافر ہوں مجھ کو مسلمانی کی ضرورت نہیں ہے میری ہر ایک رگ تار بن گئی ہے۔ مجھ کو زنار کی ضرورت نہیں ہے۔

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق وعالم کار نیست

لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بتوں کی پوجا کرتا ہے۔ ہاں ہاں کرتا ہوں مجھ کو مخلوق سے واسطہ نہیں۔

یہاں تک تو میں نے خسرو کے کلام کے اس حصہ پر توجہ دلانے کی کوشش کی جس کا براہ راست ہند اور ہند کی تہذیب کے ساتھ تعلق ہے، اب اس مقالہ کے دوسرے

جزو میں کچھ اور موضوعوں پر بحث ہے۔ خسرو کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مجھے ڈر ہے اگر میں اس پر کچھ لکھوں تو مضمون اتنا بڑھ جائے گا کہ آپ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگے گا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خسرو کے یہاں شعریت کی تمام خوبیاں درجہ کمال پر ملتی ہیں۔ خسرو صنائع و بدائع کے استاد اور نئی صنعتوں کے موجد ہیں۔ تشبیہ اور استعارہ میں مشکل سے کوئی ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھائی اور اسے اس خوبصورتی کے ساتھ نبھایا کہ باید و شاید۔ رزم کے بیان میں انتہائی جوش و خروش ہے، بزم کی تصویروں میں دلوں کو موہنے والے روپ و رنگ، حمد و نعت اور پند و نصیحت کو نظم میں ایسا باندھا ہے جیسے لڑیوں میں آبدار موتی پرودیئے ہوں۔ عشق و محبت کی داستانیں برہ اور ملن کی کہانیاں درد بھرے لطف کے ساتھ سناتے ہیں اور دلوں کو بے چین کر دیتے ہیں۔ غرض جذبوں کے اُتار چڑھاؤ کا برتنا بتلاتا ہے کہ کوئی پردین کلاونت سرگم کے راگ سنوار رہا ہے۔ خسرو کی شاعری ہندوستانی فضا میں پروان چڑھی۔ اس میں ہندوستانی رنگ چوکھا آیا۔ لیکن اس وقت موقع نہیں کہ اس طرف زیادہ دھیان دیا جائے۔

میں اس صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ خسرو کے کلام میں حکمت، سیاست اور تصوّف کے کیسے کیسے بے بہا رتن ہیں اس زمانہ کے ہندوستانیوں کا اخلاق کن بنیادی قدروں پر قایم تھا، سیاست کے کون سے اصول تھے، جن پر حکومت کا دارومدار تھا، کس قسم کے عالمگیر نظریئے تھے جو زندگی کو معمول کی سطح سے اونچا اٹھاتے تھے اور انسانی ذہنیت کو جلا دیتے تھے، کون سے اعتقاد تھے جو جیون کی ناؤ کو لہروں کے تھپیڑوں اور ہواؤں کے جھونکوں کے باوجود کنارے کی طرف رہ نمائی کرتے تھے۔

"مثنوی شیریں خسرو" میں شب عروس کے ہیجان انگیز بیان کے بعد جسے پڑھتے وقت آنکھیں جھک جاتی ہیں اور زبان لڑکھڑاتی ہے دفعتاً کلام کا رُخ بدلتا ہے اور حکمت و دانش کی مجلس آراستہ ہوتی ہے۔ عشق اور دِلربائی نغمہ و شراب کی گرما گرمی سے طبیعت بھرتی ہے اور علم و دانش کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ ندیموں میں ایک صاحب بزرگ امید نام ہے جن سے خسرو سوال کرتا ہے اور وہ جواب دیتے ہیں، اس زمانہ کے فلسفہ اور سائنس کا خاکہ کھینچ دیتے ہیں جو حد درجہ دلچسپ ہے۔ سوال و جواب سننے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس سب

کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔ چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

سب سے پہلا سوال تو وہی پرانا مسئلہ ہے جو انسانی تاریخ کی ابتدا سے آج تک ہمارے دماغوں کو پریشان کر رہا ہے یعنی دنیا جہان کی پیدائش کا مسئلہ، خسرو نے اس زمانہ کے فلسفہ کی روشنی میں جواب دیا ہے کہ حقیقت ازل سے اوّل عقل ظہور میں آئی اور اس سے دو ہستیاں واجب اور ممکن۔ واجب سے ترتیب وار دس عقلیں ظاہر ہوئیں، جن میں دسویں عقل فعال ہے۔ ہستی امکانی سے نو آسمان جوزحل، کیوان، برجیس، مریخ، خورشید، زہرہ، سیاروں اور چاندکی سیر کے میدان میں، ارسطو کے وقت سے عالم کی پیدائش کا یہی نظریہ تھا جسے یورپ کے سولہویں صدی کے ستارہ شناسوں نے پلٹا اور نئی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرز پر چار عنصروں کا سوال حل کیا ہے۔ لیکن پوچھئے یہ عنصر کس اصلی مادہ سے نکلتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عقل اس کے سمجھنے سے معذور ہے۔ پھر پانچوں عنصروں کا ذکر کرتے ہیں یعنی مٹی، ہوا، پانی، آگ اور اتھر اور ان کی صفتیں بتاتے ہیں۔ ان میں آگ اور ہوا کا مرتبہ باپ کا اور پانی اور مٹی کا ماں کا ہے ان سے موالید ثلاثہ وجود میں آتے ہیں۔ جن کے نام معدن، نبات اور حیوان ہیں اور ان کی بہترین اولاد آدمی ہے۔ آدمی سے کیا مراد ہے؟ جواب دیتے ہیں۔

غرض گر شہوتست و خورد و آشام
خران راہم توان کرد آدمی نام

اگر شہوانی خواہشات اور کھانے پینے کو مقصد قرار دیا جائے تو یوں تو گدھوں کو بھی آدمی کہہ سکتے ہیں۔

اگر درسیم وزر کسی تیز چنگ است
ستورے دان کہ زیر بارلنگ است

اگر سونے اور چاندی کے معاملہ میں اس کو حاصل کرنے کے لئے کوئی چابک دستی سے کام کرتا ہے تو سمجھ لو کہ لدو گھوڑا ہے جو بوجھ کی وجہ سے لنگڑا ہو گیا ہے۔

گرش گنج و درم باشد جہانی
چو در بینی بود محتاج نانی

اگر خزانہ اور روپیہ پیسہ ہی کسی کے لئے دنیا ہے تو اگر تم بغور دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی روٹی کا محتاج ہے۔

چو این سرمایہ بنودبا خرد جفت
نہ شاید بے خرد را آدمی گفت

اگر دولت کو عقل سے متحد نہ کیا جائے تو بے وقوف شخص کو انسان کہنا موزوں نہیں۔

پس آنکس مردم آمدز آفرینش
کہ ہستش برخرد قانون بینش

پس روز ازل سے صحیح معنوں میں مرد وہی ہے جس کی نگاہ عقل سے منسلک ہو۔

یعنی اگر آدمیت سے مراد محض کھانا پینا اور اولاد پیدا کرنا ہے تو گدھے کو بھی آدمی کہہ سکتے ہیں۔ اگر کوئی سونے چاندی ہتھیانے میں تیز ہو تو وہ اس جانور کی مثال ہے جو ٹانگ سے لنگڑا ہے اور اگر روپیہ پیسہ ہی دینا ہے تو اس کے اندر آدمی روٹی سے محتاج ہے چونکہ سرمایہ کا تعلق سے جوڑ نہیں، اس لئے بے تعلق کو آدمی کہنا زیب نہیں دیتا اسی کو اس عالم میں آدمی کا مرتبہ دے سکتے ہیں، جس کی زندگی کے مقصد عقل کے قانونوں سے بندھے ہیں۔

اس مضمون کو سنسکرت کا شاعر اس طرح باندھتا ہے۔

...... न विद्या व तपा न दानम
ज्ञान न शील न गुनणो न धर्म ।
ते मृत्युलोके भुविभार भूता
मनूष्य रूपेण मृगाश्चरन्ति ।

یعنی جن کے پاس نہ ودیا ہے، نہ تپ (ریاضت) اور نہ دان نہ گیان ہے، نہ شیل نہ گن ہے۔ اور نہ دھرم، وہ لوگ اس دنیا میں زمین کا بوجھ ہیں آدمی کے روپ میں چلتے پھرتے جانور ہیں۔

عقل کیا چیز ہے؟ تو اس کا جواب دیتے ہیں کہ جو چیز انسان کو عاقبت یعنی آئندہ

کی طرف مائل کرے اور اپنے ولی نعمت کی یاد دلائے۔ کچھ اور سوالات کے بعد سوال ہوتا ہے کہ خیال کی کیا حقیقت ہے؟ جواب یہ ہے کہ روح چھپا ہوا راز ہے، اسے تو کوئی جانتا نہیں، لیکن دماغ معنی کا آئینہ ہے۔ جس میں ذہنی اور خیالی طاقت ہے۔ یہ آئینہ بالکل صاف اور بے رنگ ہے اور اس میں روح کے فیض سے عکس پیدا ہوتے ہیں۔ موجود اور غیر موجود چیزیں اس پر تصویریں بناتی ہیں۔ جیسے موم پر نقش اور زمین، آسمان سورج اور ستارے موتیوں کی طرح اس سیمابی سمندر کو بھر دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب اصلی معنی کی تصویریں ہیں جو آئینہ میں منعکس ہیں۔

بادشاہ کا بزرگ امید سے آخری سوال ہے جو حکومت کے متعلق بادشاہوں کا کیا دستور ہونا چاہئے؟ یہاں سے خسرو کے سیاسی نظریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو خسرو شیریں تک محدود نہیں اکثر مثنویوں میں پھیلا ہوا ہے۔

خسرو کے فکر کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ سخت دشمنی کا سلوک کرتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، لیکن اپنے ہم وطنوں کے مذہب اور تمدن کا بلاتفریق مذہب احترام کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب۔ سنسکرت اور ہندی زبانوں اور ہندو رسموں اور رواجوں کا بیان محض رواداری سے نہیں، طرفدار کے نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر منگولوں کا بیان دیکھئے ان کے چہرے سڑے کپوں جیسے ہیں جن میں جھریاں اور سلوٹیں پڑی ہیں، ناکیں اتنی چوڑی ہیں کہ چہرہ کے ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلی ہیں، قبر کی طرح گندی اور بھٹی کی طرح پانی سے بھری ہیں۔ منہ پھٹے ہیں اور ان سے رال بہتی ہے۔ ناک کے بال ہونٹوں تک لٹکتے ہیں اور مونچھیں نہایت لمبی لمبی ہیں، ڈاڑھی ٹھوڑی پر پھیلی ہے کیونکہ ان کے برفانی چہروں پر سبزہ نہیں اُگ سکتا۔ سفید سینہ اتنا جوؤں سے بھرا ہے کہ معلوم ہوتا ہے او جڑ زمین پر کالے تل پھیلا دیئے ہیں۔ پیٹھ کی کھال کم بخت جیسی سخت سخت اور گدی کا چمڑا جوتوں کے قابل ہے آدھی بدن کھال کے پاس سے چھل گیا ہے اور آدھی سر جوؤں کے ڈر سے گھوٹ دیا ہے۔ ان کی خوراک قے سے بدتر اور ان کے بدن چوڑی ہڈی کے کتوں کی مانند ہیں۔ غرض منگول صورت اور سیرت سے نہایت مکروہ ہیں۔ منگلوں کی جیسی درگت کی ہے اس حد تک تو نہیں، لیکن حکومت کے جتنے

دشمن تھے ان سب کے لئے لعن اور تشنیع کے کلمے استعمال کئے ہیں۔ گجرات کے راجا کو رائے بد، سمانہ کے سیتل دیو کو اہرمن، ورنگل کے راجا کو ابلیس، ویر پانڈیا کو، رائے گمراہ اور کبر لعین۔ اس طرح قتلغ خواجہ کو ملعون کافر کہا ہے۔ بعض موقعوں پر لکھا ہے کہ دنیا ہندوؤں سے خالی ہو گئی۔ ظاہر ہے یہاں مراد یہ نہیں ہے کہ سب ہندوؤں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس جگہ کہنا صرف یہ ہے کہ ہندو راجے، مہاراجے مطیع اور فرمانبردار ہو گئے اور دہلی کے بادشاہ کو باج اور خراج دینے لگے۔ جہاں لفظ ہندو سے مذہب کی طرف اشارہ ہے وہاں وہی رواداری اور حقیقت نگاری ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں قران السعدین کی ایک مشہور غزل کے چند شعر دلچسپی سے خالی نہیں۔

اے دہلی و اے بتانِ سادہ
پگ بستہ وچیرہ کج نہادہ

اے دہلی اور اس کے سادہ لوح محبوبو جنہوں نے پگڑی باندھ رکھی ہے اور جو ٹیڑھا چیرہ لگائے ہوئے ہیں۔

فرمان برند از انکہ ہستند
از عنایت نازِ خود مرادہ

وہ کسی کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے کیونکہ خود اپنے ناز و انداز کی بنا پر اپنی ہی بات چلاتے ہیں۔

خورشید پرست شد مسلمان
زین ہندوگان شوخ و سادہ

اس شوخ اور سادہ حسین ہندو محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کو پوجنے والے ہو گئے ہیں۔

ہندو رسموں کی بھی رعایت منظور تھی چنانچہ ستی کے بارے میں کہتے ہیں۔

گرچہ در اسلام روانیست چنین
لیک چو بس کار بزرگست بہ بین

اگرچہ اسلام میں یہ جائز نہیں ہے لیکن اگر تو غور کرے تو بہت بڑا

کارنامہ ہے۔

گر بہ شریعت بود ایں نوع روا
جان بد ہند اہل سعادت سوا

اگر شریعت میں اس قسم کی چیز جائز ہوتی تو سعادت مند زیادہ سے زیادہ جان دینے کی کوشش کرتے۔

خسرو کے سیاسی خیالات کے اور پہلو بھی غور طلب ہیں۔حکومت کے متعلق ان کا نظریہ ہندوستانی اور ایرانی عقیدوں سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں راجا کا درجہ بہت ہی اونچا مانا جاتا ہے، راجا سے اگر کوئی اوپر ہے تو ایشور۔ کالی داس نے رگھو خاندان کا سورج دیوتا سے رشتہ ملایا ہے اور تعریف میں ایسے بلند آہنگ اور پرشکوہ لفظ استعمال کئے ہیں کہ ذہن پر عجیب اثر پیدا کرتے ہیں۔

(सोऽह) आजन्म शुद्धानमू आफलोदय कर्मणामू ।
आसमुद्र क्षितीषानामू आनाक रथ वर्तमनामू ।।
यथाविधि हुताग्नीनामू यथा कामार्चितार्थिनामू ।
यथापराध ढण्डानामू यथा काल प्रबोधिणमू ।।
त्यागाय संभूतार्थानामू सत्याय मितभाषिणामू ।
यशसे विजिगीमूणामू प्रजापै गृह मेधिनामू ।।

یعنی یہ خاندان نسب سے صحیح اور پاکدامن اور اپنے کاموں میں ہمیشہ کامیاب ہے، سمندر کے کناروں تک زمین کا حاکم ہے اور آسمان کے افق تک اس کی سواری کا میدان پھیلا ہے، عبادت میں شرع کا پابند، خیرات میں آرزوؤں کا پورا کرنے والا، ملزموں کو سزا دینے اور وقت کی پابندی میں سخت سے کاربند ہے۔ دولت اس غرض سے جمع کرتا ہے کہ احتیاج مندوں میں تقسیم کردے۔ کم گو اس لئے ہے کہ سچائی ہاتھ سے نہ جائے ملکوں کو شہرت کی خاطر فتح کرتا ہے اور اولاد کے لئے خانہ داری کے فرض ادا کرتا ہے۔

کالیداس کے ساتھ ساتھ خسرو کے شاعرانہ تمجید کے شعروں پر کان لگایئے۔ علاؤالدین کو جن لفظوں سے مخاطب کرتے ہیں، ان میں وہی تان ہے جو سنسکرت میں سنائی

دیتی ہے۔ سنسکرت اور فارسی کے آہنگ میں الف ممدودہ نے جو شان پیدا کردی ہے وہ بیان سے باہر ہے فرماتے ہیں۔

شہا گنج بخشا کرم گسترا
معانی شناسا سخن دادرا

اے خزانہ بخشنے والے اور مہربان شہنشاہ اور حقائق کو سمجھنے والے اور شعر و ادب کے مربّی۔

مرا عمر گزشت بالا گذشت
ہمہ پیش شاہانِ والا گذشت

میری عمر جو ساٹھ سے اوپر ہو چکی ہے۔ ساری کی ساری بلند مرتبہ شہنشاہوں کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔

زشاہان کسے اولم یاد کرد
معز الدنا شہ کیقباد

ان بادشاہوں میں سب سے پہلے جس بادشاہ کی تعریف میں نے کی وہ دنیا میں معزز و محترم بادشاہ کیقباد تھا۔

از ان پس کہ در شہ ستائی شدم
تونگر، گنج علائی شدم

اس کے بعد سے میں مستقل طور پر بادشاہوں کا مدح سرا ہوا اور علاؤالدین کی بخششوں سے دولتمند بن گیا ہوں۔ اور پھر تعریف یوں کرتے ہیں۔

کہ ہست از عون وعدل وبذل واحسان شہ عالم
جہاں بنعیم امان محکم طرب بیحد خوشی بے مر

اس دنیا کے بادشاہ کی سرپرستی انصاف اور احسان کی وجہ سے سارا جہاں آسودہ ہے۔ امن و سکون مضبوط ہے، بے انتہا خوشیاں ہیں اور بے حد مسرتیں پھیلی ہوئی ہیں۔

سرفراز و سرانداز و جہانگیر و مخالف کش
ظفریاب و گہرپاش و جہاں بخش و کرم گستر

وہ بادشاہ سر بلند ہے اونچے سر والا ہے ساری دنیا پر حکومت کرنے والا اور دشمنوں کی بیخ کنی کرنے والا ہے۔ فتح مند ہے، موتی بکھیرنے والا، بخششیں کرنے والا اور کرم فرما ہے۔

اس دھن میں تمام بادشاہوں کو سراہتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ بلبن اور علاؤالدین جیسے رعب داب و دبدبہ والے بادشاہوں کے لئے بھی وہی زوردار لفظ ہیں اور کیقباد جیسے عیش پسند اور جلال الدین جیسے نرم دل سلطانوں کے لئے بھی وہی، وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ کی ذات اور حکومت کی قوت کو ایک سمجھا جاتا تھا جو قوت کا حامل ہو وہ ہی خدا کا سایہ، دین کا پشت و پناہ، قطب دنیا، جہاں کشا، رعایا کا نگہبان اور ملک کا محافظ تھا۔ چونکہ تعریف کا موضوع بادشاہت ہے نہ کہ شخص بادشاہ، اس لئے سب کے ایک ہی طرح گن گاتے ہیں۔ یہی وصف ہندوستان کے مہاراجادھیراجوں میں اور یہی ایران کے کسریٰ اور نوشیرواں میں ملتے ہیں۔

خسرو کے وقتوں میں خلافت پر زوال آچکا تھا۔ ہلاکو نے بغداد پر قبضہ کر لیا تھا اور عباسی خاندان کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جس صدی میں خسرو تھے، یہ کہنا مشکل تھا خلیفہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے سلطانوں کا مرتبہ شہنشاہیت کی حد تک اونچا ہو گیا اور ہندوستانی تصوروں کے نزدیک آگیا۔ خسرو کے کلام میں خلافت کا کہیں نام نہیں ملتا۔ لیکن جہاں بادشاہوں کی ستائش میں قصیدے کہے ہیں وہیں نصیحتوں کے بھی دفتر کھول دیئے ہیں۔ سب سے زیادہ زور عدل پر ہے۔ فرماتے ہیں۔

نخست از مملکت بر پائے خواہی
بنا بر عدل دارد پادشاہی

سب سے پہلے یہ کہ اگر تو سلطنت کو مضبوط بنانا چاہتا ہے تو اپنی بادشاہی کی بنیاد انصاف پر رکھ۔

تاجوران راہبر اندیشۂ
نیست بہ از دادا گری پیشۂ

بادشاہوں کے لئے ہر خیال میں انصاف پسندی سے بہتر کوئی پیشہ نہیں۔

ناتوانی بدیں و داد گرائے
کہ بود ملک زین دوپایہ بپائی

جہاں تک ہو سکے دین وانصاف کو ملحوظ خاطر رکھ کیوں کہ سلطنت ان ہی دونوں پاؤں پر برقرار ہے۔

بادشاہ سے کہتے ہیں عدل ہی تمہارا حرز جان ہے اور یوں نصیحت کرتے ہیں۔

عدل سرمایہ تاج وتخت ترا
چرخ بازیچہ طفل بخت ترا

تیرے تاج اور تخت کے لئے انصاف پونجی کی حیثیت رکھتا ہے اور آسمان تیری قسمت کے بچے کا کھیل بن جاتا ہے۔

شحنہ عدل ست از رعایت خویش
گرگ را دارد آشتی بامیش

اپنی رعایت پسندی کی بنا پر انصاف رکھوانے کا کام کرتا ہے اور بھیڑیئے اور بکری میں مصالحت کا برتاؤ کرا دیتا ہے۔

اور آگاہی بھی یوں دیتے ہیں۔

ورچہ کس نیست دشمن تن تو
غفلت توبس ست دشمن تو

اگرچہ تیرے جسم کا کوئی دشمن نہیں لیکن تیری لاپرواہی ہی بس تیری دشمن ہے۔

ورچہ صد پاسبان بوند ازپس
پاس توبہ زتوندارد کس

اگرچہ تیرے پیچھے سینکڑوں محافظ ہوتے ہیں لیکن تیری محافظت تیرے سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔

برچنیں پایہ کاستواری تست
پاسبان تو ہوشیاری لست

لیکن اس درجہ تک تجھ کو پہونچانے والی تیری مستقل مزاجی ہے
اور تیری محافظ خود تیری عقلمندی اور دانش وری ہے۔

خسرو کے نزدیک بادشاہ کے اوصاف میں یادخدا، خوش نیتی، نیکی، راستی، فروتنی، قناعت، مظلوموں کی دادرسی مفلس نوازی وغیرہ شامل ہیں، غرض یہ کہ بادشاہ جس کا نام ہے اسے انسان کامل ہونا چاہئے کیوں کہ ”یتھا راجا تتھا پرجا۔“

خسرو کے کلام کا خزانہ بے پایاں ہے۔ علم اور معرفت کے جواہرات سے مالامال ہے۔ ایک مقالہ میں اتنی گنجایش کہاں کہ اس ساری دولت کو سمیٹ سکے۔ چند آبدار موتیوں کو رول کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔

اب اس صحبت کو ختم کرتا ہوں لیکن بڑی کمی رہ جائے گی اگر ایک اور جواہر پارہ کی طرف دھیان نہ دوں۔ خسرو اور تصوّف کا ایک دوسرے کے ساتھ ایسا واسطہ ہے کہ اگر اس کا ذکر نہ کیا جائے تو مضمون ادھورا رہ جاتا ہے۔ لیکن تصوف کا موضوع وسیع ہے اور اس کے لئے ایک علیحدہ مقالہ کی ضرورت ہے۔ یہاں ایک مختصر خاکہ پر ہی قناعت کرتا ہوں۔

تصوّف کے متعلق تین جدا جدا مسلک نظر آتے ہیں۔ ایک مسلک کے پیرو وہ لوگ ہیں، جو شریعت کو طریقت سے برتر مانتے ہیں اور تصوّف کو گمراہ کرنے والا طریقہ اور مذہب کے لئے خطرناک راستہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے مسلک کا عقیدہ ہے کہ معرفت ہی مذہب کی اصل ہے۔ شریعت اور طریقت میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں دیکھتا۔ اس کے نزدیک شریعت وہ حدیں قایم کرتی ہے جن کے اندر رہ کر انسان کو زندگی بسر کرنی چاہئے۔ البتہ طریقت کے ذریعہ حق باطل پر فتح پاتا ہے، ضمیر نفس پر غالب ہوتی ہے، آدمی اپنے کو پہچانتا ہے اور اس مقام پر پہونچتا ہے، جو اس کی تمام کوششوں کا مقصود ہے۔

خسرو اس تیسرے مسلک کے حامی تھے وہ شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ مگر انکا ذہن تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نظام الدین اولیاء کی تعلیم ان کے رنگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی تھی، وہ اپنے مرشد کو غوث عالم، نظام ملت و دیں، قطب ہفت آسماں و ہفت

زمیں، رہبر پیش بین، نائب مصطفی وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

ملک وحدت بنام ایشان ست
بندہ خسرو غلام ایشان ست

وحدت کی مملکت ان کے نام سے قایم ہے خسرو بندہ ان کا غلام ہے

سالک کا راستہ یہاں سے شروع ہوتا ہے، یہی تصوّف کی پہلی منزل ہے، مرید کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے کو پیر کے سپرد کر دے اور زندگی کے ہر معاملہ میں اس کے حکم کی پیروی کرے۔

صوفی فلسفہ میں، خدا اور پیغمبر کے تصور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خسرو نے ان کے متعلق جو خیالات پیش کئے ہیں، وہ اس فلسفہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خدا کی صفتوں کے بیان میں انہوں نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

واجب اوّل، نور العین، وراء الورا، ہستی مطلق، اوّل و آخر، فکر اور ادراک سے پرے، علت و معلول سے دور، فطرت ہستی کو بے سبب اور بے اسباب بنانے والا، تصور اور خیال چوں چرا کی گذر سے آگے، مکان اور زمان کا خالق وغیرہ وغیرہ۔ کہتے ہیں۔

کرد خسرو وحدت اور اسجود
ثانی اور ممتنع اندر جود

عقل نے اس کی وحدت کو سجدہ کیا اس جیسا دوسرا وجود میں آنا محال ہے

بی ہمہ جا و ہمہ جا در وں
در ہمہ جا و ہمہ جا بروں

وہ کسی جگہ نہیں ہے اور تمام مقامات پر موجود بھی ہے اور تمام مقامات اور ہر جگہ سے الگ بھی ہے۔

یہی ہندو ویدانت کا تصوّر ہے برہم سرویاپی اور انتریامی ہے۔ صوفیوں نے محمد کو ذات کا مظہر اوّل مانا ہے خسرو اس خیال کو یوں ادا کرتے ہیں۔

اللہ و محمد ست پیوستہ بہم
یعنی کہ میاں شان نگنجد دگرے

خدا اور محمد آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ یعنی ان دونوں کے درمیان کوئی دوسرا نہیں سما سکتا۔

نور تو نہ گنجد چو در یک عالم
بہر تو خدا کرد دو عالم پیدا

چونکہ تیرا نور ایک عالم میں نہیں سما سکا۔ اس لئے خدا نے تیرے لئے دو عالم پیدا کئے۔

یہ خیال ہندوؤں میں بھی ہے وہ اوتار کو ایشور کا مظہر مانتے ہیں اوتار کو خدا کا نزول سمجھتے ہیں۔ بھگوت گیتا میں کہا ہے۔

यदा यदा हि धर्मस्य ग्ला निर्भवति भारत ।
अभ्युत्थानमू धर्मस्य तदात्मानमू सृजाम्यऽहमू ।।
परित्राणाय साधुनामू विनाशाय च दुष्कृतामू ।
धर्म संस्यपमनाथीय सम्भवामि युगे युगे ।।

یعنی اے ارجن جب جب مذہب پر زوال آتا ہے، لامذہبی زور پکڑتی ہے، تب مَیں آپ کو ظاہر کرتا ہوں۔ نیک لوگوں کی حفاظت کے لئے، بدکاروں کی ہلاکت کے لئے اور مذہب کی تقویت کے لئے میرا ظہور ہوتا ہے۔

خسرو بتلاتے ہیں کہ نور محمدی کا جب ظہور ہوا تب دھرم کی تاریک رات ختم ہوئی۔ اس نور کی روشنی نے ہستی کی رہنمائی کی۔ پھر ایک کے بعد ایک آدم، خضر، نوح، موسیٰ، ابراہیم، عیسیٰ رسول آئے اور آخر وہی نور مصطفیٰ کے روپ میں نمودار ہوا۔

خسرو کی نگاہ میں مرشد کا درجہ نہایت بلند ہے، اسے نسخہ دیباچہ پیغمبری کے لقب سے سرفراز کیا ہے۔ منو نے لکھا ہے۔

आचायो ब्रह्म लोकेशम ।
गुरू शुश्रूषया त्वेवं ब्रल लोकं समश्नुते ।

یعنی مرشد عالم جاودانی کا بادشاہ ہے۔ گرو کی خدمت سے ہی عالم جاودانی کی رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

آدمی کا رتبہ خدا کے نائب اور خلیفہ کا ہے، وہ خدا کے خزانہ کی کنجی ہے، لیکن وہ اس بلند مرتبہ پر اس وقت فائز ہو سکتا ہے، جب ہمت کے ساتھ قدم بڑھائے۔

ہیچ کس رہ سوئے بالا نیافت
تا قدم از ہمت والا نیافت

اس راستہ میں چار منزلیں آتی ہیں یعنی ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت، جو انہیں طے کر لیتا ہے وہ اس مقام پر پہونچ جاتا ہے، جہاں اس کی روح سب دنیوی آلائشوں سے پاک اور نور ابدی سے معمور ہو جاتی ہے۔ ان منزلوں کو ہندو فلسفہ میں چار نام دیئے ہیں یعنی جاگرت، شوپن، سوشپتی اور تریا پہلی صورت انسان کا وہ شعور ہے جو اسے دنیا کے علائق میں پھنسا دیتا ہے۔ دوسری عالم رویا کے مانند کی ہے، جس میں آدمی سپنوں کی دنیا میں گھرا رہتا ہے۔ تیسری منزل اس گہری نیند کی ہے، جہاں شعور خاطرات کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ چوتھی منزل پر نور علیٰ نور کا سماں بندھ جاتا ہے اور یہی صوفی کی تمام کوشش اور عمل کا سرانجام ہے، خسرو کہتے ہیں۔

نے گلم نے بلبلم نے شمع دنے پروانہ ام
عاشق حسن حودم بر حسن خود دیوانہ ام

خسرو کا کلام ہندوستان کی محبت سے لبریز ہے اور اس میں ایک ملوان تہذیب کے نقش نمایاں ہیں، چھ سو سال گزرنے پر بھی خسرو کا پیغام ہمارے لئے وہ مشعلِ ہدایت ہے جو منزلِ مقصود کی طرف ہماری راہبری کر سکتا ہے۔

☆☆

امیر خسرو بحیثیت تاریخی ماخذ[1]

کنور محمد اشرف

تاریخی مواد کے ذکر کو ختم کرنے سے پیشتر اصل موضوع سے انحراف کرتے ہوئے ہم امیر خسرو کی کتابوں کی تاریخی اہمیت اور خود امیر خسرو کا بہ حیثیت مورّخ جائزہ لے لیں۔ ہماری معلومات کا ایک معتد بہ حصّہ اس کی کتابوں کا مرہونِ منّت ہے۔ اس نے کم از کم تین نظم میں اور ایک کتاب نثر میں لکھی ہے۔ قران السعدین، مفتاح الفتوح (فتح الفتوح) اور نُہ سپہر منظوم ہیں اور خزائن الفتوح نثر میں ہے۔ یہ کتابیں مستند طور پر تاریخی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی اور نظمیں بھی ہیں۔ اگر ہم ان میں دو منظوم کتابوں کا اور اضافہ کرلیں تو ان کی تعداد چھ ہو جاتی ہے۔ وہ دو کتابیں ہیں دیوال رانی خضر خاں یہ اگرچہ ایک رومانی داستان ہے لیکن اس میں ہم عصر تاریخی واقعات کا ذکر بھی ہے۔ دوسری کتاب تغلق نامہ ہے جو غاصب خسرو خاں کے عروج و زوال اور غیاث الدین تغلق کے تخت نشین ہونے سے متعلق ہے۔ یہ کتابیں کم و بیش چالیس سال (۱۲۸۵ء تا ۱۳۲۵ء) کے اس دلچسپ دور کے مسلسل واقعات پر مشتمل ہیں جس میں مصنف نے زندگی گزاری اور اکثر مندرج واقعات کا بطور خود مشاہدہ کیا ہے[2]

1- the Life and Conditions of the People of Hindustan 1935 Calcutta

۲ حیدرآباد (دکن) کے میرے ایک دوست مولوی ہاشمی نے حال ہی میں امیر خسرو کے تغلق نامہ کا ایک نسخہ گوشہ گمنامی سے نکالا ہے۔ اصل میں اس نسخہ کو ایم۔اے۔او۔کالج (بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ) علی گڑھ کے مولانا رشید احمد مرحوم نے دریافت کیا تھا۔ انھوں نے امیر خسرو کی تصنیفات کی اشاعت کے سلسلے میں ایم۔اے۔او۔کالج کے عہدے داران کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ اس مخطوطے پر جسے میں نے جزوی طور پر استعمال کیا ہے لگی مہر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی اصلی ہے۔ فرشتہ اور دیگر تاریخوں میں اس سے جو اقتباسات کیے گئے ہیں ان سے اس کی فہرست مضامین کو اور تقویت ملتی ہے۔

جہاں تک مواد کو پیش کرنے کا تعلق ہے امیر خسرو اپنے قارئین سے کوئی بات پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا۔ مثال کے طور پر وہ یہ بات صفائی سے تسلیم کرتا ہے کہ اس نے قران السعدین شاہی حکم کی تعمیل میں لکھی ہے۔ سلطان نے خاتم المصنفین کہہ کر اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے ایک ایسا بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا جو اسے ہمیشہ کے لیے تمام دنیاوی تردّدات سے آزاد کردے گا۔ کتاب کا خاکہ اور اس کی وسعت شاہی سرپرستی میں متعین کی گئی۔[1] دوسرے سرپرست سلطان جلال الدین خلجی تھے۔ جب سلطان نے مصنف سے کتاب لکھنے کو کہا تو اس نے اخلاقی طور پر زیادہ مضبوطی محسوس کی۔ اس نے صفائی سے سلطان کو بتایا کہ شعری روایات اور مدح کے متفقہ معیار کے تحت جب بھی وہ تاریخی حقیقتوں سے ہٹنے پر مائل ہوا ہے تو اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی ہے۔ اس لیے امیر خسرو نے بادشاہ سے کہا کہ وہ حسبِ موقع حقیقت سے منہ نہ موڑے گا۔[2] بہر حال امیر خسرو نے سلسلہ وار کئی بادشاہوں کی خدمت کی ہے جو ترتیب وار سلطان معز الدین کیقباد جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی اور مبارک شاہ خلجی ہیں۔ اور جب کوئی ایمان دار آدمی ایک طویل عرصے تک کسی درباری ماحول میں رہتا ہے تو اس کے اخلاقی معیار میں عموماً کسی قدر تبدیلی آجاتی ہے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ شاعر نے اپنے بیٹے کو کچھ عرصے بعد متنبہ کیا کہ وہ اس کے نقشِ قدم پر نہ چلے کیوں کہ اس نے اپنی زندگی قصہ کہانی کا تانا بانا بننے میں گزاری ہے۔[3] اس طرح سے یہ یادرکھنا چاہیے کہ امیر خسرو نے اپنی تصنیفات میں دورنگی سے کام لیا ہے۔ وہ ایک مورّخ ہونے کے ساتھ ساتھ درباری بھی رہا اور حیرت انگیز طور پر اپنی تصنیفات اور اپنی شخصیت کی تینوں حیثیتیں بھی پوری کرتا رہا۔ خاص طور پر خزائن الفتوح کی اپنی ایک خاص افادیت ہے۔ اس میں مصنف نے سلطان علاء الدین کی ابتدائی ۱۵ سالہ زندگی کے سلسلہ وار حالات دیے ہیں اور اس کی جغرافیائی اور دیگر تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ان میں سے کچھ واقعات کا عینی مشاہدہ کیا ہے حتیٰ کہ جنوبی ہند کے واقعات کا بھی وہ عینی شاہد ہے۔ یہ صرف ہم عصر تاریخی واقعات اور حقائق ہیں جو قابلِ تعریف صحت اور وسیع تر تفصیلات

---

1. قران السعدین۔ ص ۱۶۹۔۱۷۰
2. کلیات خسرو۔ ص ۸۹۰
3. کلیات خسرو۔ ص ۴۵، و ۶۷۴

کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔[1] مجموعی طور پر ہم امیر خسرو کے بارے میں پروفیسر کوویل کی اس رائے سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ حالاں کہ اس کا طرز تحریر مبالغہ آمیزی اور استعاری تفصیلات سے پُر ہے لیکن تاریخی حقائق خاصی صحت کے ساتھ دیے گئے ہیں۔[2] تذکرۃً میں یہاں یہ بھی اضافہ کردوں کہ زمانہ مابعد کے بہت سے مورخین نے اس زمانے کے واقعات کی روایت اس کے بیان کے مطابق کی ہے اگر چہ اکثر نے اپنی معلومات کے ذریعہ کو ظاہر نہیں کیا۔[3] بہر حال میں نے امیر خسرو کو وسیع تر معنی میں ہم عصر سماجی زندگی کی تاریخ کے لیے اہم ترین مورّخ تصور کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے نہ صرف اس کی تاریخی کتابوں اور تاریخی نظموں کا ہی بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ اس کا مکمل دیوان، اس کی کلیات خصوصاً مطلع الانوار کا مطالعہ کیا جو اس زمانے کے رسم ورواج اور اخلاقی حالت کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اس کی نثر نگاری پر ضخیم اور وقیع کتاب اعجازِ خسروی کا بھی مطالعہ کیا ہے عوام کے خیالات و آراء کو حقارت سے دیکھنے والے فن کار یا واقعہ نگار کی حیثیت سے خسرو خود کو درباری ماحول اور چند تعلیم یافتہ اور مہذّب لوگوں کے واقعات تک ہی محدود کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک سماجی مورّخ کی حیثیت سے وہ ابوالفضل جیسے عالم کی طرح پہلو بچا کر لکھ سکتا تھا۔ لیکن خسرو کا تعلق عوام الناس سے تھا۔ اس نے عوام کا ایک حصّہ بن کر زندگی گزارنے میں اپنی بہتری سمجھی۔ جس وقت ایک درباری یا ایک عالم کی حیثیت سے

---

[1] حال ہی میں علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب نے جنرل آف انڈین ہسٹری میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ شایع کیا ہے۔

[2] جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۶۰ء۔ ص ۲۷۷

[3] معزالدین کیقباد کی تخت نشینی کے واقعات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی وغیرہ اور اس کے باپ بغرا خان کا اس کی تخت نشینی سے اختلاف۔ دہلی کے تخت سے اس کی دست برداری کے اعلان کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ جنگ کے امکانات ختم ہو کر باپ بیٹے میں بڑی خوش گوار ملاقات ہوئی۔ یہ واقعات قران السعدین سے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح علاء الدین کی حکومت کے آخری سالوں کے واقعات کے لیے دول رانی خضر خاں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ علما اور مورخین مثلاً بدایونی و نظامی الدین نے خان شہید شہزادہ محمد کی وفات پر امیر خسرو کے مرثیے سے متعدد حوالے دیے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی۔ ص ۶۰۔ ۳۵۹ اور ۴۷ ۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔

سامنے آتا ہے تو وہ شعوری طور پر ایک خاص رول ادا کرتا ہے۔ اس وقت اس کے صوفیانہ اور اخلاق ومذہب میں محتاط خیالات قطعی طور پر افسردگی لیے ہوتے ہیں۔ گوکہ یہ وقفہ بہت عارضی ہوتا ہے اور اولین موقع ملتے ہی وہ اس نقاب اور افسردگی کی تاریکی کو اتار پھینکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہنسنا ہنسانا شروع کر دیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عوام کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ علمی فضیلت اور دنیاوی بلندی اسے ان کا ہم رنگ ہونے سے باز نہیں رکھ سکتی وہ کبھی کبھی غیر ترقی یافتہ ذہن کا سا بازاری پن ظاہر کرتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات جہلا کی طرح ناشائستہ مذاق کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ جب وہ عوام الناس کے درمیان ہوتا ہے تو اپنے گذشتہ شاہانہ ماحول اور روحانی بلندی کو غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور نہ صرف افراد اور اشیاء بلکہ خود اپنے بارے میں بھی ایماندارانہ اور بے لاگ رائے ظاہر کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کرتے وقت وہ کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہے کہ صاف اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی زبان موقع ومحل کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب نہیں ہے اور اسے مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ یہ فراست اسے سخن سازی پر مائل کرتی ہے۔ وہ اب ارادتاً شاندار طرزِ بیان اختیار کرتا ہے جو مرصع زبان، بے جا عبارت آرائی، ذومعنی الفاظ (Puns) اور معموں پر مشتمل ہوتا ہے وہ اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بے چین اور مضطرب روح کو سکون پہنچانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ اس طرح اس نے الفاظ کے انبار میں اپنے مدعا کو بڑی خوبی سے چھپایا ہے۔ اس کے باوجود اس کا مفہوم ان لوگوں پر آسانی سے واضح ہو جاتا ہے جو اس کے احساسات اور ماحول سے واقف ہیں۔

اعجازِ خسروی کے بارے میں یہ میری اپنی رائے ہے جو صریحاً اپنے قوتِ بلاغت کا، الفاظ کے استعمال میں مہارت کا اور انشاپردازی کے مروجہ نو طریقوں میں دسویں کا اضافہ کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے[1] اگر اسے سطحی نقطۂ نظر سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی دستاویزات حسبِ معمول بہت پر شکوہ طرز تحریر کی حامل ہیں اور بہت کم مواد الفاظ کے حیرت انگیز گورکھ دھندے میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر انھیں دستاویزات کو توجہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک متنوع، دلچسپ اور مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں

---

[1] اعجازِ خسروی۔ ص ۵۳

بہت سے سماجی واقعات کا واضح بیان اور اخلاقی اصولوں اور سماجی طریقوں کا حوالہ ملتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سماجی اہمیت کی معلومات کا بے ربط محاورات اور غیر یقینی لطائف کی موجودگی میں مطالعہ کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ تو علمی نقطۂ نظر سے کسی طرح مناسب نہیں کہ ان سے تاریخی حوالہ جات کے لیے رجوع کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ مصنف اپنے اسرار میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کا یہ تامل صرف دکھاوا ہے۔ اعجازِ خسروی کسی بادشاہ کے حکم یا کسی امیر یا صاحبِ اقتدار فرد کی خوشنودی کے لیے نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ ایک نجی دستاویز ہے جس میں مصنف نے کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اس نے جو پابندیاں خود پر عائد کی ہیں وہ صرف اسلوبِ بیان کی ہیں اور یہ عائد کردہ ذاتی پابندیاں اس دور کے سیاسی حالات کے لحاظ سے ٹھیک ہیں۔ امیر خسرو کی اعجازِ خسروی کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تقابلی ادب کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔[1]

---

[1] ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن۔ جلد سوم۔ ص ۵۶۶۔ حیرت ہے کہ اس کتاب کا جو واحد اقتباس سر ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ کے لیے ایک منشی نے نقل کیا تھا اور جو انھوں نے اپنی کتاب (جلد سوم۔ ص ۶۷۔ ۵۶۶) میں شامل کیا ہے وہ ہے جس کے شامل کرنے کی سب سے کم ضرورت تھی۔ یہ اقتباس ایک مراسلہ ہے جو کسی سرکاری عہدے دار حاجب نے ولی عہد کو لکھا ہے۔ اس میں منگولوں پر فتح اور غزنی پر شاہی افواج کے قبضے کی خبر دی گئی ہے۔ مرتب کا خیال ہے کہ اس مراسلے میں ایک ایسے مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس پر مورخین خاموش ہیں۔ اصل عبارت جلد چہارم۔ ص ۱۴۴۔ ۱۵۶ (مخطوطہ لکھنؤ) میں نقل کی گئی ہے۔ سر ایچ ایم۔ ایلیٹ اور ان کے منشی دونوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ اس مراسلے کی حیثیت اصل شاہی مراسلے کی سی نہ تھی بلکہ انشا پردازی کا ایک نمونہ تھا۔ اپنی کتاب کے جلد چہارم کے صفحہ ۱۸ پر امیر خسرو نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس جگہ جو خط شاملِ کتاب ہے وہ اس کی اپنی اختراع ہے۔ ص ۲۲ پر اس نے اس امر کا پھر اعادہ کیا ہے کہ "اس نے مصنوعی خطوط لکھنے میں اپنی قوتِ تخیل کو بہت استعمال کیا ہے۔ اس نے دوسرے لوگوں کی قوتِ تخیل سے بھی استفادہ کیا ہے جو پہلے ایسا ہی کر چکے تھے اور اس طرح ایک خوبصورت کتاب کی شکل دے دی ہے۔ ان مفرد اور مرکب الفاظ مختصر اور طویل ترکیبوں اور مختصر اور طویل تحریروں کو مرتب کر کے ایک خوبصورت کتاب ترتیب دی ہے اور اس کتاب میں جو خطوط شامل ہیں وہ بالکل سرکاری معلومات ہوتے ہیں۔" اس حقیقت کا بیان غزنی پر قبضہ منگولوں کی شکست اور خط کا طرز کسی گذشتہ تاریخ سے لیا ہوگا جب کہ شیر خاں نے سلطان ناصر الدین کے نائب کی حیثیت سے غزنی پر قبضہ کیا تھا جس کا حوالہ پہلے کسی موقع پر دیا جا چکا ہے۔

☆☆

ترتیب کُلّیات حضرت امیر خسروؒ

نواب محمد اسحاق خاں

تمہید

"اذاارادالله شیئاً هیاء اسبابه" ۔جب کوئی کام ہونے والا ہوتا ہے منشاء الٰہی کے ماتحت اس کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں — چنانچہ ڈیڑھ سال کا زمانہ گذرتا ہے کہ ماہ مئی ۱۹۱۴ء میں مدرستہ العلوم علی گڈھ کے متعلق سلسلۂ مراسلت میں میرے نہایت مکرم ومحترم دوست شمس العلما نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سی۔ ایس۔ آئی نے حضرت امیر خسروؒ کا کلام جمع کرنے کا پہلی بار خیال ظاہر کر کے مجھ سے ارشاد فرمایا تھا کہ نہایت وثوق کے ساتھ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گذرا جس کی تصنیفات اس درجہ لائقِ حفاظت واشاعت ہوں، جیسا کہ امیر خسرو — لہٰذا اگر آپ کی کوشش سے اس مشہور زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم ونثر (جو جملہ اصناف سخن میں بزبان فارسی، ہندی واُردو موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے) جمع ہو کر چھپ گیا، تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی، جس کا نفع غیر محدود ہوگا اور سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ یورپ میں خصوصیت کے ساتھ کلیات خسرو کی بہت مانگ ہوگی اور تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ ٹھکانے لگ جائیں گے۔

میں اس مہتم بالشان کام کی اہمیت اور دشواریوں کو خوب پہچانتا تھا — مگر فرمائش کی نتائج خیز اور دوررس نوعیت اور صاحب فرمائش کی علم دوستی اور قابلیت نے خصوصاً اس جلیل القدر مصنف اور شاعر کی عظمت نے (جو کُل دنیا کے شعراء میں اس وقت بھی اس کو

حاصل ہے) میرے دل پر ایسا اثر کیا کہ میں اس کی تعمل کی طرف ہمہ تن راغب ہو گیا اور باوجود اپنی عدم اہلیت اور علمی بے بضاعتی کے میں نے خداوند ذوالجلال والاکرام کی مدد پر بھروسہ کر کے اس دشوار کام کی ذمہ داری قبول کر لی، اور ارادہ کے ساتھ ہی کام بھی شروع کر دیا — چنانچہ نواب عماد الملک بہادر کو میں نے اطلاع دے دی کہ میں تعمل ارشاد کے لئے بسر و چشم حاضر ہوں — مجھ سے جو سعی فراہمی و ترتیب کلیات میں ہو سکے گی اس سے ہرگز کسی صورت میں دریغ نہ کروں گا۔

اس مختصر تمہید کے ساتھ میں اب اس کارروائی اور اس کی نوعیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت تک اس عظیم الشان کام کی تکمیل میں ہوئی ہے — حضرت امیر خسروؒ کی زندگی کے تفصیلی حالات کافی شرح و بسط کے ساتھ تو اس رسالہ میں بیان ہوں گے جو اس سلسلہ میں بنام نہاد "تذکرہ حیات خسروؒ" انشاء اللہ العزیز عنقریب شائع کیا جائے گا — یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضرت امیر خسرو کا زمانہ حیات مورخین نے ۶۵۱ھ (مطابق ۱۲۵۳ء) سے ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) تک بتلایا ہے — آپ کی عمر ہنوز سات ہی سال کی تھی کہ آپ کے پدر بزرگوار کا سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا — اور آپ نے اپنے نانا نواب عماد الملک کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ اور نواب ممدوح کی نگرانی اور سرپرستی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی — خوشی کا مقام ہے کہ سات سو برس قبل ایک عماد الملک نے اس ہونہار شاعر کی نشو و نما دینے میں سعی کی اور اس مبارک عہد کے نواب عماد الملک کی توجہ اور امداد سے اُن جواہر کے جمع کئے جانے کا اہتمام درپیش ہے جن سے حضرت امیر خسرو فارسی علم کے خزانہ کو مالا مال کر گئے ہیں۔ یہ خزانہ ہماری غفلت، بے علمی اور ناقدری سے ہمارے ہاتھ سے بہت کچھ نکل چکا ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر یہی لیل و نہار ہے تو کہیں رہا سہا بھی غارت نہ ہو جائے۔

کلیم، از دست بیداد کہ نالم
بکشت من گذار لشکر اُفتاد

قصہ کوتاہ ایک تو خود فطرت نے طوطی ہندی، سلطان الشعراء حضرت امیر خسرو کی طبیعت میں فوق العادت ہمہ گیر قادر الکلامی اور بے نظیر سحر بیانی کا مادہ ودیعت کیا تھا، اس پر

طرہ یہ ہوا کہ آپ ۷۳ سال کی عمر میں دہلی کے پانچ مختلف بادشاہوں (یعنی (۱) معزالدین کقباد سنہ ۸۹۔۶۸۶ ہجری سنہ ۹۱۔۱۲۸۷ء (۲) جلال الدین فیروز شاہ سنہ ۹۵۔۶۸۹ھ سنہ ۹۵۔۱۲۹۰ء (۳) محمد شاہ ۱۵۶۹۵ ۷ ہجری ۱۲۹۵۔۱۳۲۱ء (۴) غیاث الدین تغلق ۲۵۔۷۲۱ ہجری سنہ ۲۴۔۱۳۲۱ء اور (۵) محمد بن تغلق سنہ ۷۲۵ ہجری سنہ ۱۳۲۴ء) کے الطاف شاہانہ اور توجہات مربیانہ کے مورد و مصدر بنے رہے۔ لہٰذا ان مختلف درباروں کی اپنے اپنے وقت پر گوناگوں دلآویزیاں، شاہوں کے سانحات وفات اور تخت نشینوں کے جشن صلح و جنگ، فتح و شکست، عزل و نصب، عروج و زوال، ملک گیریاں اور ملک داریاں، سفر و حضر، امن و فساد، عیش و نشاط، بخشش و کرم، بذل و سخا جس کی وجہ سے مشاہیر زمانہ کا ہجوم اُن کے درباروں میں عموماً رہا کرتا تھا۔ یہ سب مناظر و اسباب اس خدائے سخن کے ''سمند رطبع پر ایک تازیانہ'' ثابت ہوئے، جنہوں نے ان کے دریائے سخن کو ''ناپیدا کنار'' بنادیا۔ چنانچہ ان کی فکر کی وسعت ذہن کی جودت، تصانیف کی کثرت، خیال کی پرواز اور کلام کی بوقلمونی اور بت نے نہ صرف فارسی کے شاہانِ ملک سخن سے خراج تحسین حاصل کیا، بلکہ یورپ کے محققین مستشرقین نے آپ کو ملک ہندوستان کا ایک مشہور ترین فارسی شاعر اور نہایت باکمال ماہر فن موسیقی تسلیم کیا ہے (ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ شاہان اودھ مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر ایم ڈی صفحہ ۴۶۵ و فہرست کتب خانہ بانکی پور مرتبہ ڈاکٹر ڈینیزن داس پی۔ ایچ۔ ڈی صفحہ ۱۷۹) اور بعض محققین نے تو آپ کو اُن معدودے چند مشہور عالم سخن افرینوں کے پہلو میں جگہ دی ہے جن کی بہت ہی تھوڑی تعداد مادر گیتی پیدا کر سکی ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ ہند مصنفہ سر ہنری ایلیٹ جلد سوم ضمیمہ الف)

تذکرہ مجمع النفائس میں (جو ۱۱۶۴ء میں لکھا گیا ہے) سراج الدین خاں آرزو نے فردوسی اور امیر خسرو کے ایک شعر کا مقابلہ کیا ہے۔ فردوسی نے نقارہ کی آواز کو ایک شعر میں اس طرح باندھا ہے کہ شعر بھی بامعنی رہا اور ایک مصرعہ کے الفاظ سے نقارہ کی آواز بھی پیدا ہوتی ہے فردوسی کا وہ شعر یہ ہے۔

زنقارہ آواز آمد بروں
کہ دون است دون است گردون دوں

امیر خسرو نے اس کے مقابلہ میں شعر لکھا ہے۔

دہل زن دہل زد بہ تحسین او
کہ دیں دین او دین او دین او

صاحبِ تذکرہ نے بتلایا ہے کہ علم موسیقی کے ماہر ارباب ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ خسرو کے شعر کا پایہ کس قدر بلند ہے اس لئے کہ نہ صرف ایک بامعنی مصرعہ کے الفاظ بآواز دہل ادا کئے ہیں، بلکہ اس میں تال اور سُر کے اصول کی پوری پابندی ملحوظ رکھی ہے۔ تذکرہ دولت شاہی میں مذکور ہے کہ حضرت امیر خسرو ظاہری اور باطنی فضائل کے باوجود علمی موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اتفاقاً ایک بار ایک مطرب نے ان سے بحث کی کہ علم موسیقی عملی علوم میں سے ہے اور شعر و شاعری سے باعتبار مشرف افضل ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں حضرت امیر نے ایک قطعہ لکھا ہے۔

مطربے می گفت با خسرو کہ اے گنج سخن — علم موسیقی زعلم شعر نیکو تر بود
زانکہ آں علمیست کز وقت نیاید در قلم — لیکن ایں علمیت کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش دادم کہ من در ہر دو معنی کاملم — ہر دو را سنجیدہ بدوزنے کہ آں در خود بود
نظم را کردم سہ دفتر در بہ تحریر آمدی — علم موسیقی سہ دفتر بودے از باور بود
فرق گویم من میاں ہر در معقول و درست — گر ز بد انصاف آں کز ہر دو دانشور بود
نظم را علمی تصور کن بنفس خود تمام — گو نہ محتاج اصول و صوت خنیاگر بود
گر کسے بے زیور بم نظمے فرو خواند رواست — نے بمعنی ہیچ نقصاں نے بہ نظم اندر بود
گر کسے بے زیور بم نظمے فرو خواند رواست — نے بمعنی ہیچ نقصاں نے بہ نظم اندر بود
در کند مطرب لبے ہاں دہوں ہوں در سرود — چوں سخن بنود ہمہ بے معنی و ابتر بود
نائے زن را ہیں کہ صوتے دارد و گفتار نے — لاجرم در قول محتاج کسے دیگر بود
پس دریں معنی ضرورت صاحب صوت و سماع — از برائے شعر محتاج سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسے داں و نغمہ زیورش — نیست عیدے گر عروس خوب بے زیور بود

من کسے را آدمی دانم کہ داند ایں قدر
در نداند پرسد از من ورنہ پرسد خر بود

چونکہ شاہان دہلی کے الطاف خسروانہ کے ساتھ ہی حضرت امیر خسرو کو جناب محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کی بارگہ سے تصوّف کا بے بہاخلعت بھی مرحمت ہوا تھا، لہٰذا اُن کے کلام میں تصوّف کی دل ربا چاشنی نے چار چاند لگادیئے، جس کی بدولت آپ کے کلام کو قبول عام کا رتبہ حاصل ہوا۔

تذکرہ دولت شاہ میں کتاب جواہر الامراء مصنفہ مولانا شیخ عارف آذری رحمتہ اللہ علیہ (جن کی نسبت حضرت امیر خسرو بہت کچھ حسن عقیدت رکھتے تھے) اپنی پیرانہ سالی کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور حضرت امیر خسرو کو ان کی ملاقات کا موقعہ ملا تھا— مگر اور تذکروں سے اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔

پوپ انگلستان کا ایک نامور شاعر گذرا ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ:-

He lisped up in numbers for the numbers came

یعنی بچپن ہی میں شعر کی اس قدر آمد تھی کہ اپنی توتلی زبان میں بھی جو کچھ بولتا تھا وہ اشعار ہی ہوتے تھے۔ اس طرح بلا مبالغہ حضرت امیر خسرو کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ آپ کو بچپن ہی سے فن شعر میں پورا درک تھا چنانچہ اپنے دیوان موسوم بہ ''تحفتہ الصغر'' کے دیباچہ میں حضرت خود تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے اوائل عمر ہی سے شعر گوئی کا فرق العادت ذوق تھا اور مثلاً ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب خواجہ عزالدین سے پہلی بار شرف ملاقات حاصل ہوا تو خواجہ ممدوح نے امتحاناً چار لفظ ''موئے، بیضہ، تیر اور خربزہ'' ایسے بتلا کر جن میں کوئی باہمی رابطہ یا مناسبت نہ تھی یہ فرمائش کی کہ ایک رباعی تصنیف کیجئے جس میں یہ چاروں لفظ استعمال ہوجائیں— آپ نے فی البدیہہ ذیل کی رباعی موزوں کی۔

ہر موئے کہ در دو زلف آن صنم است
صد بیضۂ عنبریں براں موئے صنم است
چوں تیر مداں راست دلش را زیرک
چوں خربزہ دندنش دروں شکم است

صغرسنی میں امیر خسرو کی یہ جودت طبع دیکھ کر خواجہ اعزالدین متحیر رہ گئے اور آپ کو ''سلطانی'' لقب دیا جو امیر خسرو کے ابتدائی کلام میں پایا جاتا ہے (فہرست کتب خانہ

بانکی پور مرتبہ ڈاکٹر ڈینیزن داس صفحہ ۱۷۸)

آپ کے کلام کی فراوانی اور اس کی فراہمی کی ناقابل عبور مشکلات کا اندازہ صرف ایک اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ عروج سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں خاندانِ تیموریہ کے ایک جلیل القدر شہزادہ مرزا انجر نام نے حضرت امیر خسرو کا پوار کلام جمع کرنے کا عزم مصمم کیا۔ خداداد دولت اور علم دوست ندیموں کی مسلسل جدو جہد کی بدولت ایک لاکھ بیس ہزار اشعار فراہم کرسکا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد کسی دوسرے موقع پر اس شہزادہ کو حضرت کی غزلیات کے دو ہزار شعر اور دستیاب ہوئے۔، جس کے بعد شہزادہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ حضرت کے پورے کلام کی فراہمی عملاً محال ہے—اور مایوس ہوکر مزید جستجو سے دست بردار ہوگیا۔
(فہرست بانکی پور مرتبہ ڈاکٹر ڈینیزن داس صفحہ ۱۷۷)

یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جبکہ مسلمان بحیثیت ایک زندہ قوم کے اس ملک میں حکمراں تھے اور اسلامی سلطنت اپنے علوم کی حامی و مربی تھی اور نسبتاً امیر خسرو کا عہد بھی قریب تھا۔ اس واقعہ کی روشنی میں اس امر کا انداز بخوبی ہوسکتا ہے کہ اس خسروِ سخن کے پورے کلام کی فراہمی کی کوشش میں اس زمانہ کے حالات کے ماتحت کس حد تک کامیابی کی امید ہوسکتی تھی۔ تاہم میں نے ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور امکانی سعی کلام کے جمع کرنے میں کی گئی۔ اور اس کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوقِ رسائی و دوریٔ منزل

بہر حال کام شروع ہوگیا ہے اور اس کی تکمیل تائید ایزدی پر منحصر ہے۔

تانہال آرزو کے بردہد
حالیا رفتیم وتخمے کاشتیم

فنڈ

یہ ظاہر ہے کہ کوئی تحریک خواہ چھوٹی ہو یا بڑی روپیہ کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ (کامیابی در کنار کام کا اجراء ہی روپیہ پر منحصر ہے۔) چنانچہ جس وقت نواب عماد الملک بہادر

نے ترتیب کلیات خسرو کی تحریک فرمائی تو خود ہی تحریر فرمایا تھا کہ میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔ بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجدوں گا— کام شروع کرنے کے لئے خود ایک ہزار روپیہ اس وقت دیتا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار روپیہ اور دوں گا۔ نواب صاحب ممدوح نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہمارے رئیس وقت یعنی اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہٗ علم وسخن کے قدردان ہیں۔ خود بھی تعلیم یافتہ ہیں۔ علم وادب کے خصوصاً بہت بڑے قدرشناس ہیں اور مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ کی طرف سے درخواست امداد پیش ہوئی تو انشاء اللہ تعالیٰ حضور ممدوح امداد اور سرپرستی سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔ چنانچہ سرکار آصفیہ سے مالی امداد حاصل کرنے کی غرض سے ایک عرض داشت نواب سالار جنگ بہادر کی خدمت میں پیش کی گئی جو اُس وقت عہد جلیلہ وزارت پر ممتاز تھے۔ میں نہایت شکر گذار ہوں کہ اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہ نے مبلغ ساڑھے سات ہزار روپیہ کی گراں قدر امداد خسرو فنڈ کو اس شرط پر مرحمت فرمائی کہ بعد اشاعت ہر کتاب کے بیس بیس نسخے کتب خانہ آصفیہ میں داخل کئے جائیں نواب سالار جنگ بہادر نے بھی از راہِ علم دوستی مبلغ ایک ہزار روپیہ عطا فرمایا اور ڈھائی سو روپیہ سکہ مالی نواب عماد الملک بہادر کی معرفت جناب مولانا انوار اللہ خاں بہادر نے عنایت فرمائے۔ غرض ابتدائی تحریک سے اس وقت تک فنڈ میں حسب تفصیل ذیل آمدنی ہوئی۔

	روپیہ	آنہ	پائی
ستمبر ۱۹۱۴ء عطیہ نواب عماد الملک بہادر	۱،۰۰۵	۰	۰
نومبر ۱۹۱۴ء عطیہ نواب سالار جنگ بہادر	۱،۰۰۰	۰	۰
نومبر ۱۹۱۴ء عطیہ ثانی نواب عماد الملک بہادر	۱،۰۰۰	۰	۰
نومبر ۱۹۱۴ء مولانا انوار اللہ خاں بہادر (بعد وضع بٹہ حالی)	۲۰۹	۶	۱۰
مئی ۱۹۱۵ء عطیہ سرکار آصفیہ (بعد وضع کمیشن بینک)	۸،۴۶۴	۶	۶
میزان کل	۱۰،۶۸۶	۱۳	۴

مجملہ اس رقم کے چھ ہزار روپہ کے پرامیسری نوٹ (بہ قیمت ۵،۳۲۹ روپیہ ۱۰ آنہ ۶ پائی) خرید لئے گئے ہیں تا کہ پورا سرمایہ معطل نہ پڑا رہے اور فنڈ میں منافع کی آمدنی کا اضافہ ہوتا رہے۔ ماقی رقم، رقم ۵،۳۴۷ روپیہ ۲ آنہ ۱۰ پائی میں نے فراہمی وتصحیح وترتیب کلیات کے کام پر روپیہ بتدریج خرچ ہو رہا ہے۔ مصارف کی مقدار اس وقت تک قریب ۲ ہزار روپیہ کے ہے جو خریدے ہوئے نسخوں کی قیمت، تصانیف کی تلاش، مختلف لائبریریوں کے مستعار نسخوں کی اجرت اور نقول کے مقابلہ وصحت کے معاوضہ کی صورت میں خرچ ہوا ہے۔

افسوس ہے کہ باوجود اخبارات میں متواتر اعلانات کے پبلک نے اب تک اس طرف اپنی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا، اور نہ اور کسی قسم کی اس کام میں مدد کی جس سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بدقسمتی سے پبلک نے اس کام کی اہمیت اور وقعت کو نہیں پہنچانا نہ اُس کو اس صورت کا اب تک صحیح احساس ہوا ہے۔

مجھے خصوصیت کے ساتھ اس کا افسوس ہے کہ باوجود میری متواتر استدعاؤں کے (سوائے معدودے چند احباب کے) اُن ارباب علم کی طرف سے بھی بے التفاتی ظہور میں آئی جن سے مجھے ترتیب کلیات کے کام میں بہت کچھ علمی وعملی امداد کی توقع تھی۔ اس عدم توجہی کو دیکھتے ہوئے بے اختیار میرے قلم سے نکلتا ہے کہ۔

سرکنم شکوہ اگر تاب شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

میرے اس شکوہ کی تائید اُن بہت سی ضخیم فائلوں سے ہوتی ہے جو ترتیب کلیات کی کوشش کے دوران میں بن گئی ہیں جن سے اُس بے شمار مراسلت کا توپتہ چلتا ہے جو کام کو آگے بڑھانے کی غرض سے کی گئی تھی، مگر متوقع جوابات اگر تلاش کیے جائیں تو بہت ہی کم ملیں گے۔

خوش قسمتی سے اعلیٰ حضرت حضور نظام کی سخاوت اور علم دوستی نے کام کرنے کا موقع دیدیا جس کی بدولت اس کارروائی کا نتیجہ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ہدیۂ ناظرین ہونا شروع ہوگا۔

مولوی محمد ریاض حسن صاحب نے پٹنہ سے براہ مہربانی مجھے بانکی پور کے کتب خانہ کی ایک فہرست تصانیف خسروی کی بھیجی تھی اور بذریعہ تحریر مشورہ دیا تھا کہ پبلک سے اپیل کیا جائے کہ یا تو یکمشت چندہ دیں یا ماہوار چندہ مقرر کریں۔ یا کلیات کے چند نسخوں کی خریداری منظور کر کے نصف قیمت پیشگی عنایت کریں یا ایک نسخہ کی خریداری قبول کر کے پیشگی قیمت ادا کر دیں تا کے قلت فنڈ کی وجہ سے کام نہ رُکنے پائے۔ مگر میں نے نظر بہ حالت مذکورہ بالا سردست یک دو گیر محکم گیر کے اصول پر عمل کرنا مناسب سمجھا اور حضور نظام خلد اللہ ملک کی گراں قدر سرپرستی پر قانع رہا اور ہوں۔

ڈیڈی کیشن

اعلیٰ حضرت ادام اللہ اجلالہ واقبالہ نے نہ صرف گراں بہا عطیہ سے حامیان ترتیب کلیات خسروی کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، بلکہ میری اس عرضداشت پر کہ یہ سلسلہ اشاعت چونکہ اس ملک میں اپنی قسم کا پہلا فارمولا ہے، لہٰذا اس سلسلہ کا اعلیٰ حضرت کے نام سے منسوب ہونا اس کی اہمیت اور قدر افزائی کا باعث ہوگا، اگست ۱۹۱۵ء میں کلیات کو حضور ممدوح الشان نے اپنے نام نامی واسم سامی سے مرحمت فرما کر ملک کے علم دوست طبقہ کو رہین من فرمایا ہے۔

تحقیق تصنیفات حضرت امیر خسرو

فراہمی ترتیب کلیات خسرو کے دوران میں سب سے پہلا کلام حضرت امیر خسرو کی تصنیفات کی تعداد اور اُن کے ناموں کی تحقیقات تھی۔ حضرت کی تصانیف کی تعداد کے متعلق خود مورخین اور تذکرہ نویسوں میں بہت اختلاف ہے — جامی رحمتہ اللہ علیہ نے (جن کا زمانہ حضرت امیر خسرو سے نسبتاً قریب ہے) نفحات الانس میں تصنیفات خسروی کی تعداد ۹۲ بتلائی ہے — تذکرہ خوشگو اشعراء فارسی کی یک ضخیم تاریخ ہے جس کا چھپنا ثابت نہیں ہوتا، مگر ممالک یورپ کے کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کا جابجا ذکر ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۸۴۸ء میں شاہان اودھ کے تین کتب خانوں یعنی توپ خانہ، موتی محل اور فرح بخش

کی کتابوں کی فہرست گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے مرتب کی تھی — اس فہرست میں تذکرہ خوشگو کا حضرت امیر خسرو کی تصنیفات کے متعلق مندرجہ ذیل اقتباس درج ہے —

"مشہور است کہ نود و نہ کتاب تصنیف کردہ۔ اما انچہ از مثنویات متداول است ایں تفصیل دارد: (۱) خمسہ یعنی مطلع الانوار، لیلیٰ مجنوں، خسرو شیریں، آئینہ سکندری، ہشت بہشت، ہزدہ ہزار بیت، (۲) مثنوی عشقیہ چہار ہزار بیت (۳) قران السعدین پنج ہزار بیت (۴) مثنوی نہ سپہر چہار ہزار بیت (۵) تغلق نامہ ناتمام سہ ہزر بیت وتعداد دیوان وغزل وغیرہ مشخص نیست۔ ودر نثر اعجاز خسروی وتاریخ دہلی، خزائن الفتوح، مناقب ہند، وچند رسالہ دیگر در علم اسیفاء...... وموسیقی ورسالہ خالق باری راہم بدو منسوب دارند کہ اطفال ہندوستان آن رامی خوانند — وانچہ درہندی زبان کارستانہا کردہ ہیچ شاعرے رادست ندادہ — چنا کہ اشعار مطائبہ درمیان شادیہابہ ہندوستان رائج است ولطائف وظرائف آن غزۂ قبول شہرت بررودارد" — اس تذکرہ کے بموجب تصانیف خسروی کی تعداد ۹۹ ہوتی ہے — لیکن تذکرہ ہفت اقلیم میں (جو امین الدین رازی نے ۱۰۰۲ ہجری میں مرتب کیا، تصانیف کی تعداد بجائے ۹۹ کے ۱۹۹ درج کی ہے — دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ خود حضرت امیر خسرو نے اپنی کسی تصنیف میں اشعار کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے درمیان بتلائی ہے — تاریخ فرشتہ میں آپ کے اشعار کی تعداد پانچ لاکھ تک لکھی ہوئی ہے — اس تحقیقات میں بڑی مشکل یہ پیش آئی ہے کہ تذکرہ نویسوں نے تعداد تصنیفات کا تخمینہ بتلاتے ہوئے ان کے ناموں کی کم وبیش مکمل فہرست لکھنے کی کوشش نہیں کی — اور یورپین علماء مستشرقین کے شوق علمی کا یہ حال ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے (جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور جو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۸ء تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے تھے) ہندوستان سے ایک بہت بڑا ذخیرہ نایاب قلمی کتابوں کا (جن کی تعداد ۲۰۵۲ سے زیادہ) تھی۔ برلن کے کتب خانہ میں بھجوادیا، جو اسپرنگر پبلیکیشن کے نام سے مشہور ہے — ان کتابوں کی جس فہرست کا اس وقت تک مجھے پتہ چلا ہے وہ جرمن زبان میں ہے — یورپ میں قلمی مسودات کے شوق کا یہ عالم ہے کہ لندن کے لیوزک کمپنی نے اپنے فروختنی قلمی نسخوں کی فہرست میں مثنوی شیریں خسرو کے ایک مختصر نسخہ کی قیمت ایک سو ساٹھ روپے درج کی ہے، حالانکہ اس

مثنوی کے قلمی اور مطبوعہ نسخے ہر جگہ سے بہ آسانی میسر آ سکتے ہیں — ایسی صورت میں جبکہ تذکروں میں تصانیف کی فہرست کا اہتمام نہ کیا گیا ہو اور اس ملک کی نایاب تصنیفات کے خزانے اہل ملک کی بدمزاقی کے طفیل رفتہ رفتہ سب یورپ کے علمی جواہر خانوں میں پہونچ چکے ہوں تو حضرت امیر خسرو کے کلام کا پتہ چلانا دشوار سے دشوار تر کام ہو گیا ہے۔ کُل تصنیفات کی تعداد کے تعین میں تو اختلاف تھا ہی — حضرت کے دیوانوں کی تعداد میں بھی مختلف فہرستوں میں اتفاق نہیں — جس قدر فہرستیں پرانے زمانے میں مرتب ہوئی ہیں ان میں حضرت امیر خسرو کی صرف چار دیوان مذکور ہیں: یعنی تحفۃ الصغر، وسط الحیوۃ، غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ — لیکن مسٹر چارلس ریو نے لندن کے برٹش میوزیم کی کتابوں کی جو فہرست ۱۸۸۳ء میں مرتب کی اُس میں پہلی بار پانچ دیوانوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے — اور پانچویں دیوان کا نام نہایت الکمال لکھا ہوا ہے جو اس کتب خانہ میں موجود ہے — بانکی پور لائبریری میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے اور دوران تحقیقات میں معلوم ہوا کہ یہ دیوان دہلی میں چھپ بھی چکا ہے — مغرب کے علماء مستشرقین نے اثنائے فراہمی کلام میں حضرت امیر خسرو کی تصنیفات کو تاریخی حیثیت سے بھی بہت غور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے — چنانچہ سر ہنری ایلیٹ نے اپنی تاریخ ہند کی جلد سوم کے ضمیمہ کے طور پر مثنوی خزائن الفتوح اور قران السعدین میں سے ایک مبسوط خلاصہ اُن تاریخی واقعات کا لکھا ہے جو ان مثنویوں کا موضوع ہیں اور پھر آگے چل کر مثنوی عشقیہ و نہ سپہر و اعجاز خسروی کا خلاصہ بھی کر دیا ہے۔
تذکرہ نویسوں میں تصنیفات خسروی کی تعداد کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کے بعض وجوہ دوران تحقیقات میں مجھے معلوم ہوئے — یورپ کی مشہور لائبریریوں کی فہرست ہائے کتب دیکھنے سے پتہ چلا کہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں حضرت امیر خسرو کی ایک ایک تصنیف کے مختلف قلمی نسخے موجود ہیں جن کے مضامین اور ان کی ترتیب ایک دوسرے سے جدا ہیں — مثلاً دیوان امیر خسرو کے نام سے بیسویں نسخے مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں جو حقیقت میں حضرت امیر خسرو کے پانچوں دیوانوں کی مختلف غزلیات کا مجموعہ ہیں — مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق دیوانوں میں سے غزلیات وقصائد کا انتخاب واقتباس کر لیا، لہٰذا یہ دیوان ایک دوسرے سے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے بادی النظر میں جدا

جدا تصنیف خیال کئے جا سکتے ہیں ــــ اسی طرح کلیات امیر خسرو کے مختلف نسخے کتب خانوں میں موجود ہیں جن میں اہلِ ذوق نے یا تو اپنے اپنے رجحان طبع کے مطابق کلام جمع کر لیا یا جس کو جس قدر کلام میسر آیا یک جگہ کر لیا ــــ یہی حال مثنویات اور قصائد کے مختلف مجموعوں کا سمجھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ حضرت کی مصنفہ کتابوں میں سے ایک ایک کتاب کئی کئی ناموں سے ملقب ہے ــــ مثلاً مثنوی عشقیہ کے متعدد نام ہیں اس کو بعض نے مثنوی عشقیہ کہا ہے ــــ قصہ دول رانی وخضر خاں ونسخہ خضر خانی بھی اسی کے نام ہیں ــــ مہتمم صاحب کتب خانہ حیدر آباد کی تحریر سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ مقابلہ کرنے پر مثنوی آغاز عشق بھی یہی مثنوی عشقیہ ثابت ہوئی۔ دہلی سے حال میں بعض مطبوعہ تصانیف خسروی کا اشتہار شائع ہوا تھا ــــ اس طرح ایک کتاب کے چند نام ہو گئے ــــ کتب خانہ حیدر آباد سے ایک کتاب ''مثنوی در تعریف دہلی'' کے نام سے مجھے موصول ہوئی تھی اور اس کی نقل ہو چکی تھی تصحیح کی غرض سے جب مقابلہ کیا تیا تو پتہ چلا کہ یہ مثنوی قران السعدین ہے۔ کتاب خزائن الفتوح کی لوح پر اس کا نام سرور الروح اور تاریخ علائی بھی لکھا ہوا پایا گیا۔ انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں دیوان غرۃ الکمال کا نام کتاب الکمال بھی درج ہے ــــ اسی فہرست سے معلوم ہوا کہ مثنوی مفتاح الفتوح یا فتح الفتوح (جس میں سلطان جلال الدین فیروز شاہ کے فتوحات کا ذکر ہے) ابتدا میں دیوان غرۃ الکمال کا جزو تھی اور اسی مثنوی کا نام فتح نامہ بھی تھا ــــ چنانچہ رام پور کے کتب خانہ میں یہ مثنوی اب بھی اس نام سے دیوان غرۃ الکمال کے جزو کی حیثیت سے موجود ہے۔ حال میں جب کلام خسروی کی تلاش میں میرا رام پور جانا ہوا اور کتب خانہ ریاست سے حضرت امیر خسرو کی تصنیفات برآمد کرائی گئیں، تو پتہ لگا کہ مجموعہ مثنویا تو قصائد میں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے بعض مثنوی اور قصیدہ کو خاص نام سے ملقب کر دیا ہے ــــ مثلاً ایک مثنوی کا نام باز نامہ ہے، دوسری کا اسپ نامہ یا فرسنامہ ہے جس کا ذکر تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی مطبوعہ کلکتہ میں بھی درج ہے ــــ ایک قصیدہ کا نام ''بحر العبر'' معلوم ہوا اور ایک قصیدہ کا نام ''مراۃ الصفا'' ہے جو حکیم خاقانی کے قصیدہ کے جواب میں ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ دوسری مثنویوں کے اور نام ہوں جس سے تصانیف کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض ایسی کتابیں جو حقیقت میں دوسرے مصنفوں

کی تصنیف ہیں عام طور پر حضرت امیر خسرو کا کلام سمجھی جاتی ہیں۔ مجھے نہایت تعجب ہوا کہ ایشیا ٹک سوسائٹی کی لائبریری سے (جو اس ملک میں علمی تحقیقاتوں کا تنہا مرکز ہے) ایک نسخہ قلمی "صفات العاشقین" نام بہ حیثیت کلام حضرت امیر خسرو میرے پاس بھیجا گیا، حالانکہ یہ امیر خسرو کا کلام نہ تھا۔ اوّل تو اس نسخہ کے عنوان میں اس کے مصنف "ہلالی" کا نام درج ہے۔ یہ نام طلائی زمین پر سفید روشنائی سے لکھا ہوا تھا اور اب اس قدر مٹ گیا ہے کہ کافی غور کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس کے علاوہ مولوی رشید احمد صاحب "سالم" پروفیسر فارسی مدرسۃ العلوم علی گڈھ نے (جنہوں نے مجھے اس کام کی نگرانی میں بڑی قابل قدر مدد دی ہے) اس کو ملاحظہ کیا تو اُس میں کافی اندرونی شہادت اس امر کی موجود پائی کہ یہ کتاب مولانا ہلالی کی تصنیف ہے — مثلاً خاتمہ کتاب پر مصنف نے اپنا تخلص ذکر کیا ہے۔

مرا آخر ہلال خویش انکار   "ہلالی" را بلال خویش انکار

اور آگے چل کر شاعر نے دو جگہ پھر اپنا نام ظاہر کیا ہے۔

"ہلالی" را ہوائے اشنائیست   بخورشید اشنائی روشنائست
ہلالی ایں چہ دریائے معانیست   کہ موج آں زبحر آسمانیست
بوصف عاشقاں دفتر کشادم   صفات العاشقین نامش نہادم
نوشتم نامۂ درنیک نامی   کہ خسرو آفریں کردو نظامی

انڈیا آفس لائبریری کی مطبوعہ فہرست میں بھی یہ کتاب مولانا بدرالدین ہلالی استرآبادی کی تصانیف کے ذیل میں درج ہے۔ اس کتاب کے متعلق میں نے ایک مفصل نوٹ مشعر حالات مذکورہ بالا سکریٹری صاحب ایشیاٹک سوسائٹی کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔

ایسی ہی ایک کتاب مثنوی "اشک واہ" حضرت امیر خسرو سے منسوب ہو کر کتب خانہ حیدرآباد سے میرے پاس آئی جس میں جا بجا اندرونی شہادتیں ایسی موجود تھیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حضرت امیر خسرو کا کلام نہیں — اس کتاب کو ملاحظہ کر کے مولوی رشید احمد صاحب پروفیسر فارسی مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے حسب ذیل نوٹ لکھ کر مجھے دیا تھا:-

"مثنوی اشک واہ حسب الحکم نواب صاحب بہادر میں نے دیکھی۔ یہ مثنوی

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب تھی۔ اور اس یقین کے ساتھ میں نے اس کو بغرض تصحیح دیکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن چند صفحات پڑھنے کے بعد مجھے شبہ ہوا اور یہ شبہ بتدریج بڑھتا گیا، کیونکہ اس میں جا بجا ایسی ترکیبیں پائی گئیں جو متاخرین خیال بندوں مثلاً بیدل اور غنیمت وغیرہ کے اختراعات ہیں اور متقدمین کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ حتی کہ جلال اسیر کا کلام بھی جو خیال بنی کا موجد سمجھا جاتا ہے، اس قسم کی ترکیبوں اور اس نہج کی بندشوں سے عاری پایا جاتا ہے۔ مثنوی کا معتد بہ حصہ پڑھنے کے بعد مجھ کو یقین ہوگیا کہ اس کا مصنف غنیمت یا اس کا کوئی ہم رنگ و ہمعصر شاعر ہے۔ کیونکہ اس گروہ کے طرز خیال کے صریح نشانات جا بجا نمایاں معلوم ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر چند ترکیبیں عرض کرتا ہوں۔

''نگاہ خوں بدامن''—''نالہ محشر خروش''—''چمن ساز نگاہ شرر درخرمن سیماب''
''قماش چاک پیراہن''—''دفتر نویس شعل''—''قیامت دررکاب موج خوں''—
''طلوع نشہ پیمانہ غم''—''نمک حل ساز جان ریش''—''شریک کاروان دل بدوش''—
''قیامت حل کن و درساغرم ریز''—یہ اور اس قسم کی بے شمار بندشیں جو مثنوی میں بکثرت ہیں اس امر کا یقین دلانے کے لئے کافی تھیں کہ یہ مثنوی حضرت امیر خسرو کی نہیں ہوسکتی، خاص کر اُن لوگوں کے لئے جو فارسی شاعری کے مختلف ادوار کے کلام پر غائر نظر رکھتے ہیں۔
آگے چل کر ایسے واقعات ملے جن کو دیکھ کر کسی شخص کے دل میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ سکتا۔ مثلاً صفحہ ۴۲ پر میر محمد زمان راسخ کا مرثیہ لکھا ہے جن کی وفات ۱۱۰۷ہجری میں ہوئی۔ اور صفحہ ۴۷ پر بادشاہ دین پناہ محی الدین اورنگ زیب بہادر غازی کی تعریف لکھی ہے—ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہوسکتی—اصل یہ ہے کہ یہ مثنوی میر غازی شہید لاہوری کی تصنیف ہے جن کی وفات ۱۱۳۰ہجری میں ہوئی اور جو میر محمد زماں راسخ سرہندی کے شاگرد ہیں، جیسا کہ انہوں نے مثنوی میں ایک جگہ اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔''

اسی طرح مجھے معلوم ہوا تھا کہ فن موسیقی میں ایک کتاب ''راگ درپن'' نام حضرت امیر خسرو کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے—اس نام کا ایک قلمی نسخہ فارسی زبان میں مجھے ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانہ سے بہم پہونچا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب

ایک شخص ہنونت نامی نے راجہ مان سنگھ والی گوالیار کی فرمائش پر سنسکرت زبان میں لکھی تھی جس کا ترجمہ فقیر اللہ نامی ایک شخص نے ۱۰۷۳ھ ہجری میں بزبان فارسی کیا جوراگ درپن کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب نہایت قابلِ قدر ہے اور میرا قصد ہے کہ اسی سلسلہ میں ترتیب کلیات سے فارغ ہوکر اس کتاب کو بھی شائع کروں، چنانچہ میں نے اس کی نقل کرالی ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ ایک کتاب مسمّی بہ ''خیالات خسروؔ'' کی نسبت پتہ تھا کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے مگر رام پور کے کتب خانہ میں اس نام کا ایک رسالہ موجود تھا جس کے دیکھنے سے ثابت ہوا کہ وہ حضرت امیر خسرو کے زمانہ سے بہت بعد کی تصنیف ہے، اور چونکہ اس کتاب کے شروع میں الفاظ ''خیالات خسروؔ'' واقع ہوئے ہیں غالباً اس لحاظ سے اُس کو امیر خسرو سے منسوب کردیا گیا۔

ایک قلمی نسخہ بہ نام ''رقعات امیر خسروؔ'' میرے ایک لکھنوی دوست نے مجھے دیا تھا۔ مگر اس کی بابت بھی یہی تحقیق ہوا کہ وہ غیر کا کلام ہے — ریاست حیدرآباد سے دو نسخے قلمی ''رقعات حضرت امیر خسروؔ'' کے نام سے آئے تھے۔ ان نسخوں کو ملاحظہ کرکے میرے دوست مولوی شیخ بشیر الدین صاحب رئیس میرٹھ نے (جن کا سا علمی مذاق فی زمانہ مسلمانوں میں کم پایا جاتا ہے) مجھے مندرجہ ذیل نوٹ لکھ کر دیا تھا:-

''میں نے ہر دو جلد رقعات کو (جو کتب خانہ آصفیہ سے آئی ہیں اور حضرت امیر خسرو دہلویؒ سے منسوب ہیں) معائنہ کیا۔ ایک کتاب میں اوّل ورق اور چند اوراق دیگر مقامات سے گم ہوگئے ہیں۔ اس وجہ سے بادی النظر میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ دو جدا جدا کتابیں ہیں، مگر حقیقت میں یہ دونوں کتابیں ایک ہی نسخہ کی نقلیں ہیں۔ پہلے معائنہ ہی میں عبارت کتاب کی طرز سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ حضرت امیر کا کلام نہیں۔ خصوصاً دیباچہ کے عنوان سے پورے طور پر واضح ہوجاتا ہے کہ مصنف مکتوبات کوئی دوسرے بمرگ ہیں جنھوں نے اپنی کتاب کی تیمناً وتبرکاً حضرت امیر خسرو کی مثنوی سے شروع کیا ہے۔ دیباچہ کی عبارت یہ ہے:-

''عنوان نامہ خیالات از مثنوی صاحب کمالات صوری
ومعنوی امیر خسرو دہلوی بیاراست''

اس کے علاوہ رقعات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے بہت سے مختلف شعراء کے اشعار ان رقعات میں تحریر کئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو نے جو غیور طبیعت پائی تھی اُس سے یہ امر بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلام کی تزئین دیگر شعراء کے اشعار سے فرماتے۔ پھر یہ کہ جن شعراء کا کلام نقل کیا گیا ہے ان میں بعض حضرات مثل خواجہ حافظ شیرازی و مولانا جامیؒ و عرفی شیرازی حضرت امیر کے بہت بعد ہوئے ہیں۔ ان شعراء کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں جو ان رقعات میں درج ہیں:۔

خواجہ حافظ شیرازیؒ

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق　　ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما
کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز　　باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را
زاہد شراب کوثر و حافظ پیالہ خواست　　تا درمیان خواستہ کردگار چیست
آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست　　بادوستاں تلطف بادشمناں مدارا
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ان کے علاوہ اور بہت سے اشعار حضرت حافظؒ کے ان رقعات میں جابجا منقول ہیں۔

اشعار مولانا جامیؒ

چیست میدانے صدائے چنگ و عود　　انت حسبی انت کافی یا ودود
آہ ازیں مطرب کہ از یک نغمہ اش　　آمدہ در رقص ذرات وجود
نیست در افسردگاں ذوق سماع　　ورنہ عالم را گرفت است ایں سرود

رباعی

ہمسایہ و ہمنشیں و ہمرہ ہمہ اوست　　در دلق گدا و اطلس شہ ہمہ اوست
در انجمن فرق و نہاں خانہ جمع　　باللہ ہمہ اوست و ثم باللہ ہمہ اوست

عرفی شیرازی

چناں با نیک و بد عرفی بسر کن پس مردو　　مسلمانت بہ زمزم شوید و ہندو بسوزاند

علاوہ ازیں دو موقعوں پر حضرت امیرؒ کا کلام بھی نقل کیا گیا ہے، اور اُس عبارت سے واضح ہے کہ نقل کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہے۔

وخوشتر ازیں بشنو قول امیر خسرو ص ۳۴ ہر کہ قانع شد بہ خشک وتر شہہ بحر و بر است

صفحہ ۴۱ پر حضرت امیر کا کلام اس طرح نقل کیا گیا ہے

تا زم بآں دلے کہ از شعلہ عشق افروختہ بہ آتش محبت سوختہ باشد چنانچہ امیر خسرو میفرماید

رباعی

از آتش عشق ہر کہ افروختہ نیست
با او سر سوزن دلم دوختہ نیست
گر سوختہ دل نۂ زما دور کہ ما
آتش بہ دلے زنیم کو سوختہ نیست

حافظ شیرازی، مولانا جامی اور عرفی کا زمانہ حضرت امیر خسرو کے بعد ہوا ہے۔

حضرت امیر خسرو کا سنہ رحلت ۷۲۵ ہجری ہے اور آپ کی تاریخ رحلت یہ ہے۔

خسرو دہلوی بحکم خدا   بشب جمعہ شد زدار فنا
عمر ہفتاد و پنج سالش بود   کاں زماں شد بدرگہ معبود
ہیز دہم بود از مہ شوال   کہ گذشتہ ازیں جہان ملال
خسرو دہلوی بہشتی بود   سال نقلش بگو کہ چشتی بود

۷۲۵ ہجری

سال نقلش خرد عیاں ونہفت   باز شکر مقال طوطی گفت

۷۲۵ ہجری

حضرت مولانا جامیؒ کا سنہ رحلت سنہ ۷۹۹ ہجری ہے اور آپ کی تاریخ رحلت یہ ہے۔

افصح بے نظیر جامی بود   بکمالات علم نامی بود
ہمہ تصنیف آں معلے شان   عدد جام شد رقم برخوان

ہاتفم گفت سال رحلت او — جائے جامی بہشت عدن بگو

۸۹۹ ہجری

عرفی شیرازی کا زمانہ ۱۰۰۰ ہجری کا ہے اور خواجہ حافظ شیرازیؒ کا سنہ وفات ۷۹۱ھ ہے اور آپ کی تاریخ وفات "خاک مصلے" سے نکلتی ہے۔

۷۹۱ھ

اس تمام تشریح کے بعد ناظرین پر یہ بخوبی ثابت ہو جائے گا کہ یہ رقعات حضرت امیر خسرو دہلوی کی تصنیفات سے نہیں ہیں۔"

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایک طرف تو ایک ایک نسخہ کے متعدد نام ہیں۔ دوسری طرف غیروں کی تصنیفات خسروی میں اختلاف کا ہونا لازمی تھا۔ مگر میری توجہ شروع سے اس طرف مائل رہی ہے کہ کوئی ایسی کتاب جو بلحاظ شہرت امیر خسرو سے منسوب ہو (مگر حقیقت میں اُن کا کلام نہ ہو) وہ جزو کلیت نہ ہو۔ اور اس وجہ سے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ نقل ہونے سے پہلے ہر ایک نسخہ کی جانب اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ اہتمام کیا گیا ہے کہ نقل ہونے سے پہلے ہر ایک نسخہ کی جانب اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ وہ حضرت امیر کی تصنیف ہے اور اس غرض سے یہ نسخے اوّل ایسے قابل اعتماد حضرات کو ملاحظہ کرا دیئے جاتے ہیں جو فارسی شاعری کا صحیح ذوق رکھتے ہیں، جن کی مختلف طبقوں کے شعراء کے کلام پر نظر ہے اور جو فارسی علم ادب کی تاریخ سے واقف ہیں۔

حضرت امیر خسرو کی تصنیفات کی تلاش میں یورپین مستشرقین نے مختلف تذکروں کا مطالعہ کیا ہے۔ بہت سے اُن تذکروں کی فہرست جن کا حوالہ اول الذکر کتابوں میں درج ہے یا خود فارسی تذکروں میں ملتا ہے اس مقام پر درج کرنا خالی از دلچسپی نہوگا، وھو ھذا:- خزانہ عامرہ، نفحات الانس، تذکرہ خوشگو، شمع انجمن، تذکرہ نساخ، تاریخ فرشتہ، تذکرہ عرفات اوحدی، تذکرہ شعراء دولت شاہ سمرقندی، مجمع النفائس، تذکرہ مخزن الغرائب، ریاض الشعراء، بہارستان سخن، تذکرہ والہ داغستانی، ماثر الامرا جواہر الاسرار، ہفت اقلیم، بت خانہ، آتشکدہ، خلاصۃ الکلام، مجالس النفائس، خلاصۃ الاشعار، ہمیشہ بہار، تذکرہ ندرت، خلاصۃ الافکار، تاریخ بداؤنی، تذکرہ طبقات الشعراء قدرت اللہ قدرت۔

ان میں سے بعض تذکرے میں نے فراہم کئے مگر اکثر باوجود کوشش بلیغ اس وقت تک ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوسکے مگر ان تذکروں میں سے کسی میں سوائے اُن کتابوں کے ناموں کے جن کی تعداد ۴۵ سے متجاوز نہیں ہے اور کسی تصنیف کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔

اسی تحقیقات کے سلسلہ میں مجھے ایک دوست نے اطلاع دی تھی کہ بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت امیر خسروؔ نے شیخ سعدیؔ کی گلستان کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا، مگر مجھے کسی تذکرہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔

سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت امیر کے ہندی کلام کا بالکل سراغ نہیں چلتا۔ میں نے سکریٹری صاحب ناگری پرچارنی سبھا بنارس کو بھی خط لکھا تھا کہ اگر آپ کے سلسلہ تحقیقات میں خسرو کا کوئی ہندی کلام ملا ہو تو مطلع کیا جاوے۔ مگر جواب حسبِ مراد نہیں ملا۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے بمقام دہلی مجھے اطلاع دی تھی کہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانہ میں ہندی کا بہت سا کلام پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی صورت میں موجود ہے۔ میں اسی شوق میں اس سوسائٹی سے عرصہ تک مراسلت کرتا رہا۔ اور بالآخر آنریبل جسٹس سر آسوتوش مکرجی اور ڈاکٹر المامون صاحب سہروردی کی توجہ اور ان دونوں بزرگوں کی تحریک وتائید سے ایشیاٹک سوسائٹی کی ممبری کی عزّت بھی مجھے حاصل ہوگئی۔ مگر باوجود پیہم استفسارات کے کسی ہندی کلام کا پتہ اس وقت تک وہاں نہیں چلا۔ ڈاکٹر المامون سہروردی صاب نے جو ایشیاٹک سوسائٹی کے پہلے ہندوستانی فلالوجکل سکریٹری ہیں از راہ عنایت میری استدعا پر اُن تمام مولوی صاحبان کو خاص ہدایت بھی کردی ہے جو سوسائٹی کے زیر ہدایت ملک میں دورہ کرنے پر مامور ہیں۔ اور مختلف لائبریری کا معائنہ کرتے رہتے ہیں کہ جہاں کہیں حضرت امیر کے کلام کا پتہ لگے فوراً مجھے اطلاع دیدیں۔ نیز عمال سوسائٹی کو یہ ہدایت بھی کردی کہ سوسائٹی کے جس قدر نسخے تصنیف امیر خسرو کے مستعار باہر گئے ہوں وہ سب واپس طلب کرلئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی عنایت سے سوسائٹی کو یہ ہدایت بھی کردی کہ سوسائٹی کے جس قدر نسخے تصنیف امیر خسرو کے مستعار باہر گئے ہوں وہ سب واپس طلب کرلئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب

موصوف کی عنایت سے سوسائٹی کے چیف ریسرچ مولوی حافظ نذیر احمد صاحب نے مجھے بہت سی مفید اطلاعیں بھی بھیجیں۔ مگر ہندی کلام کی تلاش میں ہنوز کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ہندی کی بہت سی پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ صاحبزادہ میر رستم علی کے پاس تھیں اوراب وہ نسخہ صاحبزادہ میر شرف الدین صاحب کے پاس ہے جواُن کے قرابت دار ہیں اوردرگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں قیام فرما ہیں میں نے مولانا حسن نظامی صاحب سے استدعا کی کہ وہ اس نسخہ کی تلاش میں مجھے مدد دیں۔ نیز مولانا عبدالواحد صاحب واحدی ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ دہلی کی خدمت میں قصد یعہ دیا کہ وہ مقامی قوالوں سے حضرت امیر کا ہندی کلام جمع کرنے کا اہتمام فرمائیں تو میں اس کوشش کے تمام مصارف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے بعد اسی تلاش وجستجو میں خود بھی دوبار دہلی پہونچا اور حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ نیز تمام اسلامی اخبارات میں کئی بار اعلانات شائع کئے۔ لیکن یہ محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے کچھ نمونہ امیر خسرو کے ہندی کلام کا نقل کیا ہے مگر اس تذکرہ سے یہ پتہ چلتا کہ اس کلام کا ماخذ کیا ہے— مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی رئیس بھیکم پور نے جن کی ہمہ دانی اور علمی قابلیت مسلمہ ہے اور جن کی امداد اس کام میں شروع ہی سے میری کمزور سعی کے شامل حال رہی ہے، بجواب میرے استفسار کے اطلاع دی تھی کہ مولانا محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے نظم اُردو کی ایک تاریخ لکھی ہے اور اس میں حضرت امیر کے ہندی کلام کے حوالے درج ہیں— میں نے اس تاریخ کا پتہ چلانا چاہا مگر اس کا کوئی حال دریافت نہ ہوسکا۔

تلاش تصنیفات

با اقبال زندہ قوموں کی علاماتِ زندگی میں سے ایک یہ علامت بھی ہوتی ہے کہ وہ علم کی توسیع واشاعت اور قوم کی اخلاقی وذہنی ترقی مدنظر رکھ کر اپنے موجود الوقت علما اور مصنفین کی قدرشناسی اور حوصلہ افزائی کے سلسلہ میں اپنی قوم نیز دوسری قوموں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس پیشتر کے گذرے ہوئے شعرا اور مصنفین کے حالات زندگی

معلوم کرنے اور اُن کی تصانیف کا پتہ لگانے اور شائع کرنے اور ان کی عالمگیر شہرت جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں قایم کرنے اور قایم رکھنے میں غیر معمولی جدوجہد سے کام لیتے ہیں۔ مغربی قومیں (خواہ انگریز ہوں یا فرانسیسی یا جرمن) ہرگز ہرگز اپنی قوم کے مشہور مصنفین کے کلام کو ضائع نہیں ہونے دیتیں — طویل یا مختصر جو کچھ ہاتھ لگ جاتا ہے سب کو چھاپ کر زندہ رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ چار لفظوں کا ایک رقعہ بھی مل جاوے تو اسے بھی بچاتے ہیں اور ٹائپ کے ذریعہ سے محفوظ کردیتے ہیں۔ یورپ کے ممالک میں زمانہ ماضی کے مشاہر اہل تصنیف کی سوانح عمری معلوم کرنے اور ان کا کلام جمع کرنے کا شوق اب اس درجہ تک بڑھ گیا ہے کہ انگلستان کے مشہور شاعر شیکسپیر کی سوانح عمری لکھنے والے ایک فاضل انگریز نے لکھا ہے کہ ''اس زمانہ میں ہم اس عہد کا تصوّر باندھنے سے بھی قاصر ہیں جبکہ مصنفین کی سوانح عمریوں سے اہل ملک کو کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی تھی اور جبکہ باوجود اپنے کلام کے مقبول عام ہونے کے شاعر کی خاطر خواہ قدر و منزلت نہ کی جاتی تھی۔ یونان کے شہرۂ آفاق شاعر ہومر کو دنیا سے رخصت ہوئے ہزاروں برس گذر گئے مگر یورپ میں اُس کے کلام کی تازہ شرحیں آج بھی شوق کے ساتھ لکھی اور پڑھی جاتی ہیں — جن شہروں اور مقامات کا اس کے کلام میں ذکر کیا گیا ہے علمی حلقوں میں اُن کے کھنڈرات اور محل وقوع کی بابت محققانہ بحث و مباحثہ کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بعض انگریز شعراء نے سینکڑوں برس پیشتر اپنے کلام میں اگر کسی جھیل یا تالاب یا پہاڑی یا ندی کا ذکر کردیا ہے تو اُن مقامات کو سوانح نویسوں کی بدولت آج تقدس کا وہ درجہ نصیب ہوگیا ہے کہ وہ مقامات آج زیارت گاہ عام و خاص بنے ہوئے ہیں۔ اُن شعراء کے سکونتی مکانوں کی جگہ معین کرنے میں بڑی بڑی محققانہ تلاش و جستجو کی گئی ہے۔ اُن کے دستخطی خطوط یا مسودات اگر اتفاق سے کہیں مل جاتے ہیں۔ تو ہزار ہا روپیہ کی قیمت دے کر ان کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ملک میں ان تحریروں کے فوٹو شائع کئے جاتے ہیں۔ پرانے مصنفین کا کلام نہ صرف تمام و کمال جمع کرلیا جاتا ہے بلکہ ان کی ہر ہر تالیف و تصنیف کی تحریر کا وقت اور زمانہ مشخص کیا جاتا ہے — تصانیف کی تقدیم و تاخیر اور ان کے مضامین کی بنا پر شعراء و مصنفین کے ہزار ہا صفحوں کے طول طویل سوانح عمریاں مرتب ہوجاتی ہیں اور اُن کی عادات و خصائل پر مختلف

پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ شاہ ہمایوں کی ہمشیرہ گل بدن بیگم کی لکھی ہوئی تاریخ ''ہمایوں نامہ'' کے چند اوراق قلمی انگلستان کے برٹش میوزیم کی لائبریری میں موجود تھے ــــ اس قلمی نسخہ کی تکمیل کی غرض سے ایک خاص ماہرِ فن مسٹر بیوریج ہندوستان بھیجے گئے اور وہ تمام ہندوستان کی لائبریریوں میں مکمل نسخہ کی تلاش میں سرگرداں رہے ــــ میرے زمانہ مستقل قیام رام پور میں یہ صاحب میرے بھی مہمان رہے تھے اور اس کتاب کی بابت مجھ سے اور ان سے بہت کچھ گفتگو ہوئی تھی ــــ بالآخر یہ صاحب اپنے نسخہ کو مکمل کر کے انگلستان واپس گئے ــــ زندہ قوموں کی اس کارروائی سے ملک میں مفید تصنیف وتالیف کی جو ترغیب وتصویق ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں ــــ مگر ہم ہندوستانیوں نے اب تک اپنے بڑے بڑے شعراء وعلماء کے مقبول عام کلام میں سے کسی ایک کا بھی پورا کلام جمع اور طبع نہیں کیا ــــ یہاں تک کہ امیر خسرو جیسے کثیر التصنیف مصنف کے اُردو، ہندی اور فارسی کلام کا بڑا حصہ تلف ہو گیا ــــ منجملہ اور علامات کے یہ بھی ایک علامت ہم مسلمانوں کی تیرہ بختی کی ہے ــــ ہندوستان میں زبانِ اُردو کا تحفظ اور اس زبان کی ترقی مسلمانوں کی قومیت کے تحفظ کی ضمانت ہے ــــ اور زبان اُردو کی حفاظت اور ترقی کا دارومدار اس پر ہے کہ قدما کا فارسی اور عربی کلام محفوظ کیا جائے ــــ جو لوگ یورپین علوم وفنون کی اُردو زبان کے ذریعہ سے تعلیم ہونے کے حامی ہیں اور وہ بالکل حق بجانب ہیں ــــ ان کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ فارسی لٹریچر کی حفاظت کا کام پوری سرگرمی سے فوراً شروع کر دیں ــــ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ حضرت امیر خسرو کے کلام کی تلاش سب سے زیادہ مشکل کام ثابت ہوا ــــ اور کام شروع کرنے کی غرض سے ہندوستان کے اس سب سے بڑے مسلمان شاعر ومصنف کے کلام کی تلاش میں سب سے پہلے یوروپین لائبریوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش آئی اور تصنیفات خسروی کی پہلی فہرست لندن کی انڈیا آفس لائبریری کے قلمی فارسی نسخوں کے کٹلاگ سے مرتب ہو سکی۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

یہ کٹلاگ (فہرست) انڈیا آفس لائبریری میں مندرجہ ذیل نسخے منجملہ تصانیف

حضرت امیر خسرو کے موجود ہیں:-

دواوین (۱) تحفۃ الصغر (۲) وسط الحیوۃ (۳) دیباچہ غرۃ الکمال (۴) دیوان غرۃ الکمال یا کتاب الکمال (۵) بقیہ نقیہ۔

خمسہ (۶) مطلع الانور (۷) خسرو شیریں (۸) مجنوں لیلیٰ (۹) ہشت بہشت (۱۰) آئینہ سکندری۔

مثنویات (۱۱) قرآن السعدین (۱۲) خضر خانی یا عشقیہ (۱۳) نہ سپہر (۱۴) مفتاح الفتوح یا فتح الفتوح یا فتح نامہ (۱۵) مجموعہ مثنویات۔

متفرق (۱۶) مجموعہ رباعیات (۱۷) مجموعہ غزلیات (۱۸) قصیدہ امیر خسرو متضمن، حقیقت شاہ نامہ فردوسی۔

کلام نثر (۱۹) رسائلِ اعجاز یا اعجاز خسروی (۲۰) انشاء خسرو جس میں صوفیانہ رنگ کے رقعات ہیں اور گویا رسائلِ اعجاز کا تتمہ ہے (۲۱) احوال امیر خسرو۔

باقی ۱۷ قلمی نسخے مندرجہ بالا نسخوں کے مکررات ہیں۔ مثلاً کلیات کے نام سے ۳ نسخے ہیں جو بالترتیب ۸۶۹ ، ۹۳۲ اور ۱۰۰۸ ہجری کے لکھے ہوئے ہیں قران السعدین کے سات نسخے درج ہیں۔ خمسے کے پانچ نسخے، مطلع الانوار اور ہشت بہشت کے دو دو نسخے ہیں۔

یہ سب سے بڑی فہرست ہے جو کسی ایک جگہ امیر خسرو کے کلام کی مل سکی اور اس وقت تک تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انڈیا آفس لائبریری کی بہ نسبت تعداد میں زیادہ اور کسی ایک لائبریری میں امیر خسرو کا کلام جمع نہیں ہے۔ ہندوستان کی مشہور لائبریریوں میں سے شاہان اودھ کے کتب خانوں کی جو فہرست ۱۸۵۴ء میں ڈاکٹر اسپرنگر نے مرتب کی تھی اس کے مطابق ان کتب خانوں میں بھی کوئی ایسی تصنیف نہیں تھی جو اوپر کی فہرست میں شامل نہ ہو— بانکی پور کی لائبریری میں مذکورہ بالا فہرست سے ایک دیوان یعنی (۲۲) دیوان نہایت الکمال زیادہ ہے جس کو اس کتب خانہ کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر ڈیزن راس (۱۹۰۸ء) میں امیر خسرو کا پانچواں دیوان ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا ایک قلمی نسخہ حبیب گنج ضلع علی گڑھ کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔ نیز ایک قلمی نسخہ لندن برٹش میوزیم کے کتب

خانہ میں بھی ہے اور حال میں دیوان دہلی میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔لندن برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں بھی انڈیا آفس کے کتب خانہ سے زائد اور کوئی نسخہ نہیں ہے ایشیاٹک سوسائٹی کے چیف ریسرچ مولوی حافظ نذیر احمد صاحب نے براہ مہربانی مجھے بادلین لائبریری کتب خانہ برلن، کتب خانہ خدیر مصر، کتب خانہ حاجی حبیب اللہ صاحب واقع نیلور، کتب خانہ شمس العلماء قاضی عبداللہ صاحب واقع مدراس کی فہرست تصانیف امیر خسرو مجھے عنایت کی ـــ مگر ان میں سے کسی کتب خانہ میں کسی نئے تصنیف کا وجود نہیں پایا گیا۔ حبیب گنج ضلع علی گڑھ میں مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور کی لائبریری ہے جس میں بعض نادرالوجود قلمی نسخے ہیں۔مگر یہاں بھی کسی نئے نسخے کا پتہ نہیں چلا ریاست رامپور کے کتب خانہ میں میں خود حاضر ہوا۔اس میں (۲۳) خزائین الفتوح کا ایک ایسا نسخہ برآمد ہوا جو مذکورہ بالا کتب خانوں میں موجود نہیں ہے۔ریاست حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ میں حضرت امیر خسرو کی تصانیف میں سے دو نئے نسخے (۲۴) نصاب بدیع العجائب ونصاب مثلث و (۲۵) افضل الفوائد دستیاب ہوئے ان (۲۵) نسخوں کے علاوہ (۲۶) خالق باری مشہور کتاب ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ ایک ضخیم کتاب کئی جلدوں میں تھی۔اب جو کتاب بچوں کو اوائل عمر میں پڑھائی جاتی ہے وہ اس کا مختصر اقتباس ہے (۲۷) قصہ چہار درویش فارسی جس کا اُردو ترجمہ باغ و بہار ہے حضرت امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل تصانیف کے نام مختلف تذکروں اور اثناء تحقیقات میں براہ راست یا ان بے شمار خطوط کے جواب میں جو اطراف ملک میں تصانیف کا پتہ لگانے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔علم دوست حضرات کے مراسلوں سے معلوم ہوئے۔

(۲۸) باز نامہ (۲۹) اسپ نامہ، یا فرس نامہ (۳۰) بحر العبر (۳۱) مراۃ الصفا (۳۲) شہراشوب یا مجموعہ رباعیات برطبق حالات اہل حرفہ (۳۳) تغلق نامہ (۳۴) تاج الفتوح (۳۵) تاریخ دہلی (۳۶) مناقب ہند (۳۷) حالات کنہیاوکرشن (۳۸) مکتوبات امیر خسرو (۳۹) جواہرالبحر (۴۰) مقالہ (حالات خلفائے اربعہ) (۴۱) راحت المحبین (۴۲) رسالہ ابیات بحث (خسرو و حاجی) (۴۳) شکرف بیان (۴۴) ترانہ ہندی (۴۵) مناجات خسرو۔

منجملہ نسخہ جات مذکورہ بالا کے باز نامہ، اسپ نامہ، حز العبر، مراۃ الصفا خاص خاص قصائد اور مثنویوں کے نام ہیں جو حضرت امیر کے دیوانوں کا جزو ہیں — اور یہ چاروں ریاست رام پور کے کتب خانہ میں دستیاب ہوئے۔ شہر آشوب کی نقل لکھنؤ سے بہ توجہ شیخ بشیر الدین صاحب رئیس میرٹھ حاصل ہوگئی — تغلق نامہ کی بابت صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ میر مہدی حسن صاحب مجروح دہلوی کے پاس تھا۔ باقی اور نسخوں کی بابت اب تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ تصانیف اس ملک میں کہاں موجود ہیں اور ان کی اصل یا نقل کیونکر دستیاب ہو سکتی ہے۔

مجھ کو احباب کی زبانی یا اثناء مراسلت میں اگر ذرا بھی معلوم ہوا کہ فلاں صاحب نے کچھ نہ کچھ سراغ تصنیفات حضرت امیر خسرو کا ملے گا تو میں نے اُن حضرات سے پیہم مراسلت کرنے اور یاد دہانیاں بھیجنے میں کبھی تساہل نہیں کیا — اس کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، آگرہ، کلکتہ، پٹنہ، بانکی پور، کوئٹہ، پشاور، کشمیر، بمبئی اور مدراس کے ممتاز مسلمانوں کی خدمت میں نیز ریاست بھوپال، ٹونک، لوہارو اور پٹودی کے معززین کی خدمت میں بطور خود بہت سے خطوط بھیجے — اور اسلامی اخبارات میں متواتر مضامین شائع کر کے علم دوست حضرات کو اس کام کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ اور آخر کار مالکان مطابع و متعلقین کتب خانہ جات کی توجہ تلاش کی طرف مائل کرنے کی غرض سے ایک انعامی اعلان بھی تمام اخبارات میں شائع کرایا اور اس اعلان کی کاپیاں فرداً فرداً بہت سے مطابع اور کتب خانوں کو بھیجیں۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ جو صاحب کسی نئی تصنیف کے نام اور صحیح پتہ سے اطلاع دیں گے تو ہر تصنیف کی بابت مطلوب اطلاع کے عوض پانچ روپے انعام دیا جائے گا — اور بعد میں اس انعام کی مقدار بڑھا بھی دی تھی۔ مگر اس اعلان کے جواب میں بھی کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی — اس موقع پر یہ بیان کرنا ضرور سمجھتا ہوں کہ میرے کرم فرما حافظ احمد علی خاں صاحب "شوق" افسر کتب خانہ و سپرنٹنڈنٹ کارخانجات ذات خاص سرکار رامپور نے میری استدعا پر مختلف کتابوں سے نقل کرا کے اور بعض جو زبانی لوگوں کو یاد تھیں جمع کر کے امیر خسرو کی پہیلیوں کا ایک مجموعہ مرحمت فرمایا ہے جو موجود ہے اور اپنے والد صاحب مرحوم کی بیاض سے ایک نظم موسم بہ "گھڑیال خسرو" نقل کر کے عنایت فرمائی تھی جس میں اُنگلیوں

کے ذریعہ سے شناخت اوقات کا طریقہ نظم کیا گیا ہے اس کی نسبت موصوف نے تحریر فرمایا تھا کہ مجھے یہ تحقیق نہیں کہ یہ نظم حضرت امیر خسرو کی تھی یا نہیں میں نے اس کو اخبار میں شائع کر کے دریافت کیا تھا کہ اس نظم کی بابت اگر کسی صاحب کو کچھ تفصیل معلوم ہو تو مطلع فرمائیں — مگر اس وقت تک کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

فراہمی کتب

سب سے پہلے وہ کتابیں جو طبع ہو چکی ہیں قیمتاً خریدی گئیں۔ حضرت امیر خسرو کی تصنیفات میں سے سب سے زیادہ تعداد مطبع نولکشور نے چھاپ کر شائع کی ہے — اس مطبع سے کتب ذیل خریدی گئیں۔

(۱) مطلع الانوار (۲) لیلیٰ مجنوں (۳) ہشت بہشت (۴) قران السعدین (۵) خالق باری (۶) کلیات خسرو (جس میں چار دیوانوں کی منتخب غزلیات ہیں) (۷) اعجاز خسروی

کتب خانہ نظامیہ دہلی واقع درگاہ حضرت محبوب الٰہی سے (۸) دیباچہ غرۃ الکمال (۹) دیوان نہایت الکمال (۱۰) اور آئینۂ سکندری، تین نسخے خریدے گئے۔

علی گڑھ کے ایک تاجر کتب سے نسخہ (۱۱) نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث خریدا ہوا۔

دہلی درگاہ حضرت محبوب الٰہی سے ایک نسخہ قلمی (۱۲) افضل الفوائد کا اور (۱۳) ایک مجموعہ قلمی غزلیات کا دستیاب ہوا۔

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی لائبریری سے مندرجہ ذیل ۸ قلمی نسخے مستعار لئے گئے۔

(۱۴) خزائن الفتوح (۱۵) اعجاز خسروی (۱۶) مجموعہ قصائد خسروی (۱۷) مثنوی نہ سپہر (۱۸) مثنوی عشقیہ (۱۹) مثنوی لیلیٰ مجنوں (۲۰) مثنوی ہشت بہشت (۲۱) مثنوی مطلع الانوار۔

سید آل عباس صاحب مارہروی نے دو نسخے قلمی مستعار عنایت فرمائے (۲۲) خزائن الفتوح (۲۳) سکندر نامہ خسروی۔

ان کے علاوہ ذیل کے نسخے مختلف مقامات سے ہدیۃً'' یا مستعار حاصل ہوئے:۔

عطیہ نواب عماد الملک بہادر: خمسہ خسروی قلمی جس میں (۲۴) مطلع الانوار۔ (۲۵) لیلیٰ مجنوں (۲۶) سکندر نامہ اور (۲۷) ہشت بہشت شامل ہیں۔ اس جلد میں مثنوی شیریں خسرو شامل نہیں ہے نواب عماد الملک بہادر نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب یہ خمسہ ترتیب کلیات خسروی کے کام سے فارغ ہوجاوے تو جناب ممدوح کی طرف سے ہدیتاً مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی لائبریری کو دیدیا جاوے۔

عطیہ دیوان مبارک سنگھ صاحب کارندہ ریاست دلوت پور ضلع بلند شہر۔ یہ قلمی نسخہ خمسہ کا منشی مبارک سنگھ صاحب نے ازراہ مہربانی ہدیتاً مجھے عنایت فرمایا۔ اس میں پانچ مثنویاں شامل ہیں یعنی (۲۸) مطلع الانوار (۲۹) شیریں خسرو (۳۰) لیلیٰ مجنوں (۳۱) سکندر نامہ (۳۲) ہشت بہشت۔

مستعار از کتب خانہ دیو بند (۳۳) نسخہ نصاب مثلث وبدیع العجائب قلمی و (۳۴) قران السعدین مطبوعہ قدیم۔

مستعار از کتب خانہ مولانا شبلی مرحوم واقع اعظم گڑھ موسوم بہ دارالمصنفین (۳۵) دیوان غرۃ الکمال قلمی۔

مستعار از کتب خانہ حبیب گنج (۳۶) دیباچہ غرۃ الکمال (۳۸) خزائن الفتوح (۳۹) مثنوی عشقیہ۔ (۴۰) نصاب بدیع العجائب نصاب مثلث (۴۱) مثنوی قران السعدین (یعنی مثنوی درتعریف دہلی) (۴۲) و (۴۳) افضل الفوائد (دو نسخے ایک قلمی، دوسرا مطبوعہ) (۴۴) دیوان امیر خسرو جس میں جملہ دواوین کی منتخب غزلیات درج ہیں اور آخر میں پانچسو رُباعیاں لکھی ہوئی ہیں۔

مستعار از کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر: (۴۵ لغایت ۴۹) خمسہ مسروی (۵۰) غرۃ الکمال۔

مستعار از کتب خانہ ایشیاٹک سوائٹی بنگال (۴۶) دیوان بقیہ نقیہ قلمی۔

اور جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے (۵۱) نسخہ شہر آشوب (رباعیات متعلق اہل حرفہ) کی نقل لکھنؤ سے حاصل ہوگئی۔ اور (۵۲) نظم گھڑیال خسرو اور (۵۳) پہیلیوں کا مجموعہ حافظ

احمد علی خاں صاحب شوق افسر کتب خانہ ریاست رام پور نے عنایت فرمایا۔

مندرجہ بالا تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں (جو ترتیب کلیات خسروی کے کام کا مرکز ہے) حسبِ ذیل نسخے فراہم ہو گئے۔

(۱) مطلع الانوار[۵] (۲) لیلیٰ مجنوں[۵] (۳) ہشت بہشت[۵] (۴) سکندر نامہ[۵] (۵) خسرو شیریں[۲] (۶) قران السعدین[۳] (۷) خزائن الفتوح[۲] (۸) نصاب بدیع العجائب[۳] ونصاب مثلث (۹) افضل الفوائد[۲] (۱۰) دیباچہ غرۃ الکمال[۱] (۱۱) دیوان غرۃ الکمال[۲] (۱۲) دیوان تحفۃ الصغر[۱] (۱۳) دیوان نہایت الکمال[۱] (۱۴) دیوان بقیہ نقیہ[۱] (۱۵) اعجاز خسروی[۲] (۱۶) نہ سپہر[۱] (۱۷) عشقیہ[۲] (۱۸) خالق باری[۱] (۱۹) شہر آشوب[۱] (۲۰) نظم گوپال[۱] (۲۱) پہیلیوں کا مجموعہ[۱] (۲۲) مجموعہ قصائد[۱] (۲۳) مجموعہ دواوین[۲]۔

ان کے علاوہ کتب خانہ ریاست رام پور سے مندرجہ ذیل کتابیں مستعار ملی ہیں جن کی باجازت ہز ہائنس نواب صاحب بہادر دام اقبالہ زیر نگرانی حافظ احمد علی خاں صاحب افسر کتب خانہ ریاست رام پور میں نقلیں ہو رہی ہیں اور جو نسخے پہلے سے موجود ہیں ان کا بغرض تصحیح صرف مقابلہ ہو رہا ہے۔

(۱) اعجاز خسروی (۲) کلیات خسرو مسمی (۳) قران السعدین (۴) مثنوی عشقیہ (۵) خمسہ خسرو مشتمل بر مطلع الانوار (۶) لیلیٰ مجنوں (۷) خسر شیریں (۸) سکندر نامہ (۹) ہشت بہت اور (۱۰) نصاب بدیع العجائب (۱۱) خالق باری (۱۲) بوجھ پہیلی (۱۳) قصہ چہار درویش (۱۴) مجموعہ قصائد (جس میں ۶۰۰ قصائد ہیں) (۱۵) تحفۃ الصغر (۱۶) وسط الحیوۃ (۱۷) بقیہ نقیہ (۱۸) غرۃ الکمال (۱۹) مجموعہ قصائد و غزلیات (جو ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں) (۲۰) مجموعہ دو دیوان قلمی یعنی تحفۃ الصغر و وسط الحیوۃ ان کے حاشیہ پر شیریں خسرو اور قران السعدین لکھی ہوئی ہیں (۲۱) خزائن الفتوح (۲۲) رباعیات اہل حرفہ جس میں وہ رباعیات حضرت امیر خسرو کے بھی شامل ہیں جو نسخہ شہر آشوب میں درج ہیں۔

انگلستان کی انڈیا آفس لائبریری میں جو کتابیں موجود ہیں اُن کی فہرست اوپر درج ہو چکی ہے۔

لندن کے برٹش میوزیم میں حسب ذیل نسخے موجود ہیں جیسا کہ کٹلاگ مرتبہ چارلس ریو مطبوعہ ۱۸۸۳ء میں درج ہے: (۱) کلیات خسرو (۲) دیوان خسرو (۳) خمسہ خسرو (۴) تحفۃ الصغر (۵) وسط الحیوۃ (۶) غرۃ الکمال (۷) بقیہ نقیہ (۸) نہایت الکمال (۹) قران السعدین (۱۰) مفتاح الفتوح (۱۱) خزائن الفتوح (۱۲) مثنوی عشقیہ (۱۳) نہ سپہر (۱۴) رسائل اعجاز (۱۵) مجموعہ غزلیات۔

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں ۳ نسخے موجود ہیں (۱) لیلیٰ مجنوں (۲) آئینہ سکندری (۳) قران السعدین)

کتب خانہ خدیو مصر میں دو مجموعہ دیوان اور ایک جلد خمسہ موجود ہیں۔

باڈلن لائبریری میں ذیل کے نسخے موجود ہیں:- وسط الحیوۃ (۲) غرۃ الکمال (۳) بقیہ نقیہ (۴) خمسہ (۵) قران السعدین (۶) نہ سپہر (۷) خضر خانی یا عشقیہ۔

کتب خانہ برلن میں موجود ہیں: (۱) خمسہ (۲) دیوان خسرو (۳) ہشت بہشت (۴) قران السعدین (۵) آئینہ سکندری (۶) مطلع الانوار (۷) شیریں خسرو۔

ہندوستان کی لائبریریوں میں سے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی لائبریری میں نسخہ جات ذیل موجود ہیں: (۱) خالق باری (۲) اعجاز خسروی (۳) خمسہ خسروی (۴) قران السعدین (۵) مطلع الانوار (۶) بقیہ نقیہ (۷) عشقیہ۔

بانکی پور لائبریری میں موجود: (۱) تحفۃ الصغر (۲) غرۃ الکمال (۳) نہایت الکمال (۴) قران السعدین (۵) عشقیہ (۶) مطلع الانوار (۷) خمسہ خسروی (۸) دیوان خسرو جس کے آخر میں ۴۷ قصائد ہیں۔

کتب خانہ ٹیپو سلطان میں ہیں: (۱) خمسہ خسرو (۲) نہ سپہر (۳) قران السعدین (۴) عشقیہ (۵) مطلع الانوار (۶) دیوان خسرو

کتب خانہ ندوۃ العلما میں: اعجاز خسروی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو نواب ضیاء الدین خاں نیر۔ رخشان دہلوی مرحوم کے کتب خانہ میں تھا۔

حبیب گنج ضلع علی گڑھ کی لائبریری میں ذیل کے نسخے موجود ہیں (۱) تحفۃ الصغر (۲) دیباچہ غرۃ الکمال (۳) دیوان نہایت الکمال (۴) دیوان قصاید (۵) مجموعہ

غزلیات دواوین (۶) خمسہ خسروی (۷) نہ سپہر (۸) عشقیہ (۹) قران السعدین۔

انتظام نقل

علی گڑھ میں جس قدر نسخے بہم پہونچ سکے ان میں سے سب کی ایک ایک نقل اس غرض سے کرائی گئی ہے کہ اس ایک نقل کا مختلف مقامی اور غیر مقامی نسخو سے مقابلہ ہو کر اس کی صحت ہو سکے۔ اس کام کے ئے دو خوشنویس (جو میرے دفتر کی نگرانی میں پورا وقت نقل کے کام پر صرف کرتے رہے) مقرر کئے گئے تھے۔ معاوضہ مشاہرہ کی صورت میں بھی دیا گیا اور فی جزو مقررہ شرح اجرت بھی ادا کی گئی۔ دونوں صورتوں میں معاوضہ کی شرح کم سے کم ایک روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ روپیہ فی جزو ہوتی ہے۔

جو کتابیں کتب خانہ رام پور سے مستعار عنایت ہوئے اُن کی نقل کا انتظام رام پور ہی میں کرنا پڑا۔ ایک فارسی داں خوشنویس میرٹھ سے رام پور بھیجے گئے اور تین مقامی خوشنویسوں کو کتاب کے لئے مامور کیا گیا۔ یہ تینوں حضرات اُن نسخوں کی نقلیں کر رہے ہیں جو علی گڑھ نہیں پہونچ سکے۔ نیز چونکہ مجموعہ قصائد و مجموعۂ غزلیات و رباعیات کا رام پور کی کتابوں میں وافر ذخیرہ ہے، لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ ایک باران سب کی نقل حاصل کر لی جاوے تاکہ صدر مقام میں مشترک حصے حذف ہو کر غیر مشترک منتخب ہو سکیں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد قصد ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں میں اپنے کاتب بھیج کر اُن نسخوں کی نقلیں حاصل کر لی جائیں جن کی پیشتر نقل نہ ہو چکی ہو۔

ستمبر ۱۹۱۵ء میں میں نے اس صوبہ کی لوکل گورنمنٹ کو مراسلہ بھیج کر عرض کیا ہے ۱
کہ ہم کو کلیات امیر خسروؒ کی نہایت صحت کے ساتھ ترتیب و اشاعت مقصود ہے۔ ہندوستان میں جو نسخے ملتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا بنظر صحت یہ استدعا ہے کہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ سے یا تو مندرجہ ذیل کتب برائے چندے مستعار منگا دی جائیں، ورنہ فوٹوگرافی نقلیں ان کی بہم پہونچا دی جائیں۔

(۱) دیوان امیر خسرو (۲) کلیات امیر خسرو (۳) غزلیات امیر خسرو (۵) مفتاح الفتوح۔ میں نے گورنمنٹ سے یہ بھی استدعا کی ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کی وہ فہرست بھی کسی طرح بہم پہونچائی جاوے جس میں تصانیف خسروی کے ۹۹ نسخوں کی تفصیل درج ہے۔

اگر گورنمنٹ کی توجہ سے یہ نقول اور فہرست میسر ہو گئیں تو نسخوں کی تصحیح اور باقی کتابوں کی تلاش میں بہت سہولت ہو جائے گی۔

یورپ کی لائبریریوں میں سے کسی میں اب تک کسی ایسے نسخہ کا پتہ نہیں چلا جس کا مابعد تحقیقات سے ہندوستان کی کسی نہ کسی لائبریری میں سراغ نہ لگایا گیا ہو۔ لیکن اگر آئندہ کسی نئی تصنیف کا پتہ چلا تو فوٹو کے ذریعہ سے ان کی نقل حاصل کی جائے گی جس کا معاوضہ بہت گراں نہیں ہوتا۔

انتظام مقابلہ تصحیح و تصنیف

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم کام مقابلہ خصوصاً تصحیح کا کام ہے۔ فارسی کا مذاق ملک سے مفقود ہو چکا ہے جو اہلِ کمال اس علم کے ماہر تھے وہ رفتہ رفتہ سب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ چونکہ حالات موجود کے ماتحت علم فارسی کی ملک میں ضرورت اور مانگ نہیں رہی اس لئے علوم فارسی کی طرف سے اہل ملک کی توجہ ہٹ گئی۔ خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی مرحوم سے جو اس دورآخر کے مستند فارسی اساتذ میں سے تھے) میں نے اُن کے زمانۂ حیات میں استدعا کی تھی کہ تصحیح کے کام میں کچھ امداد فرمائیں۔ مگر جناب مرحوم نے ضعف و علالت کا عذر فرما کر لکھا تھا کہ اگر کوئی نسخہ میرے پاس بھیج دیا جائے گا تو میں اُس کی صحت کی حتی الوسع کوشش کروں گا۔ مگر قبل اس کے کہ جناب موصوف کے اس وعدہ سے استفادہ ہو سکے انہوں نے رحلت فرمائی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا حالی مرحوم سے بھی میں نے یہی تحریک کی تھی مگر وہ بھی طویل علالت کے بعد راہی جنت ہوئے—— مولانا شبلی مرحوم سے تصحیح کے کام میں مدد لینے کے لئے بہت زیادہ امید تھی۔ مگر اجل نے اُن کو بھی مہلت نہ دی۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بھی پابرکاب ہیں۔ اور پیرانہ سالی سے معذور ہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالغنی صاحب ''غنی'' جو اس وقت خاص علی گڑھ میں قیام پذیر ہیں اور فارسی لٹریچر کے ماہر کامل ہیں یہ ایں ہم اسبابِ مخالفت میں نے کافی غور و فکر اور تلاش کے بعد مقابلہ و تصحیح کا کام ایسے حضرات کے سپرد کیا ہے جو میرے علم و یقین میں اس کام کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ ان سب میں مقدم مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم

پور ہیں جن کی نادر لائبریری کا ذکر گذر چکا ہے۔آپ کی تاریخی معلومات غیر معمولی، مطالعہ بہت وسیع اور رائے نہایت صائب ہے — اگر کاروبار ریاست حائل مشاغل علمیہ نہ ہوتے اور آپ اپنے کمال علمی کے پردہ داری پر اس قدر مصر نہ ہوتے، تو یقیناً آپ کا شمار بجائے رؤسائے ضلع علی گڑھ کے طبقہ مشاہیر علماء فضلا میں ہوتا۔میری استدعا پر آپ نے نہایت مہربانی سے بعض نسخوں کی تصحیح وتنقید کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔

دوسرے مولوی رشید احمد صاحب ''سالم'' مولوی فاضل مدرستہ العلوم علی گڑھ کے پروفیسر فارسی ہیں۔آپ اعلیٰ فارسی قابلیت کے ساتھ عربی کے بہت اچھے ادیب ہیں۔ فارسی شاعری کا ذوق صحیح رکھتے ہیں۔فارسی علم ادب کی تاریخ اور اس کی درجہ بدرجہ تبدیلیوں سے بخوبی واقف ہیں — اور مختلف طبقوں کے شعراء کے کلام پر آپ کی نظر ہے — علی گڑھ کالج کے ایم اے کے وہ طلبا جو فارسی زبان اختیار کرتے ہیں مولوی صاحب کے فیض تعلیم سے خاطر خواہ مستفیض ہوتے ہیں۔

تیسرے مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری ہیں جو اپنی تصانیف کی وجہ سے غالباً کسی تعریف کے محتاج نہیں — آپ بھی مدرستہ العلوم علی گڑھ کے زمرہ اساتذہ میں سے ہیں۔فارسی کے بہت بلند پایۂ عالم ہیں اور آپ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔

چوتھے خاں صاحب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس میرٹھ وپنشنر ہیڈ مولوی ہیں جن کی مقبول عام تصانیف سرکاری مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔آپ علم فارسی کے ماہر ہونے کے علاوہ فن تعلیم میں بھی غیر معمولی دستگاہ رکھتے ہیں — آپ کا اُردو کلام نظم ونثر قبول عام کا رتبہ حاصل کیے ہوئے ہے — آپ اس دور کی زندہ یادگار ہیں — اپنے معاصرین میں مذاق فارسی کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز سمجھے گئے ہیں — آپ کی ذکی وفہم طبیعت میں نکتہ سنجی اور تنقید کا ملکہ بڑھا ہوا ہے۔

پانچویں مولوی احمد حسن صاحب ''شوکت'' میرٹھی ہیں جو مجدد السنۂ مشرقیہ کے لقب سے مشہور ہیں اور جن کی فارسی زبان میں مہارت شہرت عام حاصل کر چکی ہے اور جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

چھٹے مولوی ابوالحسن صاحب ''جوہر'' ساکن میرٹھ ہیں جو فارسی کے بہت قابل

اساتذہ میں سے ہیں اور مدت العمر آپ کا شغل کتب فارسی کی درس وتدریس رہا ہے۔ بمبئی میں عرصے تک ایرانیوں کی صحبت میں رہنے کا آپ کو اتفاق ہوا ہے اور بمبئی کے ایک مشہور کتب خانہ کی فارسی کتابوں کی صحت کا کام بھی آپ نے انجام دیا ہے۔

ساتویں مولوی سعید احمد صاحب ہیں جو عربی فارسی کے عالم ہیں۔ جو فارسی کتابیں سرکاری نصاب تعلیم میں داخل ہیں اُن کی شرحیں اور مشکل مقامات کے حل مولوی صاحب کے تالیف کئے ہوئے طلبا میں مقبول ہیں۔ اس سلسلہ میں فارسی شعراء اور مصنفین کے کلام پر غور کرنے کا آپ کو بہت موقعہ ملتا رہا ہے۔

ان حضرات دینیات میں جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے بھی میری استدعا پر کچھ وقت تصانیف خسروی میں سے بعض نسخوں کی تصحیح وتنقید پر صرف کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ آپ کا مذاق فارسی اور علم وفضل میری تعریف سے بالاتر ہے۔ نیز میرے مخلص دوست مولوی شیخ بشیر الدین صاحب رئیس میرٹھ (جو علوم فارسی سے بہت اچھی طرح واقف ہیں) نہ صرف اپنی لائبریری سے نقل ومقابلہ کے لئے مختلف نسخے مستعار دیتے رہے ہیں، بلکہ مقابلہ وتصحیح کے کام میں بھی اپنا بہت سا وقت عزیز صرف فرماتے رہے ہیں، مولانا احمد حسن صاحب ''شوکت'' میرٹھی کی خدمت میں کتابیں بغرض مقابلہ وہ تصحیح آپ ہی کی معرفت جاتی رہی ہیں اور بعد مقابلہ وتصحیح کے بنظر احتیاط آپ بھی اُن کتابوں پر ہمیشہ نظر ثانی کرتے رہے ہیں اور اپنے مفید مشوروں سے مجھے ممنون فرماتے رہے ہیں۔

غرض تصحیح کے کام کے لئے مذکورہ بالا نو رتن میں نے بہت کدوکاوش سے جمع کئے ہیں اور میں اس سے بہتر انتخاب نہیں کرسکتا تھا۔ اور مجھ کو پورا اطمینان ہے کہ جو نسخے ان حضرت کی نظر سے گذر جائیں گے وہ بالکل صحیح ہوں گے۔ عمل یہ ہے کہ جن جن کتابوں کی نقلیں ہو چکی ہیں وہ فرداً فرداً یکے بعد دیگرے ان حضرات کی خدمت میں پہونچادی جاتی ہیں اور نقل کے ساتھ اصل اور اُس کتاب کے جس قدر زائد نسخے ہوتے ہیں وہ بھی ساتھ بھیج دیئے جاتے ہیں — قرار دادیہ ہے کہ اوّل ایک ہی کتاب کا اس کے دوسرے نسخوں کسے مقابلہ ہو اور مختلف نسخوں میں جہاں جہاں قرأت کا اختلاف ہو وہ حاشیہ پر ظاہر کردیا جاوے اور نقل میں جو الفاظ یا عبارت کسی وجہ سے رہ گئی ہو ان کو دوسرے نسخوں کی مدد سے پورا کردیا

جاوے۔ غیر مانوس اور غریب الفاظ کے معنی حاشیہ پر درج کر دیئے جائیں۔ پھر ایک نقادانہ نظر ہر نسخہ پر ڈالی جائے اور اس کا خلاصہ مضمون اس کی نمایاں خصوصیات اور اس کے محاسن ومعائب (اگر کچھ ہوں) ایک تبصرہ کی صورت میں قلمبند کر دیئے جائیں۔

جن کتابوں کا صرف ایک ایک ہی نسخہ ملا ہے اُن کا مقابلہ دوسرے کتب خانہ کے نسخوں سے کرایا جائے گا۔

ترتیب

خمسہ کی ترتیب میں بادالنظر میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے مستقل مثنویوں مثلاً قران السعدین، عشقیہ، نہ سپہر وغیرہ کی ترتیب میں کسی دشواری کا اندیشہ نہیں ہے۔ مگر رام پور کے کتب خانہ کے نسخوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دواوین کی ترتیب وتقسیم پورے طور پر معین ومشخص نہیں ہے۔ مثلاً غرۃ الکمال کے ایک نسخہ میں بہت سی ایسی غزلیں شامل ہیں جو دیوان وسط الحیوۃ میں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح پانچوں دیوانوں میں بعض مشترک غزلوں کا وجود پایا گیا ہے۔ یہ مجموعہ غزلیات میں بے شمار غزلیں غیر مشترک ملتی ہیں جن کی نسبت ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ پانچوں دیوانوں سے جدا ہیں یا اگر کسی دیوان کا جزو ہیں تو کس دیوان کا؟

یہی حال مطبوعہ ہائے قصاید ومثنویات کا ہے۔ جن کی بابت اب تک یہ پتہ نہیں ہوسکا کہ ان میں سے کون کون سے قصائد ومثنویات کا ہے۔ جن کی بابت اب تک یہ پتہ نہیں ہوسکا کہ ان میں سے کون کون سے قصائد ومثنویات مستقل جداگانہ تصانیف ہیں اور کون کون سے دواوین خسرو کا جزو ہیں۔ لہٰذا یہ سب مواد اوّل ایک جگہ جمع ہوکر پھر بلحاظ نوعیت اور پایۂ کلام یا اندرونی شہادات کے اس کی تقسیم وترتیب عمل میں آئے گی۔ پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ جس قدر نسخے طبع ہوں وہ سب صحیح ہوں اور ان کی مقدار وترتیب حتی المقدور خود حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے اصلی نسخوں کے مطابق ہو۔

انتظام طبع

یہ امر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پبلک کو متوجہ کرنے کی غرض سے کلیات کا آغاز

ایک مقدمہ ہو جس میں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح عمری درج ہوں، آپ کے کلام پر مختصر ریویو کیا جائے اور اس کے مخصوص محاسن اور خوبیاں اس طرح نمایاں کی جائیں کہ وہ اصل تصنیفات کے مطالعہ کی ترغیب وتشویق کا باعث ہوسکیں۔ چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رئیس میرٹھ نے مطبوعہ مقدمہ تحریر کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ متعدد انگریزی، فارسی اور اُردو تذکرے جناب موصوف کی خدمت میں پہونچا دیئے گئے ہیں تا کہ آپ اُن میں سے حسب ضرورت مواد اخذ کرلیں — اُس کے بعد جو جو نسخہ طبع ہوگا اُس کے شروع میں اُس پر تبصرہ ہوگا جس میں اُس خاص نسخہ کے مضامین کا خلاصہ اور اُن مضامین پر تنقید ہوگی۔

جن نو (۹) حضرات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اُن میں سے ہر صاحب حصہ رسدی ایک ایک نسخہ پر تبصرہ لکھیں گے چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب قران السعدین پر ایک مبسوط ریویو تحریر فرما چکے ہیں۔ مولانا رشید احمد صاحب بحیثیت چیف ایڈیٹر کے ان تمام تبصروں کو ملاحظہ کریں گے تا کہ تنقید کا پیمانہ یکساں قایم رہے۔ یہ امر زیر بحث آیا تھا کہ کلیات لیتھو میں چھاپی جاوے یا ٹائپ میں — اہل یورپ تو یقیناً ٹائپ کے قدرداں ہیں اور اہتمام طبع وصحت میں بھی سہولت ٹائپ ہی کے چھاپہ میں ہے — مگر اس وقت باہمی مشورہ سے یہی طے ہوا ہے کہ کلیات کا پہلا ایڈیشن ۲۰×۲۶ کی تقطیع کے دبیز چکنے کاغذ پر نہایت آب وتاب کے ساتھ لیتھو میں طبع کیا جاوے۔ جس کے لئے خود مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے مطبع (انسٹی ٹیوٹ پریس) میں خاص انتظام یا گیا ہے — اس سے بڑا نفع یہ پیش نظر ہے کہ کاپیاں اور پروف وقت پر دیکھنے میں سہولت ہو اور کام تیزی سے چلتا رہے۔

یہ معاملہ بھی تصفیہ طلب تھا کہ کونسا کلام اس وقت طبع ہو اور کونسا سر دست ملتوی رکھا جا سکتا ہے بعض ہمدرد حضرات نے مشورہ دیا تھا کہ جو تصنیفات مطبوعہ ہیں، اور ہر جگہ ملتی ہیں اُن کے اعادہ طبع سے کچھ فائدہ نہیں — مثلاً اعجاز خسروی۔ اس کا موضوع صرف صناعات وتکلفات لفظی کا بیان ہے، اُس کے اعادہ طبع سے کیا فائدہ — بعض مثنویات وقصائد بھی طبع شدہ ہیں۔ لہٰذا غیر مطبوعہ یا صرف تاریخی تصنیفات کے طبع ونشر یا قناعت کی جائے تو مفید تر ہوگا — لیکن نواب عماد الملک بہادر کی یہ رائے ہوئی (جس سے مجھے بھی کلی اتفاق ہے) کہ جس قدر کلام طبع ہوا ہے اس کی صحت کا کافی اہتمام نہیں کیا گیا — لہٰذا مطبوعہ نسخے عموماً غلط

چھپے ہیں۔ اس نے کُل کلام صحیح ہو کر طبع ہونا چاہئے — چنانچہ یہی فیصلہ آخری ہے۔

نسخہ نصاب بدیع العجائب ونصاب مثلث تمام مراحل مقابلہ وتصحیح طے کر کے معہ تبصرہ کے مطبع میں پہنچ چکا ہے اور کاپیاں تیار ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نسخہ عنقریب طبع ہو کر ہدیہ شائقین ہوگا — اسی طرح مثنوی خسرو شیریں بعد طے مراحل طبع میں پہنچ چکی ہے اور کاپیاں لکھی جارہی ہیں — خمسہ کی باقی چار مثنویاں زیر تصحیح ہیں اور عنقریب مطبع میں پہنچا چاہتی ہیں۔ اس کے بعد دواوین کا سلسلہ انشاء اللہ تعالیٰ شروع ہوگا۔

اب میں ذیل میں مختصر طور پر اُن تصانیف کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت تک بہم پہونچ چکی ہیں اور جن کی تصحیح اور اشاعت کا انتظام درپیش ہے۔

ا۔ خمسہ خسروی:۔ یہ خمسہ پانچ مثنویوں پر مشتمل ہے (۱) مطلع الانوار (۲) شیریں خسرو (۳) مجنوں لیلیٰ (۴) آئینۂ سکندری (۵) ہشت بہشت۔

یہ خمسہ جو ''پنج گنج'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ حضرت امیر خسرو نے خمسہ نظامیؒ کے جواب میں لکھا ہے۔ مولانا نظامیؒ کی مثنوی مخزن الاسرار کے جواب میں مطلع الانوار لکھی گئی۔

خسرو شیریں کے جواب میں شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں کے جواب میں مجنوں لیلیٰ۔ سکندر نامہ کے جواب میں آئینہ سکندری۔ اور ہفت پیکر کے مقابل ہشت بہشت تصنیف ہوئی جس میں بہرام گور کا قصہ مذکور ہے۔

یہ خمسہ حضرت امیر نے تین سال میں تمام کیا تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

کہ ازاں نقد قیمتی بہ سہ سال
کردم ایں پنج گنج مالا مال

مصنف علیہ الرحمۃ نے خمسہ کی ترتیب کو خود ہی اس طرح بیان فرمادیا ہے۔

دادی اول بہ گنبد دوار — روشنائی زمطلع الانوار
کردی انگاہ بانشاط تمام — شہد شیریں وخسرو اندر جام
بازدر عالم خردمندی — شور مجنوں و لیلیٰ افگندی

پس زباں بر وردری کردی   شرح راز سکندری کردی
دیں زماں کز جواہر انجم   مے نگاری صحیفۂ پنجم
گویم افسانہائے طبع فزائے   از لب لعبت فسانہ سرائے
ہر یکے را بہشت نام کنم   حور وکوثر دراں تمام کنم
ہفت باشد بہشت وکوتر ہفت   ہشتم آں کاندرو بود ہر ہفت
پس نویسم بکلک مشک سرشت   نام ایں ہشت خانہ ہشت بہشت

خمسہ نظامی وخمسہ خسروی کے اشعار کی تعداد کا مقابلہ کرتے ہوئے دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ نظامی کے خمسہ میں ۲۸ ہزار اشعار ہیں مگر خمسہ خسروی میں ۱۸ ہزار ہیں حضرت امیر خسرو نے خمسہ کی ہر ہر مثنوی کے اشعار کی تعداد خود ظاہر فرمادی ہے۔

چنانچہ مطلع الانوار کی نسبت آپ نے لکھا ہے۔

درہمہ بیت آوری اندر شمار   سیصد ودہ برشمرد ۳۳۱۰ سہ ہزار
از اثر اخترِ گردوں خرام   شد بد وہفت ایں مہ کامل تمام
سال کہ از چرخ کہن گشت بود   از پس ششصد نود وہشت بود

سنہ ۶۹۸

شیریں خسرو کی بابت آپ فرماتے ہیں۔

زآغاز رجب فرخ شد ایں فال   زہجرت ششصد وپنج ونود سال

۶۹۵ ہجری

اگر پرسی کہ بیتش را عدد چیست   چہار الف وچہار ست وصد وبیست

۴۱۲۴

اشعار مذکورۂ بالا سے شیریں خسرو کی تصنیف ۶۹۵ ہجری میں ہونا پایا جاتا ہے۔ مگر چونکہ حضرت امیر نے ذیل کے اشعار میں یہ ظاہر کیا ہے کہ مثنوی شیریں خسرو مطلع الانوار کے بعد لکھی گئی اور مطلع الانوار ۶۹۸ ہجری میں تصنیف ہوئی اس لئے بعض تذکرہ نویسوں کی یہ رائے ہے کہ شیریں خسرو بھی ۶۹۸ ہجری کی تصنیف ہے۔

تخت از پردہ ایں صبح نشورم — نموداز مطلع الانوار نورم
پس از کلکم چکیدایں شربت نو — کہ نامش کردہ ام شیریں وخسرو

مجنوں لیلیٰ کی بابت لکھا ہے۔

بیتش بہ شمار راستی ہست — جملہ دوہزار وششصد ۲۶۶۰ وشصت
تاریخ زہجرت آنچہ بگذشت — مالش نوداست وششصد وہشت

۶۹۸ء

آئینہ سکندری کی بابت تحریر فرمایا ہے۔

گو آدمی ہمہ بیتش اندر عدد — چہارالف پنجہ شُد ۴۴۵۰ وچارصد
دریں دم کہ پایاں ایں پیکراست — زتاریخ ہفصد یکے کمتراست

۶۹۹ ہجری

ہشت بہشت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

ہمہ بیتش بگاہ عرض وشمار — سہ صد وپنجہ ودو ۳۳۵۲ وسہ ہزار
سال ہجرت یکے وہفصد بود — کیں بنا بود سر بچرخ کبود

۷۰۱ ہجری

اس طرح تمام خمسہ کے اشعار کی تعداد جمع کرنے سے کل ۱۷۸۹۶ اشعار ہوجاتے ہیں۔

خمسہ خسروی کی پانچویں مثنوی کانام ''ہشت بہشت'' ہے۔ادریس بن حسام الدین نے سلاطین عثمانیہ (ترکی) کی ایک تاریخ سلطان مرادثانی کے عہد تک لکھی ہے۔اُس کانام بھی ''ہشت بہشت'' ہے۔مگروہ حضرت امیرخسروی کی مثنوی سے بالکل جدا کتاب ہے۔

بعض سخنوروں نے خمسہ خسروی کوخمسہ نظامی پرترجیح دی ہے۔خودحضرت امیرخسرو کوبھی اپنی اس تصنیف پرناز تھا۔چنانچہ خمسہ کی تکمیل پرآپ نے فخریہ فرمایا۔

دبدبۂ خسرویم شد بلند — زلزلہ در گور نظامی فگند

حضرت امیر نے خودتحریرفرمایا ہے کہ خمسہ خسروی بغرض اصلاح ونظرثانی قاضی شہاب الدین صاحب کے ملاحظہ سے بھی گذرچکا ہے جواپنے عہد کے نہایت

با کمال فاضل تھے۔

۲۔مثنوی قران السعدین:- یہ مثنوی حضرت امیر خسرو کی ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں شاہ دہلی سلطان معزالدین کیقباد کی اپنے پدر ناصرالدین بغراں خاں والی بنگال کی ملاقات کا تذکرہ ہے جو اودھ میں دریائے گھاگرہ کے ساحل پر ۶۸۸ ہجری (مطابق ۱۲۸۹ عیسوی) میں ہوئی تھی۔ چونکہ اس مثنوی میں شہر دہلی اور اس کی بعض عمارات کی تعریف بھی لکھی ہے، اس لئے اس مثنوی کا نام "مثنوی در تعریف دہلی" بھی ہے۔ اشعار ذیل اس مثنوی کے زیب عنوان ہیں۔

شکر گویم کہ بتوفیق خداوند جہاں
بر سر نامہ زتو چند نوشتم عنواں
نام ایں نامۂ والاست قران السعدین
کز باندیش بسعدین سپہر است قران

حضرت امیر نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی میں نے اپنی عمر کے چھتیسویں سال میں لکھی تھی اور اُس کے لکھنے میں تین ماہ صرف ہوئے تھے۔ ماہ رمضان ۶۸۸ ہجری مطابق ۱۲۸۹ء میں یہ مثنوی ختم ہوئی اس میں ۳۹۴۴ اشعار ہیں۔

در زعمل باز کشائی شمار   نہ صدو چار وچہل وسہ ہزار

ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ اس مثنوی کی تین شرحیں لکھی جا چکی ہیں پہلی شرح ۱۰۱۴ھ میں مولانا نورالحق صاحب نے لکھی۔ دوسری شرح عبدالرسول قاسم صاحب سے منسوب ہے۔ تیسری شرح کے مولف کے نام کا پتہ نہیں چلا۔

۳۔مثنوی عشیقہ یا عشقیہ:- اس کا نام مثنوی حضرت خانی ودول رانی بھی ہے۔ اس مثنوی میں سلطان علاؤالدین محمد شاہ خلجی کے بیٹے شاہزادہ خضر خاں اور راجہ کرن والئ گجرات کی دختر دیول رانی کی محبت کا تاریخی قصہ مذکور ہے۔ یہ مثنوی چار ماہ میں لکھی گئی اور ماہ ذیقعدہ ۷۱۵ھ مطابق ۱۳۱۵ء میں ختم ہوئی۔ اس مثنوی میں اوّل ۴۲۰۰ اشعار تھے۔

چو بر بالاکش ایں پردہ راکس
چہار الف است ودویست ایں قدر بس

مگر حضرت امیر نے لکھا ہے کہ شاہزادہ خضر خاں کی رحلت کے بعد ۱۳۱۹ اشعار کا اس میں میں نے اور اضافہ کر دیا اور اس طرح اس مثنوی کے کل اشعار کی تعداد ۴۵۱۹ ہو گئی ـــ یہ مثنوی سلطان علاءُ الدین خلجی کے نام سے معنون ہے ـــ حضرت امیر خسرو نے اس مثنوی کی وجہ تالیف یہ بیان کی ہے کہ آپ ایک روز شاہزادہ خضر خاں کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اثنائے ملاقات میں شاہزادہ نے فرمایش کی کہ میں نے دیول رانی کے ساتھ اپنی محبت کے واقعات خود قلمبند کئے ہیں، آپ ان کو نظم کر دیجئے چنانچہ جس وقت شاہزادہ نے اپنا مسودہ حضرت امیر کے سپرد کیا تو آپ فرماتے ہیں کہ اس کو پڑھ کر میں اشکبار ہو گیا۔ اور میں نے اسے نظم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس مسودہ میں ہندوی الفاظ کثرت سے استعمال ہو رہے تھے۔ لہٰذا اُسے دیکھ کر حضرت امیر خسرو کو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ ریشم میں گزی کا پیوند کیونکر لگے گا۔ لیکن پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ کافی غور کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ''ہندی زبان کسی طرح فارسی زبان سے کم درجہ کی نہیں ہے۔ ہندی زبان کا عربی سے تو مقابلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ عربی توام السنہ ہے مگر فارسی سے ہندی کسی طرح کم نہیں ہے۔ عربی خالص زبان ہے جس میں غیر زبان مخلوط نہیں ہو سکتی۔ مگر فارسی کا لطف بغیر عربی کی چاشنی کے نہیں آتا۔ بہ لحاظ قواعد صرف ونحو بہ لحاظ فصاحت وبلاغت ہندی زبان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جو شخص عربی وفارسی اور ہندی تینوں زبانوں سے واقف ہو وہ اس قول کی صداقت کو تسلیم کر سکتا ہے۔'' اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں کہ ''اگر میں عقل وانصاف سے ہندی زبان کے اوصاف بیان کروں تو ناظرین معترض ہوں گے۔ اور اگر میں اپنے قول کی تائید میں قسم کھاؤں تو نہیں معلوم کہ اس کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میرا علم ہندی زبان کا بمقابلہ سمندر کے قطرہ کا حکم رکھتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جس شخص نے ہندوستان اور دریائے گنگ کو نہ دیکھا ہو وہ ہندوستان کی طوطی کی قدر کیا پہنچان سکتا ہے۔ جو خراسانی ہر ہندوستانی کو احمق سمجھتا تھا وہ غالباً اس ملک کے پان کو گھاس سمجھتا ہو گا۔ میرے اس قول کو وہی منصف طبع لوگ باور کریں گے جنہوں نے مختلف ممالک میں سیاحت کی ہے اور غور وخوض کے ساتھ اُن ممالک کے حالات کا مشاہدہ کیا ہے ـــ لیکن جو شخص عصبیت سے کام لے گا وہ البتہ غیر ملکی انجیروں کو ہندوستان کے آموں پر ترجیح دے گا ـــ مگر ہندوستان نہ

صرف ایک وسیع ترین ملک ہے بلکہ جنت نشان ہے، کیونکہ اگر اس ملک کو جنت سے کوئی بھی مناسبت نہ ہوتی تو حضرت آدم اور طاؤس اس ملک کی زینت کا باعث نہ ہوتے۔"

۴۔ مثنوی مفتاح الفتوح یا فتح الفتوح یا فتح نامہ:- اس میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی ابتدائی فتوحات کا تاریخی بیان ہے جو ۶۸۹ھ مطابق ۱۲۸۹ء میں تخت نشیں ہوا تھا — یہ مثنوی دیوان غرۃ الکمال کا جزو ہے — اور پرانے نسخوں میں اسی دیوان میں شامل پائی جاتی ہے — اس مثنوی کے عنوان میں یہ شعر درج ہے۔

سخن برنام شاہے کردم آغاز   کہ بر شاہاں در دولت کند باز

۵۔ مثنوی فرس الفرس بھی دیوان غرۃ الکمال کا جزو ہے۔ جس کا ابتدائی مصرعہ ہے: "فرس الفرس خطاب شد ایں اسپ نامہ را۔"

۶۔ اسی طرح غرۃ الکمال کی مثنویات میں سے ایک مثنوی کا نام قصہ باز نامہ ہے جو اس مصرعہ سے شروع ہوتی ہے "ایں قصہ باز نامۂ من داں کہ بہر ایں۔"

۷۔ اسی دیوان غرۃ الکمال کی ایک مثنوی شاہنامہ فردوسی کے وزن پر ہے۔

ولایت ستانہ و خصم افگنا   بہ لشکر کشی ہیچومہ روشنا

اس دیوان کی رباعیات کا عنوان ہے: المتفرقات فی المدیح والاوصاف یعنی صفت گرز صفت تیغ وصفت بخشش وغیرہ۔

۸۔ مثنوی نہ سپہر:- یہ ایک مستقل علیحدہ مثنوی ہے اور حضرت امیر خسرو کی عمر کے آخری حصہ کی تصنیف ہے۔ اس کے عنوان میں یہ شعر درج ہے۔

اول نکو نگارش توحید کردگار   کیں نہ سپہر گشت بفرمائش آشکار

یہ مثنوی ۷۱۸ھ میں لکھی گئی جبکہ آپ کی عمر ۶۵ سال کی تھی — چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ

در کشادہ کنم ایں نقش ونگار   سال برہفصد وہژدہ شمار

اس مثنوی میں ۴۵۰۹ اشعار ہیں اور اس میں قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے (جس کی وفات ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء میں ہوئی) دربار اور اس کے عہد کے بعض واقعات کا ذکر ہے — تیسری سپہر میں حضرت امیر خسرو نے اپنے ہندی نژاد ہونے کا ذکر کر کے

ہندوستان کے مختلف حصّوں کی زبانوں کا دلچسپ تذکرہ کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ہر ملک میں اُس ملک کے فاتحوں کی زبان علیحدہ علیحدہ ہے جس میں سے ایک کو دوسرے سے کوئی مناسبت نہیں۔ مثلاً سندھی، لاہوری، کشمیری، تلنگی، گجراتی، مالاباری، گوڑ، بنگالی، اودھی، دہلوی — اس فہرست سے سراغ لگتا ہے کہ اس زمانہ میں اُردو زبان کی داغ بیل پڑ چکی تھی جو اپنی اُس ابتدائی حیثیت میں دہلوی زبان کہی جاتی تھی — اسی سلسلہ میں حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ علاوہ مروجہ زبانوں کے ہندوستان میں ایک خاص زبان ہے جس کو برہمن کام میں لاتے ہیں — اس زبان کا نام سنسکرت ہے۔ جس سے عوام بالکل ناواقف ہیں اور اگرچہ ایک برہمن مرد یہ زبان جانتا ہے مگر برہمن عورت اس زبان کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتی — بعض لحاظ سے سنسکرت عربی سے مماثلت رکھتی ہے — مثلاً فصاحت قواعد صرف ونحو، گردان افعال، حروف کی مختلف ترکیبوں سے بے شمار الفاظ کی ساخت، لکھا ہے کہ چاروں دید اسی زبان میں ہے جن کو برہمن پڑھتے ہیں اور جن میں دیوتاؤں کی تعریف ہے — پھر فرماتے ہیں کہ سنسکرت زبان میں انشاء پردازی اور فصاحت وبلاغت کے معین قواعد موجود ہیں اور سوائے عربی زبان کے اس زبان کا پہلو اور کسی زبان سے نہیں دبتا — بلکہ دری زبان پر اس کو تفوق حاصل ہے — گو دری زبان نہایت شیریں اور سُریلی ہے مگر اس لحاظ سے بھی سنسکرت اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ سنسکرت زبان کی خصوصیت حضرت امیر نے اس تفصیل سے بیان فرمائی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اس زبان کی صرف ونحو اور دیگر فنون میں کافی دستگاہ بہم پہونچائی تھی ورنہ بغیر واقفیت تامہ جناب موصوف دوسری زبانوں سے اس بے تکلفی کے ساتھ اس کا مقابلہ نہ فرماسکتے۔ نُہ سپہر میں مصنف نے فخریہ لہجہ میں اپنی ہمہ گیر قادرالکلامی کا اظہار کیا ہے کہ اگرچہ کل عجم وایران میں دو شاعر شیخ سعدی شیرازی اور حکیم ہمام تبریزی بہت نامور گذرے ہیں، لیکن میرا پایۂ سخن اُن دونوں سے بلند ہے کیونکہ ان کے اشعار میں خواہ کچھ ہی اوصاف ہوں مگر وہ میری طرح کثیر الکمالات نہ تھے۔

۹۔ دواوین:- حضرت امیر خسرو کے پانچ دیوانوں میں سے سب سے پہلا دیوان تحفۃ الصغر ہے، جس میں آپ کا ۱۶ویں سال سے لے کر ۱۹ویں سال تک کا کلام

ہے — یہ دیوان سلطان بلبن کے عہد میں لکھا گیا تھا — اس دیوان میں قصائد، قطعات، غزلیات، مثنویات اور رباعیات شامل ہیں جن میں زیادہ تر سلطان بلبن، ولی عہد سلطنت شاہزادہ خاں شہید اور ہمعصر امرا و وزراء کی طرف خطاب ہے — ترجیع بندوں میں مصنف نے زیادہ تر اپنے ہادی طریقت حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہٗ العزیز کی تعریف کی ہے — اس دیوان کے ساتھ حضرت امیر خسرو نے ایک مبسوط دیباچہ شامل فرمایا ہے جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کے بھائی تاج الدین زاہد نے نہایت مشقت کے ساتھ آپ کے سولہویں سال سے لے کر انیسویں سال تک کا کلام جمع کیا اور خود ہی اس کلام کو مرتب کیا — اور ہر ہر نظم کے عنوان پر ایک ایک شعر سرخ روشنائی سے لکھا ہے جو اس وجہ سے "بیت سرخ" کے نام سے مشہور ہیں — ان ابیات سرخ میں صنعت یہ رکھی گئی ہے کہ ہر عنوان کا شعر اپنی اپنی جگہ اس نظم کے خلاصہ مضمون پر حاوی ہے جس کا کہ وہ عنوان ہے۔ اور عنوان کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اگر ان تمام ابیات سرخ کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو وہ سب ابیات ملکر بجائے خود ایک مستقل جدا نظم بن جاتی ہے جس کا مضمون مسلسل ہوتا ہے — عنوان کے اشعار کا یہ التزام سوائے دیوان نہایت الکمال کے حضرت امیر خسرو کے باقی چاروں دیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے — چاروں دیوانوں میں عنوان کے ابیات کو باعتبار بحر اور باعتبار ردیف وقافیہ کے مختلف رکھا ہے تاکہ ایک دیوان کے ابیات دوسرے دیوانوں کے ابیات میں مخلوط نہ ہوسکیں — اس دیوان کے قصائد کا مندرجہ ذیل رباعی سے آغاز ہوتا ہے:-

لوحے کہ بر صحیفۂ گردوں مصور است
توقیع آں بنام خداوند اکبر است
شد تحفۃ الصغر جو خطاب ایں سواد را
از ذکر ذوالجلال سوادے منور است

۱۰۔ آپ کا دوسرا دیوان وسط الحیوۃ ہے جس میں چوبیسویں سال سے ۳۲ ویں سال تک کا کلام شامل ہے۔ یہ دیوان قصائد، ترکیب بند، غزلیات اور قطعات کا مجموعہ ہے جن میں زیادہ تر حضرت امیر نے اپنے پیر حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

کے مناقب لکھے ہیں — نیز شہزادہ خان شہید (جو اُس وقت پنجاب وملتان کا گورنر تھا) اور سلطان معزالدین کیقباد اور دیگر امراء دربار کی ثناء وصفت بیان کی ہے — اس دیوان کے دیباچہ میں حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں "در دیباچہ تحفۃ الصغر ذکر کردہ شدہ است کہ برسر ہر شعرے در صفت آن یک بیت نبت اُفتاد است۔ ازاں جملہ ابیات شعرے تمام می خیزد۔ وایں خاص وضع منست کہ درآں کتاب مکتوب است — وبعد ازیں درجہ ابیات سلسلہ ہم ازاں باب خواہد بود — مقصود ایں ست کہ چنا در تحفۃ الصغر وضع صفت نو رفتہ است دریں دیوان نیز طریقۂ غریب وخوش آیند آمدہ است کہ پیش ازیں ہیچ مبصرے را در نظر نیامدہ — مگر افضل الدین خاقانی کہ در ترجیحات نگاہ داشت یک قافیہ در ہر خانہ وضع است اما اُستاد خاقانی نامہ شعراء در شارع ابیات راہ ندادہ است وہم در سر شعر آں نام را عنوان گردانید — ولیکن بندہ ایں قدر تصرف زیادہ دار کہ نامہ شعر را در آخر ہماں شعر در بیتے درج کردہ است تا آں شعر را بداں نام خوانند۔

۱۱۔ تیسرا دیوان غرۃ الکمال ہے جس میں ۳۴ ویں سال سے لے کر ۴۳ ویں سال تک کا کلام جمع ہے اس کے شروع میں مصنف نے ایک طویل دیباچہ میں اپنی سوانح عمری پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے اور بعض اُن صنائع وبدائع کا ذکر کیا ہے جو خاص آپ کی ایجادات ہیں — یہ کلام آپ نے اپنے بھائی علاؤ الدین علی شاہ کی فرمایش پر جمع کیا۔ اس دیوان میں بھی قصائد وقطعات، ترجیع بند، مثنویات، غزلیات ورباعیات شامل ہیں۔ قصاید میں حسبِ معمول حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کی منقبت، سلطان وقت اور امراء دربار کی مدح وثنا ہے۔ قصاید کے دیکھنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس قدر قصاید حمد ونعت منقبت یا مواعظ وحکم میں لکھے گئے ہیں۔ وہ نہایت پُرزور اور شاندار ہیں اور جو قصاید شاہوں یا اہل دربار کی تعریف میں ہیں اُن میں کچھ زیادہ زور طبیعت صرف نہیں کیا گیا۔ اکثر شاندار قصیدے قدماء اساتذہ کے جواب میں لکھے گئے ہیں اور ایسے قصاید میں حضرت امیر نے پورا زور طباعی صرف کیا ہے۔ مثلاً حکیم افضل الدین خاقانی شروانی کے مشہور قصیدہ کے جواب میں آپ نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے خاتمہ میں خاقانی کی استادی کو تسلیم کر کے اپنی تعلّی کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:-

مرا سبق کمال است آنکہ گفت اُستاد خاقانی — دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش
نہ من گفتار دانا را جوابے ساختم لیکن — جوے آوردم و آبے کہ ریزم پیش یکرانش
گر او بود است حسان عجم من جادوے ہندم — کہ دریکدم رسانم باز باپیشینہ حسانش
سخن زانگونہ گفت استم بلند امروز در دہلی — کہ از خواب گراں بیدار گرد ستم بہ شروانش
بشرق و غرب بشنید ند گفتار بلند من — علا جے سمع را۔ گر نشوند اصحاب وافزانش
چنیں شعری کی سبعیات از و سبعی است ے شاید — کہ خواند نائب سبع المثانی روح سحبانش
زبیم درد پنہاں کردہ ام گنجے بہر بیتے — خداوندا نگہ داری زنقب دست ایبانش
گرا ے حاسد ترا مرگ ست زیں آب حیات من — خضر داند کہ باعمر ابد بست است پیمانش
گرفتم شعر خود سحر است۔ چہ بود سحر؟ گمراہی — بہ یزداں کہ رسد آں کو بگمراہی ست او مانش

چہ بر چینیم ازیں خاکے کہ می بیزم یا کسونش
چہ بر بندم ازیں بادے کہ می سنجم باوزانش

اس دیوان کے دیباچہ میں آپ نے اپنی ایجاد کردہ جن صنایع بدایع کا ذکر کیا ہے اُن میں سے بعض کا تذکرہ اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک صنعت آپ نے ایجاد کر کے اُس کا نام ''حامل و موقوف'' رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مصرعہ اپنے مابعد مصرعہ کا محتاج رہتا ہے مثلاً

در حسن سے ترا نماندالا — خورشید کہ صبح بروں آید تا
خدمت کندوپاے توبوسداما — بنی توبسوے اوچوپا بوسد پا

ایک اور صنعت اشتقاق معنوی کی ہے۔ اس میں ایک ہی صورت کے الفاظ کو مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً:

اے کہ چوں خنگ تو جولاں در گرفت — گرد گردا گرد گردوں گرد گرد
بسکہ خلق از تو بسر مابرو برد — برد برد برد بردا برد برد
چوں دو در دو در د خصمت خورد گفت — درد و درد و درد دردا درد درد

ایک اور صنعت ''بے کام و زبان'' ہے جس میں صرف لبوں سے پڑھا جاتا ہے زبان و تالوسے کام ہی نہیں لیا جاتا۔ مثلاً:-

موئے سرما بوئے مابویابہ — بے اوموئیم موئے ویم ماوابہ
مائیم وہبے وآں مہ ماباما — مابہ مہ ماو ماہ ماباسابہ

ایک اور صنعت ہے جس کا نام "ایہام ذوالوجو" ہے یعنی ایک ایک لفظ متعدد معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ مثلاً:-

باز سر باز تو با سیمرغ سر بازی کند — گرتوائے شیر گراں سر بازداری در شکار

حضرت امیر نے ناظرین کو خود توجہ دلائی ہے کہ اس شعر میں مصرعہ آخر کے چار معنی ہو سکتے ہیں (۱) یعنی باز را در شکار داری (۲) یعنی اگر چہ اور اباز وداری از شکار۔ (۳) یعنی کشادہ داری باز را (۴) یعنی اگر سر باز در شکار داری اور مصرعہ ثانی میں سر باز ملا کر پڑھنے سے دو اور معنی پیدا ہو جاتے ہیں یعنی سر بازندہ (دلاور) داری باز را اور باز را سر کشادہ داری (جو باز تربیت یافتہ ہوتا ہے وہ سر کشادہ ہوتا ہے اور نئے باز کا سر کلاہ سے ڈھکا رہتا ہے)

ایک اور صنعت "ایہام" ہے جس میں ایک ہی شعر ایک ہی صورت میں فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً:-

آئی آئی ہماں بیاری آئی
ماری ماری براہ موری نائی

۱۲۔ چوتھا دیوان بقیہ نقیہ ہے جس میں پچاس ویں سال سے لے کر ۶۰ ویں سال تک کا کلام ہے— ذیل کا شعر اس دیوان کے دیباچہ کا عنوان ہے:-

بقیہ ایست نقیہ زفیض طبع من ایں
کہ چوں طبائع افلاک محکم است ومتیں

اس دیوان میں غزلیات حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب ہیں اور اُن کے عنوان میں یہ شعر درج ہے:-

اے زخیال مابروں در تو خیال کے رسد
باصفت تو عقل رالاف کمال کے رسد

۱۳۔ پانچواں دیوان نہایت الکمال ہے جس میں مصنف کی آخری عمر کا کلام ہے۔ اس دیوان کے ساتھ ہی ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں حمد ونعت اور حضرت محبوب الٰہی

کی منقبت درج ہے — اس دیوان میں بھی مثل دیگر دیوانوں کے مثنویات، قصائد، غزلیات، قطعات، ترجیع بند اور رباعیات شامل ہیں۔

۱۴۔ ایک نسخہ قلمی موسوم بہ دیوان امیر خسرو:- میرے اپنے کتب خانہ میں موجود تھا جس میں بہت سی ایسی غزلیں پائی جاتی ہیں جو مذکورہ بالا پانچوں دیوانوں کی غزلوں سے جدا ہیں۔ اُن کو متفرق مجموعہ غزلیات کے سلسلہ میں شامل کر دیا جائے گا۔

۱۵۔ منجملہ حضرت امیر خسرو کے قصائد کا ایک بہت بڑا قصیدہ ہے جو آپ کی تصانیف کی فہرست میں ایک جداگانہ تصنیف کی حیثیت سے درج ہے اس کا نام ''قصیدہ امیر خسرو متضمن شاہ نامہ فردوسی'' ہے جس میں آپ نے شاہ نامہ فردوسی کے حالات درج فرمائے ہیں — اس قصیدہ کا عنوان ہے:-

''بنام ایزد بخشایندہ بخشایش گر مہربان داد گر'' اور مندرجہ ذیل سے شروع ہوتا ہے:-

امد نگار من بسراز ناز افترا
با قامتے چواز چمن خلد عرعراء

۱۶۔ نصاب بدیع العجائب ونصاب مثلثہ:- یہ حقیقت میں دو رسالے ہیں ایک کا نام نصاب بدیع العجائب ہے جو حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے اور دوسری کا نام مثلث بدیعی ہے جو مولانا محمد بدیع بدیعی کی تصنیف ہے۔ مگر چونکہ قدیم نسخوں میں یہ دونوں رسالے التزاماً ساتھ پائے جاتے ہیں اس وجہ سے غالباً یہ دونوں نظمیں حضرت امیر خسرو سے منسوب ہو گئیں۔ نصاب بدیع العجائب میں تمام قطعات مختلف بحور میں اور مختلف صنعتوں میں لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ پہلا قطعہ صنعت تجنیس میں ہے۔ مثلاً:

مصر شہر و شہر ماہ و ماہ آب و خوف سہم
سہم تیر و انجحہ چہ بال باشد بال جاں

نصاب مثلث میں سہ حرفی الفاظ ایک ایک مصرعہ میں تینوں حرکتوں کے ساتھ جمع کر کے ان کے معنی بتلائے ہیں۔ مثلاً رب بمعنی خدا — ربّ بمعنی جماعت کثیر و رُب بمعنی عصارہ ایک شعر میں اس طرح جمع کئے گئے ہیں۔

رَب داں پروردگار رب بود جمعے زخلق
رُب آب خالص از انگور و سیب و ناردان

۱۷۔ شہر آشوب:۔ اس میں رُباعیات ہیں جن میں اہل حرفہ کی اصطلاحات جمع کی گئی ہیں۔ مثلاً

نجار پسر کہ تیشہ رانی میکرد
ارے برماتم نہانی میکرد

(تیشہ — ارہ — برما — نہانی)

۱۸۔ کلام نثر میں خزائن الفتوح جس کا نام سرور الروح، تاریخ علائی اور فتح نامہ بھی ہے زیر تصیح ہے اس میں سلطان علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی ۶۹۵ ہجری ۱۲۹۶ء اور اس کے عہد کی فتوحات کا ذکر ہے۔

۱۹۔ افضل الفوائد:۔ میں حضرت محبوب سبحانی سلطان نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ہیں — علم تصوف میں یہ بہت باوقعت کتاب سمجھی جاتی ہے۔

۲۰۔ اعجاز خسروی:۔ یا رسائل اعجاز یہ ایک نہایت ضخیم کتاب ہے اور حضرت امیر خسرو کی مرصع و مسجع فارسی انشا پردازی اور گوناگوں صنائع و بدائع کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ کتاب مطبع نول کشور میں طبع بھی ہو چکی ہے اس کی صحت کی طرف کتب مذکورہ بالا سے فارغ ہونے کے بعد توجہ کی جائے گی۔

۲۱۔ خالق باری اور قصہ چہار درویش جو حضرت امیر خسرو سے منسوب ہیں، معروف کتابیں ہیں۔ اگر ان کے معتبر اور صحیح نسخے دستیاب ہو گئے تو ان کو بھی شامل کلیات کیا جائے گا۔

علاوہ مندرجہ بالا تصانیف کے ذیل کی کتابیں اب تک دستیاب نہیں ہوئی ہیں۔
(۱) تغلق نامہ (۲) مناقب ہند (۳) شگرف بیان (۴) ترانہ ہندی (۵) انشاء امیر خسرو (۶) تاج الفتوح (۷) احوال امیر خسرو (۸) تاریخ دہلی (۹) مکتوب امیر خسرو (۱۰) جواہر البحر (۱۱) مقالہ (حالات خلفائے اربعہ) (۱۲) راحت المحبین (۱۳) رسالہ ابیات بحث (خسرو

جامی)(۱۴)مناجات خسرو۔

افسوس ہے کہ باوجود کوشش بلیغ کے کسی ہندوستان کے کتب خانہ میں تغلق نامہ کا پتہ نہیں چلا— نہ سوائے ایک دو تذکروں کے اور فارسی تذکروں میں اس کا بالتفصیل ذکر پایا گیا— البتہ سر گور آوسلے (Sir Gore Ousley) نے اپنے میموائرز (Memoirs) میں جن میں تیس مشہور شعراء فارسی کے دلچسپ حالات درج ہیں۔ اس تصنیف کا مختصر حال لکھا ہے۔ یہ میموائرز شاید ۱۸۳۰ء کے اختتام کے قریب لکھے گئے تھے، مگر اس کا مکمل طور پر طبع ہونا ۱۸۴۶ء سے پیشتر نہیں پایا جاتا— یہ کتاب اب کمیاب ہے اور میں نے اوّل مرتبہ اس کا مطالعہ اپنے طالب علمی کے زمانہ میں اُس وقت کیا تھا جب میرے اُستاد مولانا الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم ومغفور حیات سعدی لکھ رہے تھے۔ اور میں نے بعض دلچسپ واقعات سعدی علیہ الرحمۃ کی زندگی کے اس سے اخذ کر کے مولانا مرحوم کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ اب مجھے حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کا کلام جمع کرنے کے سلسلہ میں اُس کے دوبارہ مطالعہ کی نوبت آئی اور میں مسٹر جونس صاحب پرنسپل آگرہ کالج کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر مجھے اُس کے دیکھنے کا موقع عنایت کیا— اس کتاب میں سر گور آوسلے بحوالہ تذکرہ ہفت اقلیم مصنفہ امین احمد باشندہ...... تحریر کرتے ہیں کہ یہ نظم دراصل تغلق شاہ کے عہد کی تاریخ ہے اور اس میں ۳ ہزار اشعار ہیں— میں اس کے مزید حالات دریافت کرنے اور سراغ لگانے کی غرض سے خود سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں (جہاں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے) حاضر ہوا— مگر اس سے زیادہ پتہ نہ لگ سکا کہ اس کا ایک نسخہ امام صاحب مسجد درگاہ کے خاندان میں تھا جو انہوں نے نواب ضیاء الدین خاں صاحب مرحوم رئیس اعظم لوہارو کی نذر کیا تھا اور ان کے کتب خانہ سے میر مجروح مرحوم نے (جو دہلی کے آخری زمانہ کے نام آور شعراء میں شمار کیے جاتے تھے) مستعار لیا تھا— اس کے بعد سے اس نسخہ کا پتہ نہیں چلتا— انڈیا آفس اور برٹش میوزم کی فہرستوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے— اگر ہمارے علوم کا خزانہ ہماری غفلت اور لاپروائی سے ضائع نہ ہو جاتا تو ہم کو آج کیوں اس قدر دقت اور پریشانی ایک ایسے عدم المثال مصنف وشاعر اور صوفی صافی کی تصانیف جمع کرنے میں پیش آتی جن کا نام نامی اس وقت

تک ہندوستان کے لئے مایۂ فخر رہے گا، جب تک کہ اس ملک میں فارسی کے جاننے والے اور قدر کرنے والے ناپید نہ ہو جائیں گے۔ بقول سر گور آؤسلے کے حضرت امیر خسروؒ اپنے وقت کے ملک الشعراء تھے اور ان کی شہرت نے سعدیؒ جیسے باعظمت شاعر کو ہندوستان کا سفر کرنے کی ترغیب دی — اگرچہ بعض تذکروں میں حضرت سعدی شیرازی کا محض حضرت امیر خسروؒ کی ملاقات کی غرض سے ہندوستان تشریف لانا بیان کیا گیا ہے مگر اکثر تذکرے اس بارے میں ساکت ہیں اور بعض میں اس واقعہ کو غیر مثبتہ قرار دیا گیا ہے — سر گور آؤسلے جو عرصہ تک ایران میں سفیر رہے ہیں اور ظن غالب ہے کہ ان کو اس امر کی تحقیقات کا زیادہ موقعہ ملا ہوگا، وثوق کے ساتھ بحوالہ جواہر الاسرار شیخ آوزی کے لکھتے ہیں کہ جب کل ایشیا میں حضرت امیر کا شہرہ بلند ہوا تو خاص ان کے ملنے کی غرض سے شیخ سعدیؒ نے بڑھاپے میں ہندوستان کا دور دراز سفر اختیار کیا اور یہ کہ امیر خسروؒ کو بجا طور پر ناز تھا کہ ایسے عظیم الشان صوفی اور شاعر نے ان کی خاطر ضعیفی میں وہ زحمت گوارا فرمائی جس سے جوانوں کی ہمت پست ہو جاتی ہے — سر گور آؤسلے کی طرح اور کئی علم دوست یورپین صاحبوں نے ابتداء حکومت کے زمانہ میں اس قسم کی دلچسپ محققانہ تصانیف کی تھیں — مگر اب اس ترقی کرنے والی قوم میں بھی یہ شوق کم بلکہ مفقود ہوتا چلا جاتا ہے — کیونکہ کوئی جدید تصنیف سوائے معدودے چند عربی گرامروں (قواعد صرف ونحو) یا سنسکرت اور بھاشا کی رامائنوں وغیرہ کے ترجمہ کے نہ نظر پڑی نہ سننے میں آئی جس سے اس شوق کا جاری رہنا نہیں پایا جاتا — اور ثابت ہوتا ہے کہ انسانی قویٰ کی طرح قوموں کی علمی تحقیقات اور ریسرچ کا مادہ بھی اُن کے شباب اور نشو ونما کے زمانہ میں بمقابلہ ان کے وسط حیات کے زمانہ کے قوی تر ہوتا ہے — بہر حال اس کا کچھ بھی سبب ہو — اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا جس میں خواہ ایشیا ہو یا یورپ علم ادب اور لٹریچر کا ذوق شوق ہر کہ ومہ کے دامنگیر تھا اور ایک موجودہ زمانہ ہے جس میں مادیت کا وہ گہرا رنگ چھا گیا ہے جس نے ''ان من البیان السحرا'' کی نازک اور بھینی دل آویز رنگت کو پھیکا اور ماند کر دیا ہے — مگر اس کا اگر سچا اور پورا چسکا لگ جائے تو کوئی خوشی اس نشہ کو نہیں اُتار سکتی — اور مختلف طبائع پر اُس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا اُس نازک نگاہ کا جس کی تعریف ذیل کے ہندی دوہرہ میں بہ

صنعت لف ونشر مرتب بیان کی گئی ہے:-

اَمی	ہلاہل	مدہ	بھری سیت شام رتنار
(آبحیات)	(زہر)	(نشہ)	
جیت	مرت	جھک جھک	پرت جہہ چتوت اکبار
(فعل امی)	(فعل ہلاہل)	(فعل مدہ)	

اس جملہ معترضہ کی بابت معافی چاہ کر مختصراً حضرت امیر کی اس صنعت کا ذکر کرتا ہوں جس کو سر گور آؤسلے نے بہت شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود حضرت امیر اس صنعت کے موجد تھے یعنی ایسے الفاظ کا استعمال جس سے فارسی میں ایک معنی اور ہندی میں دوسرے معنی ہوں اُس زمانہ میں اُنہیں کا حصہ تھا۔ بطور مثال کے آؤسلے نے دیل کے اشعار نقل کیے ہیں:-

رفتم بہ تماشائے کنارے جوئے — دیدہ بہ لب آب زند ہندوئے
گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود — آواز بر آورد کہ در در موئے

ان اشعار کی جان الفاظ "در در موئے" ہیں جو فارسی میں بمعنی فی بال ایک موتی کے ہیں اور ہندی زبان میں اُن کا مفہوم مستورات کی اصطلاح میں کسی بے باکی کرنے والے کو غصہ سے ہٹا دینے کا ہے— ایک شعر کے اندر مثنوی قران السعدین میں لفظ جو ہری کو بھی بہت خوبی سے نباہا ہے— اگر "جو" و "ہری" کو الگ الگ پڑھا جاوے تو ہندی میں ہرے جو کے معنی پیدا ہوتے ہیں— اسی طرح حضرت امیر خسرو نے ایک اور عجیب وغریب صنعت میں قصیدہ لکھا ہے جس کے ہر شعر کا قافیہ پہلے لفظ کا ہندی ترجمہ ہے۔ مگر وہی لفظ فارسی زبان میں استعمال ہوا ہے— اس قصیدے کے دو شعر یہ ہیں:-

داریم آرزو کہ حکایت کنیم با:،
(بات ترجمہ ہے حکایت کا یہاں مراد ہے "باتو")
لالہ غلام روئے توصد برگ زیر پات
(پات ترجمہ ہے برگ کا یہاں مراد ہے "پائے تو")

ہر برہمن کہ دیدرخ خوبت اے صنم
زنار راگسست دلکدزد بروئے لات
(لات ترجمہ ہے لکد کا یہاں مراد ہے"بت" سے)

سر گور آؤ سلے کی طرز تحریر سے پایا جاتا ہے کہ جو زبان اُن کے ہندوستان کے قیام کے زمانہ میں یعنی مابین ۱۷۹۲ء و ۱۸۱۰ء عام طور پر بولی جاتی تھی اس کو ہندوستانی زبان کہتے تھے جو میری رائے ناقص میں اُردو کا پہلا نام ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو اُردو کی بنیاد ہندوستان ہی کی مختلف زبانوں سے پڑی ہے۔ کیونکہ یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ سوائے مخصوص حصوں کی مخصوص زبانوں کے ہندوستان میں ایک عام زبان بولی جاتی تھی جو پہلے ہندوستانی یا ہندی کہلائی جاتی تھی اور زیادہ صاف ستھری اور نستعلیق ہو کر وہ اُردو کے نام سے ملقب ہوگئی اور میر و غالب سے شعراو فصحاء کی اعلیٰ پیمانہ کی زبان نے اُس میں چار چاند لگا دئے۔ ورنہ دراصل اس وقت کی اُردو زبان بزبان حال کہہ سکتی ہے"وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم" اور اس کے عام ہندوستان کی زبان ہونے کا دعویٰ ارباب انصاف کے نزدیک غالباً بیجانہ سمجھا جائے۔ کیونکہ یہ امر حضرت امیر خسرو کی مختلف تحریرات سے (جن کا ذکر کہیں کہیں اوپر ہوا ہے) ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے زمانہ میں جس کو اب چھ سو برس ہوتے ہیں، ایک ایسی زبان مروج تھی جس کا بڑا حصہ ہندوستانی یا اُردو زبان میں اس وقت بھی پایا جاتا ہے۔ اور اُس کے محاورات میں بھی زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔ تصفت شعار حضرات اس کا تصفیہ کر سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں وہ زبان جو اپنی بدبختی سے اُردو کے نام سے مشہور ہوگئی آیا فی الحقیقت وہی زبان نہیں ہے جس کو ہندوستان کی اصلی زبان سمجھا جائے — کیا اُردو جو محض اس وجہ سے معرض زوال میں آرہی ہے کہ اس کا موجودہ نام اُردو ہوگیا ہے یہ کہنے کی مستحق نہیں ہے کہ میں وہی ہندوستان کی زبان ہوں جو آٹھ سو نو سو برس پہلے اس ملک میں بولی جاتی تھی اور اب زمانہ ناحق میرے پیچھے پڑ کر میرے مٹانے کی فکر میں ہے۔ نیاؤ کرو — ہٹ دھرمی نہ کرو — مجھے سنسکرت، عربی، فارسی، بہاکا، بھاشا، مرہٹی، گجراتی، لاطینی، گریک اور انگلش سب زبانیں بولنی آتی ہیں — اور مجھ میں سب کی کھپت اور سمائی ہے۔"

(Fiat Justitia Ruat Coelum)

''انصاف کرو اگر چہ آسمان بھی گر جائے''

آخر میں میں اس بے سروپا تحریر کو حضرت امیر کے اُس ہندی دوہرے پر ختم کرتا ہوں جو انہوں نے خاص حالت جذب میں اپنے پیرو مرشد حضرت سلطان نظام الدین اولیا کے مزارِ پُر انوار پر اُن کے وصال کے بعد حاضر ہو کر بے ساختہ پڑھا تھا:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
جا خسرو گھر آپ نے سانجھ بھئی چو ندلیس

اہل تصوف کے نزدیک یہ بہت مقبول دوہرہ ہے۔

اہلِ کرم سے التجا ہے کہ اس نوٹ کو باریک اور گہری نگاہ سے نکتہ چینی کے لئے ملاحظہ نہ فرماویں اور اس کے اسقام سے درگزر فرمائیں:

تو ہم اربدی بینی اندر سخن
بخلق جہان آفریں کار کن

اس موقع پر مجھے جو کچھ عرض کرنا مقصود تھا وہ عرض کر چکا۔ لہٰذا میں اپنا یہ نوٹ ختم کرتا ہوں — لیکن میرا یہ نوٹ نامکمل رہ جائے گا اگر میں مولوی ادریس احمد صاحب بی۔ اے جنرل سپرنٹنڈنٹ صدر دفتر مسلم یونیورسٹی کی خدمت کا اعتراف نہ کروں، جنہوں نے ترتیب کلیات امیر خسرو کے کام میں شروع سے اپنی گہری دلچسپی کا عملی ثبوت دیا ہے اور آغاز تحریک سے نہایت قابلیت، ہوشیاری اور دردمندی کے ساتھ اس اہم کام کے اہتمام اور نگرانی میں مجھے مسلسل طور پر مدد دیتے رہے ہیں، جس کی وجہ سے میں اُن کا نہایت ممنون ہوں۔ فقط۔

علی گڑھ
۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء یوم پنجشنبہ

محمد اسحاق خاں
عفی عنہ

☆☆

اختتامیہ

قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ لکھنے والے قابلِ قدر اور مستند مورخین میں سرفہرست اور سب سے پہلا مورخ ابوالحسن یمین الدین ہے جو شعروادب کی دنیا میں امیر خسرو کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ۱۲۵۳ء میں پٹیالی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بلبن کے دورِ حکومت میں پرورش پائی اور خلجی دور میں عروج حاصل کیا اور تغلق دور میں انتقال کیا۔ انھوں نے دہلی کے متواتر سات بادشاہوں، غیاث الدین بلبن، معز الدین کیقباد، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ خلجی، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کا دورِ حکومت دیکھا۔

امیر خسرو کی مورخانہ اہمیت کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان کی تصانیف تاریخ کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے ان کو ہم عصر مورخین کی صف میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں ان کے دواوین اور مثنویاں ایسے تاریخی حقائق سے بھری ہوئی ہیں جو اس دور کے کسی دوسرے مورخ کے یہاں نہیں ملتے۔ مثلاً ان کی نثری تصنیف خزائن الفتوح میں ملک کافور کی دکنی مہمات کا تفصیلی ذکر ہے۔ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں ان مہمات کو قطعی نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح خزائن الفتوح ایک اہم تاریخی خلا کو پُر کرتی ہے۔

بنیادی طور پر امیر خسرو ایک شاعر ہیں۔ ''شاعری ان کی مادری زبان ہے''۔ انھوں نے فارسی اور ہندوی یا دہلوی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ فارسی میں ان کا نام نظامی، فردوسی، حافظ اور سعدی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اُردو زبان کی ابتدا و آغاز کے ڈانڈے ہم ان کی ''ہندوی'' شاعری سے ہی ملاتے ہیں انھوں نے نثر میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ اچھے نثر نگار نہیں ہیں۔ ان کی نثر کے بارے میں یہ کہنا درست ہی ہے کہ جبکہ ان کی شاعری ایک اچھی نثر کے تمام محاسن سے مزین ہے ان کی نثر میں گھٹیا شاعری کا تصنع بھرا ہوا ہے۔

انھوں نے نو سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۳۲۵ء میں ان کی موت تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک سپاہی، ادیب اور صوفی بھی تھے۔ بہت سی خصوصیات ان کو ان کے والد سے ورثہ میں ملی تھیں۔ ان کے والد سیف الدین محمود، سلطان شمس الدین التمش کی فوج کے ایک ممتاز سپاہی تھے اور ان کے دادا عماد الملک راوت عرض کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہ پڑوسی ہندو ریاستوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کی بھی نگرانی کرتے تھے۔ امیر خسرو نے تقریباً پورے ہندوستان کی سیاحت کی ہے۔ انھوں نے شمال میں سامانہ سے ملتان، جنوب میں دیوگیر، مشرق میں لکھنوتی اور شمال مغرب میں سندھ پار تک سفر کیا۔ سندھ پار وہ منگولوں کے ہاتھوں ۱۲۸۴ء میں گرفتار ہو کر لے جائے گئے۔ رہا ہونے کے بعد وہ دہلی واپس آئے اور امیر علی سرجاندار کی ملازمت اختیار کی۔ امیر علی شمس الدین التمش کے دور کا ایک ممتاز امیر تھا۔ امیر خسرو اپنے آقا کے ساتھ شامل ہو کر سرجو تک گئے جہاں گورنر بنگال بغران خاں اور اس کے لڑکے معز الدین کیقباد سلطان دہلی کے درمیان جنگ ہونے والی تھی۔ یہاں انھوں نے باپ بیٹے کے درمیان محبت اور جنگ کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس واقعہ کو انھوں نے ۱۲۸۸ء میں قران السعدین کے عنوان سے نظم کیا۔ ان کی مثنویوں میں یہ مثنوی خاص تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے انھیں امیر کا خطاب عطا کیا اور اپنے دربار میں مصحف بردار کا اعزازی عہدہ دیا اور ایک ہزار سالانہ ان کی تنخواہ مقرر کر دی۔ وہ سلطان کے ہمراہ باغی ملک اختیار الدین عرف ملک چھجو کے خلاف مہم میں شریک ہوئے۔ ملک چھجو کی شکست اور اس کے ہتھیار ڈالنے، پھر شاہی معافی کے بعد ملک کو ملتان کی ولایت دینے کے واقعات کا مشاہدہ کیا۔ آخر میں وہ جھائیں کی مہم میں سلطان کے ہمراہ رہے اور اس طرح حاصل کردہ تمام معلومات کو انھوں نے مثنوی مفتاح الفتوح میں پیش کیا۔ جھائیں سے واپسی کے بعد وہ علاء الدین خلجی کی بغاوت تک دہلی میں مقیم رہے۔

نئے سلطان علاء الدین خلجی کی معیت میں امیر خسرو نے چتوڑ کی مہم میں شرکت کی۔ اس واقعہ کو انھوں نے خزائن الفتوح میں بیان کیا ہے۔ خزائن الفتوح میں امیر خسرو نے ملک کافور کے زیر اثر سلطان علاء الدین کی بے بسی و درماندگی کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ اس

کے بعد امیر خسرو کو قطب الدین مبارک شاہ خلجی ایک نیا مربی ملا جو امیر خسرو کو ۱۳۱۷ء میں شاہی مصاحب کی حیثیت سے دکن کی مہم پر لے گیا۔ دہلی لوٹ کر امیر خسرو نے نہ سپہر کے نام سے نئے سلطان کے ابتدائی دور حکومت کی تاریخ مرتب کی جس میں انھوں نے اپریل ۱۳۱۶ء سے اگست ۱۳۱۸ء تک قطب الدین مبارک شاہ کی تخت نشینی اور دکن کی مہم کے حالات کو نظم کیا ہے۔ نہ سپہر میں امیر خسرو نے ہندوستان، اس کے موسم، حیوانات، ہندوستانی علوم اور زبانوں کی تعریف کی ہے۔ اس کے علاوہ اس مثنوی میں سلطان، اس کے سپاہیوں اور عوام کو تادیب بھی کی گئی ہے۔ آخر میں چوگان کے کھیل میں سلطان کی مہارت کو سراہا ہے۔

امیر خسرو کی عمر اب سڑسٹھ سال ہوگئی تھی۔ انھوں نے تخت نشینی کی اس جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے بعد شروع ہوئی تھی انھوں نے اس جنگ کا حال تغلق شاہ کے نام پر مثنوی تغلق نامہ میں نظم کیا ہے۔ اب تغلق خاندان کا دورِ حکومت شروع ہوا۔ امیر خسرو نے تغلق شاہ کے ساتھ لکھنوتی کی مہم میں حصہ لیا جہاں سے وہ اپنے روحانی پیشوا سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین کی وفات کی خبر سن کر دہلی واپس ہوئے۔ اسی سال امیر خسرو کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اپنے پیچھے بہت سی تصانیف چھوڑی جن میں ان کے دیوان اور مثنویوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

امیر خسرو کے دواوین کے نام ہیں وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال اور مثنویوں میں قران السعدین، مفتاح الفتوح، عاشقہ، نہ سپہر اور تغلق نامہ شامل ہیں۔ اپنی ان تمام تصانیف میں شاعر نے بلبن سے لے کر غیاث الدین تغلق کے زمانہ تک کے تاریخی واقعات کو موضوع سخن بنایا ہے۔ ان کا اہم ترین دیوان غرۃ الکمال ہے جو ۱۲۹۴ء میں لکھا گیا۔ اس میں امیر خسرو نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کی تعریف کی ہے۔ اور اس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ ہندوستانیوں کے اندر نئے ماحول کے مطابق اپنے کو ڈھالنے اور غیر ملکی زبانوں کو آسانی سے سیکھ لینے کی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ اس سلسلہ میں مثنوی قران السعدین بھی بہت اہم۔ ہے۔ جو ۱۲۸۹ء میں لکھی گئی۔ اس میں گورنر بنگال بغرا خاں اور اس کے بیٹے سلطان معز الدین کیقباد کے درمیان تاریخی ملاقات کے ذکر کے علاوہ دہلی کی سماجی زندگی، دلچسپ مجلسیں، امرا کی سرگرمیاں، موسیقی

کے مشہور آلات، شاہی استعمال میں آنے والی مختلف النوع کشتیوں اور مختلف اقسام کے لذیذ کھانوں کا بھی ذکر ہے اور اس زمانہ کی دہلی کی مشہور عمارتوں کا بھی ذکر ہے۔ مفتاح الفتوح میں جلال الدین خلجی کی فوجی مہمات ملک چھجو کی بغاوت کے استیصال ۱۲۹۱ء میں رنتھمبور کی جانب سلطان کی پیش قدمی، ۱۲۹۲ء کے شکستہ خاطر منگولوں کے حملے جھائین کی فتح کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ عاشقہ میں جسے ''دیول رانی خضر خاں'' بھی کہا جاتا ہے نہ صرف گجرات کے راجہ کرن کی لڑکی دیول رانی اور شہزادہ خضر خاں کے معاشقہ کی داستان ہے بلکہ اس میں منگولوں کے ہاتھوں شاعر کی گرفتاری اور گجرات، چتوڑ، مالوہ اور سیوانہ کی فتوحات کا بھی ذکر ہے۔ اس میں ہندوستان اور یہاں کی عورتوں کے حسن و جمال کا بیان ہے اور اس سے ہندی زبان کے تئیں امیر خسرو کے رجحان کی بھی شہادت ملتی ہے۔ کیونکہ اس میں ہندی الفاظ کو فارسی میں بڑی خوبصورتی سے سمویا گیا ہے۔

نہ سپہر میں جو ۱۳۱۸ء میں مکمل ہوئی مبارک شاہ خلجی کے دورِ حکومت کی فوجی مہمات کا تذکرہ ہے۔ یہ مثنوی دہلی کی عظمت، ہندوستان کی خوش گوار آب و ہوا، اس کے رنگا رنگ موسموں، صحت بخش پانی، خوش ذائقہ پھلوں، یہاں کے فلسفہ ہندوستانیوں کے محاسن، ان کی ذہانت، ان کے علمی و ادبی کارناموں، ان کے عادات، رسم و رواج، مذہب اور زبان پر بھی روشنی ڈالتی ہے تغلق نامہ جو ۱۳۲۵ء میں نظم کیا گیا ایک رزمیہ ہے جس میں غازی ملک اور ناصر الدین کے درمیان جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ غازی ملک (غیاث الدین تغلق) کے تخت نشیں ہونے تک کے واقعات اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی بعض دوسری نظموں کی طرح تغلق نامہ میں بھی جابجا ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ امیر خسرو کی نثری تصانیف میں خزائن الفتوح ہے جسے تاریخ علائی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کی سب سے زیادہ تاریخی اہمیت ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ تصنیف علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت کی تاریخ ہے لیکن حقیقت میں یہ ملک کافور کی دکن سے متعلق چند سالہ فوجی مہمات (یعنی ۱۳۰۵ء سے ۱۳۱۱ء تک) کی سرکاری تاریخ ہے۔ ضیاء الدین نے اپنی تاریخ میں ان مہمات کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ خزائن الفتوح اس تاریخی کمی کو پورا کرتی ہے۔ ایک طرح سے یہ سلطان کا قصیدہ بھی ہے جس میں علاء الدین خلجی کے تمام نقائص پر پردہ ڈال

دیا گیا ہے لیکن اس میں علائی دور کی فوجی کارروائیوں محاصروں اور اسلحہ جات کو عینی شاہد کی حیثیت سے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا طرز بیان نہایت مرصع ہے۔ جس میں استعاروں اور لفظی صنعتوں کی بہتات ہے جن کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔

امیر خسرو خلجی دورِ حکومت کے مورخ ہیں۔ لیکن تغلق دور کے لیے بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ تغلق شاہ اور اس کے لڑکے جونا خاں سے ذاتی طور پر واقف تھے اور انھوں نے ان کے لیے تغلق نامہ لکھا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین کے چہیتے خلیفہ بھی تھے جو خلجی اور تغلق ادوار کے درمیان ایک اہم کڑی سمجھے جاتے ہیں۔

اگرچہ امیر خسرو میں وہ تمام کمزوریاں موجود ہیں جو اس دور کا مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ وہ چڑھتے سورج کو سلام کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ظالم اور بدچلن سلاطین کی تعریف میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ اپنے معاصرین ضیا برنی اور منہاج سراج کی صف میں شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان مورخین میں ان کی اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی ہے۔ امیر خسرو پہلے مورخ ہیں جن کی تصانیف عہد وسطی میں ہندوستان کی سماجی، تہذیبی اور فوجی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ دوسرے مورخین کے بیانات شاہی درباروں بادشاہوں، جنگوں اور محاصروں تک محدود ہیں۔ امیر خسرو پہلے مورخ ہیں جنھوں نے عوامی زندگی کی جھلکیاں بھی اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔ اس دور کا عرب مورخ ابن بطوطہ ان سب سے مختلف تھا۔ کیونکہ وہ جامع اور متوازن تاریخی شعور رکھتا تھا۔ امیر خسرو دوسرے ترک مصنفین جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور ابن بطوطہ کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگرچہ ''خمسہ'' امیر خسرو کی ادبی تصنیف ہے لیکن اس کی تاریخی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امیر خسرو نے اسے نظامی گنجوی کے خمسہ کی تقلید میں تصنیف کیا ہے۔ اس میں پانچ مثنویاں مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، ہشت بہشت اور آئینہ سکندری شامل ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس خمسہ کی تاریخی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''خمسہ ایک ادبی شاہکار ہے۔ جس میں امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے مشہور ادبی کارنامے کا جواب دے کر ہندوستان کی علمی سربلندی کا سامان مہیا کیا ہے۔...... لیکن اس میں

ہندوستان کی معاشرت اور تہذیب کے متعلق نہایت دلچسپ حوالے ملتے ہیں۔ یہاں کے جانوروں، پھل، پھول کپڑوں، فنون، سنگ تراشی، مذہبی رسوم، شطرنج، ساز وموسیقی وغیرہ کے متعلق جو تفصیلات اس میں بکھری پڑی ہیں اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو ہندوستان کی تمدنی زندگی کے بہت سے گوشے روشن ہو جائیں گے۔"

امیر خسرو کی نثری تصنیف "اعجاز خسروی" کے بغیر یہ مختصر مضمون نامکمل رہے گا۔ اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ مرصع ومقفیٰ نثر کے نمونے پیش کیے جائیں۔ خسرو کا دعویٰ ہے کہ جو اسلوب اعجاز خسروی میں پیدا کیا گیا ہے وہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے اعجاز خسروی کے بارے میں لکھا ہے:

"اس کتاب میں اس زمانہ کے بہترین اسالیب نثر کے نمونے شامل ہیں جو خصوصاً ہندوستان میں فارسی نثر کے ارتقاء کے مطالعے میں بہت مفید ہو سکتے ہیں۔ اعجاز خسروی میں لغوی، نحوی، ادبی، تاریخی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بے شمار معلومات مل سکتی ہیں جو کتاب کے صفحات میں جگہ جگہ پراگندہ ہیں اور اس زمانہ کے کوائف اور حالات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔"

امیر خسرو اگرچہ باقاعدہ مورخ نہیں تھے اور انھوں نے اپنے ہم عصر ضیا برنی یا شمس سراج عفیف کی طرح تاریخ قلم بند نہیں کی ہے لیکن ان کی تصانیف کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆



امیر خسروؒ عہدِ شباب کی ایک شبیہ



ناصر الدین محمود



غیاث الدین بلبن



معزالدین کیقباد



سلطان جلال الدین محمد فیروز خلجی



سُلطان علاؤ الدین خلجی



قطب الدین مبارک شاہ خلجی



موسیقار امیر خسرو



شیخ سلیم احمد ہندوستان کے معروف دانشور، مفکر اور اہل قلم ہیں جنہوں نے علم وادب کے کئی شعبوں کو اپنے مطالعے اور تفکر سے روشن کیا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں جس کا اظہار متعدد اصناف سخن پر ان کی دسترس سے ہوتا ہے۔ انہوں نے تنقید کے ساتھ ساتھ افسانے، انشائیے اور ڈرامے لکھے ہیں اور تراجم بھی کئے ہیں۔ اس سب کے ساتھ شیخ صاحب کی فہم وفکر کا محور اور علمی اختصاص ہند اسلامی/ایرانی تہذیب ہے جس کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں تک ان کی رسائی ہے۔ تصوف اور بھگتی تحریک کے معنی ومفہوم کا جیسا درک انہیں حاصل ہے اور کہیں کم نظر آتا ہے۔ 1974 میں شعبہ ثقافت ہند نے یونیسکو کے تعاون سے حضرت امیر خسرو دہلوی پر سات سو سالہ بین الاقوامی جشن منانے کا اہتمام کیا تو انہیں اس سلسلے میں تشکیل شدہ قومی کمیٹی کی مجلس عاملہ کا رکن بنایا گیا۔ انہوں نے اس حیثیت سے نہایت قابل قدر کام انجام دیا۔ اس موقع پر امیر خسرو پر ان کی مرتبہ کردہ ضخیم کتاب شائع ہوئی جو حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ثابت ہوئی۔ اسی زمانہ میں مشی گن یونیورسٹی امریکہ میں امیر خسرو پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا، وہ ہندوستانی وفد کے ہمراہ اس سیمینار میں شرکت کے لئے گئے اور مقالہ پیش کیا۔

ان کی کتاب "عبدالرحیم خانخاناں" جو اردو اور ہندی میں شائع ہوئی۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ہندی ایڈیشن پر سرکاری انعام بھی ملا۔ انہوں نے عبدالرحیم خانخاناں میموریل سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی جس کے تحت امیر خسرو، تصوف کی عصری اور سماجی معنویت، کبیر، ہندی بولیوں وغیرہ جیسے کئی اہم موضوعات پر سیمینار منعقد کئے گئے۔ تصوف کی سماجی معنویت پر سیمینار کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند نے کیا اور پھر اس موضوع پر انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز (ICCR) نے بھی سیمینار کا اہتمام کیا۔ شیخ صاحب تصوف اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب جیسے موضوعات پر مقالے پیش کرنے کے لئے امریکہ اور انگلینڈ کے سفر کر چکے ہیں۔ بیرم خاں پر ترکمنستان کے سفارت خانے اور حکومت ہند کے اشتراک سے چھ سو سالہ جشن منایا گیا تو ترکمنستان کے دارالخلافہ اشقآباد اور دلّی دونوں مقامات پر تقریبات اور سیمینار آراستہ کئے گئے۔ شیخ سلیم احمد نے ان تقریبات میں حکومت ہند کی نمائندگی کی اور دونوں شہروں میں رحیم اور بیرم خاں پر مقالے پڑھے اور سنٹرل ایشیا کی سیاحت کی۔ وہاں سنٹرل ایشیا کے صوفی سلسلوں پر مقالہ پڑھا۔ انڈین کونسل آف ہسٹریکل ریسرچ نے ہندوستانی اور وسط ایشیا کے مابین قدیم الایام رشتوں کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمنار کا اہتمام کیا جس میں موصوف نے "نقشبندی صوفی سلسلہ" پر مقالہ پڑھا۔

وہ شعبہ ثقافت، حکومت ہند کے سینئر فیلو بھی رہ چکے ہیں جس کے تحت انہوں نے "تصوف کے اردو غزل پر اثرات" کے عنوان سے مقالہ تصنیف کیا۔ "صوفی سنت پریسپر آف انڈیا" کے نام سے انگریزی میں کتاب مرتب کی۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ "جلسہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ موصوف کے گرانقدر علمی وادبی مضامین کا مجموعہ بھی "سلکِ معنی" اور اردو، ہندی تنازع پر دوسری کتاب "ایک گھر جو تقسیم ہو گیا" دونوں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

شیخ سلیم احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلیم حاصل کی۔ ایم اے میں ان کا مضمون "ہندوستانی تہذیب اور تاریخ" تھا۔ مرکزی حکومت ہند کے ترقی اردو بیورو میں کارگزار رہے ہیں اور ایک اعلیٰ عہدہ سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ وہ قصبہ دیوبند کے قریب شیوخ کی ایک بستی راجوپور میں 1936 میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک متمول زمیندار معزز گھرانے سے ہے۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6 (INDIA)
PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

81-8223-189-2